



You have either reached a page that is unavailable for viewing or reached your viewing limit for this book.



You have either reached a page that is unavailable for viewing or reached your viewing limit for this book.



You have either reached a page that is unavailable for viewing or reached your viewing limit for this book.

ہائین الیون کے بعد طاغوتی طاقتوں کا اقوام متحدہ کی شکل میں حکومتِ دجال کا قیام، جدید سامراجی
اصولاتِ انسانی خارج نہیں جھوٹ اسیج کی امیرزش سے ظلم و بربریت پر بھی ہوئی شہرہ آفاق کتاب

بخار

دجال

جلد اوّل

اسرار عالم

مصنف: اسرار عالم



نائن الیون کے بعد طاغوتی طاقتوں کا اقوام متحدہ کی شکل میں حکومت دجال کا قیام
، جدید سامراجی اصلاحات اور انسانی تاریخ میں جھوٹ اور سچ کی امیزش سے ظلم و
بربریت پر لکھی ہوئی شہرہ آفاق کتاب

دجال

جلد اول

مصنف

اسرار عالم

ادارہ تحقیقات

فسٹ فلور یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

فون: 03334380927

Copyright © Author
جلد مطبوعہ

دیوان
سلف مروجہ
DAJUAL
By Asrar Alam

طبع دیوان : اکتوبر ۲۰۰۸ء

Published by
DAR -AL- ILM, NEW DELHI

پیشکش
Distributed by

Danish Book Distributors
1/28/3 (Basement) New Kohinoor Hotel, Patnauli House,
Connaught Place, New Delhi-110002. Ph: 2222285

مصنف کی تصانیف

- اسلام اور انگریزوں کی فتنہ
- عالم اسلام کی سیاسی صورت حال
- بین الاقوامی فتنوں کا تقاضہ اور اس کا طریقہ کار
- عالم اسلام کی تکنیکی صورت حال
- عالم اسلام کی مذہبی صورت حال
- جہاد
- عالم اسلام کی اخلاقی صورت حال
- ریاستی تنظیمیں اور ان کی آمد آمد ہے
- عالم اسلام کی گھریلو اقتصادی صورت حال
- عالم اسلام کی سماجی صورت حال
- دیوان

Printed at, Azad Offset Printers, Delhi-110005

فہرست: دجال جلد اول

۸	پیش لفظ
۹	مقدمہ
۱۱	باب اول
۱۱	ضرورت عجالہ
۱۱	پہلا سبب: سلامتی کونسل
۳۱	دوسرا سبب: عیسائی یہودیت کے تخریبی عزائم
۷۳	تیسرا سبب: یہودی تخریبی عزائم
۷۹	چوتھا سبب: عالم اسلام پر ہمہ جہت حملہ
۸۵	پانچواں سبب: آئمنہ مصلدین کا تسلط
۱۲۷	باب دوم
۱۲۸	حصہ اول: ستارہ و صلیب
۱۲۸	یہودیت
۱۲۸	■ حضرت مسیح کی آمد
۱۳۳	■ دجال کا ظہور
۱۳۶	■ حضرت مسیح کے ذریعہ اقامت نظام عدل
۱۴۲	حصہ دوم: عیسائیت
۱۴۲	■ حضرت مسیح کی آمد
۱۴۸	■ دجال کا ظہور
۱۵۳	■ خاتمہ دجال اور اقامت نظام عدل
۱۶۴	حصہ سوم: حادثہ، سازش اور المیہ
۱۷۷	باب سوم
۱۷۷	حقیقت دجال
۱۷۸	تین حقائق

۱۷۹	■ حقیقت اول : اللہ تعالیٰ اور کائنات
۱۷۹	پہلا مدرج : عالم اصل
۱۸۲	دوسرا مدرج : عالم بریۃ
۱۸۳	تیسرا مدرج : عالم عصر
۱۸۶	چوتھا مدرج : عالم اشیاء
۱۹۰	■ حقیقت دوم : ابلیس اور شیاطین
۱۹۰	● مخزن نور
۱۹۰	● مخزن نار
۱۹۰	● مخزن ارض
۱۹۱	● الملک
۱۹۱	● الجن
۱۹۱	● الآدم
۱۹۶	● الملائکۃ
۲۰۰	● انواع نور
۲۰۰	● بابل کے دو ملک
۲۰۱	● دجال کے ساتھ دو فرشتے
۲۰۳	● انواع نار
۲۰۶	● ابلیس
۲۲۱	● الشیطان
۲۲۴	● ذریۃ الشیطان
۲۲۵	● قبیلۃ الشیطان
۲۲۵	● جنود ابلیس
۲۲۶	● وآخرین من دہنم

۲۲۶	● شپاٹھویں جنگ
۲۲۸	● شپاٹھویں جنگ
۲۲۸	● بولیاؤں کی جنگ
۲۲۹	● قرین کی جنگ
۲۲۹	● اخوان کی جنگ
۲۳۰	● جمہور کی جنگ
۲۳۰	● یاجوج و ماجوج
۲۳۱	● لکھنؤ کی جنگ
۲۳۱	● قادیان کی جنگ
۲۳۳	■ حقیقت سوم : سرگندہ دھڑ
۲۳۳	● آغاز
۲۳۹	● غلطی
۲۵۱	● غلامت کائنات کی حقیقت
۲۵۱	● عالم عشق
۲۵۱	معرکہ خیر و شر کی تاریخ
۲۵۱	■ مرحلہ اول : آدم قدیم
۲۵۲	■ مرحلہ دوم : آدم ہوا
۲۵۴	■ مرحلہ سوم : آدم حوا پر زمین
۲۵۰	● پہلا دور : آدم کے دو بیٹوں کا دور
۲۵۱	● پہلا دور : عبادت کا دور
۲۵۲	● دوسرا دور : محافل
۲۵۸	● تیسرا دور : حضرت علیہ السلام
۲۶۰	● چوتھا دور : حضرت اس علیہ السلام
	■ مرحلہ چہارم : اللہ کا حقوق بشری دین و نکل حیدر کی قوتوں

- ۲۹۳ کے ذریعہ حملہ اور داخلی جنگ
- ۲۹۴ • حضرت نور علی علیہ السلام
- ۲۹۵ • قیاد عظیم
- ۲۹۶ • قیاد عقیدہ
- ۲۹۸ • قیاد علمی
- ۲۹۹ • زبانی انکوائریات
- ۳۰۰ • جہد
- ۳۰۱ • نقل
- ۳۰۲ • لڑ
- ۳۰۳ • فکر
- ۳۰۴ • عظمت
- ۳۰۵ • زبانی باتیں
- ۳۰۸ • حضرت افضل
- ۳۰۹ • روح القدس
- ۳۰۹ • ذی افضل
- ۳۱۰ • ذی اقرین
- ۳۱۱ • ذی اقرین اول
- ۳۱۸ • وقت اور جگہ
- ۳۲۰ • وسعت
- ۳۲۱ • مقصد اور ہم
- ۳۲۲ • ایک شکل
- ۳۲۳ ■ مرحلہ دہم: انہیں کما فوق انسانی قوتوں کے ذریعہ حملہ اور کھلی کائناتی جنگ
- ۳۲۹ کے ذریعہ حملہ اور کھلی کائناتی جنگ
- ۳۳۸ • حضرت نور علیہ السلام

- ۳۳۸ • قوم نوح: نقل طوفان
- ۳۳۹ • مرحلہ کافل: فدا و تقسیم
- ۳۴۰ + فدا و نقل
- ۳۴۱ + فدا و علم
- ۳۴۲ + زلیٰ اعدائے
- ۳۴۳ • مرحلہ آدم: مکر کرب
- ۳۴۴ • مرحلہ آدم: گل جانی
- ۳۴۵ + الجہد فدا و نقل
- ۳۴۶ • + الجہد فدا و علم
- ۳۴۷ + آدم و نوح و عیسیٰ و آدم پر اثرات
- ۳۴۸ • قوم نوح: بعد طوفان
- + دقاق برہان
- + بحال آدم
- ۳۴۹ ■ مرحلہ ششم: ابلحس کے تہذیبی تھلے کا دور
- ۳۵۰ + آدمی پہلو
- ۳۵۱ + ابلحس پہلو
- ۳۵۲ • پہلا تہذیبی سرگ: بد
- ۳۵۳ • دوسرا تہذیبی سرگ: نمود
- ۳۵۴ • تیسرا تہذیبی سرگ: قوم لوط
- ۳۵۵ • چوتھا تہذیبی سرگ: قوم شیب
- + ابلحس کے تہذیبی سرگے کا جائزہ ۳۵۶
- ۳۵۷-۳۵۸



پیش لفظ

حامداً و معصیاً

یہ آخری ہی حضرت محمد ﷺ کی امت بنی اور انسان میں وہ آخری امت ہے جو شہادت پر فائز کی گئی ہے۔ چنانچہ پوری انسانیت کو کامیابی کا انحصار اب ہی گروہ پر ہے۔ عیسویں صدی عیسوی کی آخری دوہائی تک آتے آتے واضح طور پر محسوس ہونے لگا ہے کہ یہ امت جہنم کی امت بنی ہے اس مرحلے میں داخل ہو چکی ہے جس کی خبر دیتے ہوئے آنحضور ﷺ نے فرمایا تھا: مغرب قومیں تم پر ٹوٹ پڑنے کے لئے بلادریں گی جیسے جو کے (پتھروں) گھرانے پر ٹوٹ پڑنے کے لئے بلادریں پڑتی ہیں۔ (ابوداؤد و بیہقی)

اس اندویشناک صورت حال سے زیادہ کرب کی بات یہ ہے کہ امت مسلمہ — جو دنیا کا وہ واحد گروہ ہے جسے ماضی، حال اور مستقبل کا کافی علم و مہارت حاصل ہو چکا ہے — آج حیران اور حادقہ بردہ بھگت رہی ہے اور دنیا کی تاریکیوں سے روشنی کی بھینک مانگ رہی ہے۔ چودہ صدیوں بعد اب آثارِ قیامت کے ظاہر ہونے کی رفتار بڑھ رہی ہوئی محسوس ہوتی ہے گویا کوئی بد ٹوٹ چائے اور بکے بعد نگہ بندانے کر کے لگیں۔

ان حالات کا تقاضا تھا کہ قرآن و احادیث مبارکہ کی روشنی میں امت کی صورت حال کا گہرائی سے جائزہ لیا جاتا، موجودہ حالات کی تبدیلی کو گنگا زار ہے سے دیکھا جاتا اور آنکھوں کے لئے خطوطِ کار کی نشاندہی کی جاتی تاکہ یہ امت اپنے فرضِ معینی کو کما حقہ سر انجام دے کر پوری انسانیت کو کامیابی سے ہمکنار کرے۔ چنانچہ انہیں اسود کو قش نظر رکھ کر یہ سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس میں مختلف مقامات کے تحت بحث کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کوشش کو قبول فرمائے اور اس میں برکت عطا فرمائے۔

امام مسیح قریب معجب

اسرارِ عالم

مُقَدِّمَات

”یاسودی انکل“ اکہ چول کی آمد آمد ہے؟ کی انکامت قول (۱۹۹۹ء) سے اس کی طبع حالت (لروری ۲۰۰۰ء) تک آتے آتے ایسا واضح طور پر محسوس ہونے لگا کہ روئے زمین اور ہوا کے درمیان میں جد علیاں اتنی تیز رفتار ہو چکی ہیں کہ یہ کتاب ایک تھوڑی سی جگہ کے بجائے اب چار پانچ کا حصہ بن چکی ہے۔ جب کہ امت کے خواص کی حالت یہ تھی کہ اس وقت تک ایک لہارت گیلی تھوڑی ہی اس کے منہ و جات سے باخبر ہو سکی تھی اور دوسرا اعلیٰ علمی کے تجربے یا تو اس عاجز کو موصول ہونے لگے یا کسی پتے میں شائع ہو سکے تھے۔ چنانچہ اب اعلیٰ و محکمہ کی بات ہے تو اس کے آگے کم ہی لہاں تھے کہ وہ اپنے لائیو اور مغرب سے مستعار مکالمے سے گور و گل ہو کر حالات و حوادث کی اس تھیلی کے منظر میں امت کی اٹا کے لیے کما حقہ اقدام کے لیے تیار ہو رہے ہوں۔ لروری ۲۰۰۰ء کے وسط تک آتے آتے یہ بات پوری طرح آشکار ہو چکی تھی کہ اب حالات کھینچا بدل گئے ہیں اور ”یاسودی انکل“ میں بنی ہوئی کتاب اندیشوں (مصلحت ۱۹۹۵ء) کا نظارہ کیا گیا تھا اب مستقبل کے نظریے تھیں بلکہ حال کا اظہار بن چکا تھے۔ غار و غریب اب تبدیلیوں کی صورت اور اس کی اصولیات میں بھی انقلابی تبدیلی آچکی تھی۔

جنس اب ”یاسودی انکل“ کی سٹی پر ہوا کہ سمجھنا شروع ہو گیا۔

حوادث کی یہ وہ کیفیت تھی جو اس کی متقاضی ہوئی کہ آئندہ صورت حال کو پیش نظر رکھ کر جلد کوئی تجربہ پیش کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کی کوئی کوشش ایک جگہ کی صورت ہی لے سکتی تھی۔ اب اس بات کا اندیشہ صاف نظر آ رہا ہے کہ جیسے جیسے ہم قیامت کی طرف بڑھ رہے ہیں حالات کی تبدیلی اور حوادث کے رونما ہونے کی رفتار ہمہ دم تیز تر ہوتی جا رہی ہے اور تھوڑے ہی عرصے میں اس کی لہرت آسکتی ہے کہ ایسے کسی قبائے کے پیش کرنے کی صورت میں باقی نہ رہ جائے۔ کاش امت کی یہ بے بسی اور آگے گواہی جلد ختم ہو جاتی اور باہموم طے المسلمین اور بالخصوص اعلیٰ و محکمہ اعلیٰ کی بھلی کا یہ صحن بنے یا اس کے پھلے ہوئے سلا پر رقص کرنے کے بجائے اس گروہ کے لوگوں نے اس قبیل گروہ کا ساتھ دینے جس کی کامیابی ہی نور انسان

کی کامیابی ثابت ہوگی اور یہ وہی گروہ ہے جس کے ہاتھ کامران و ہمران ہونے کی طاقت
 آنحضور ﷺ نے ان الفاظ شریفہ کی ہے۔

لا تزال طائفة من امتي يقتلون على الحق ظالمين علي من نار اعم حتى
 يقتل آخرهم المسيح الدجال (رواہ ابوداؤد)

ترجمہ: میری امت کا ایک گروہ ایسا حق پر جہاد کرے گا اور وہ اس سے دشمنی کریں گے
 اس پر غالب آئے گا یہاں تک کہ وہ آخری گروہ بھی ہو گا اور جس کا جال کے خلاف جہاد کرے گا۔
 اس کے لیے ضروری ہے مصطفیٰ کو مجبور کر دیا ہے کہ اس قریر میں دلیق تقریر یا غبی مباحث
 سے متنبہ ہو کر چلے گیا جائے۔ صرف انگریزوں اور مسلمانوں کے جانیں اور تفصیل پر اجماع کو ترجیح دی
 جائے۔ ان سارے امور اور معلومات سے جن کا یہاں ذکر ہو گا تفصیلی، علمی اور تقریری بحثیں شامل
 ”عالم اسلام کی منہجی اور مقصدی صورت حال“ میں ہوگی۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی
 ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ایسے تمام مباحث، تقریرات، ترجمات اور تعبیرات پر علمی بحث
 اور ان کی تقریر بھی۔۔۔ جن کا تعلق اصول فقہ، تفسیر اصول فقہ، مباحث اصول فقہ یا اصول فقہ سے
 ہے۔۔۔ اسی سلسلے میں ان شاء اللہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اس کو شش کو قبول فرمائے اور اسے اپنے
 مقاصد میں کامیاب کرے۔ واللہ المستعان وعليه التكلان۔

اسرار عالم

باب اول

ضرورت بحالہ

تیسری کھل اکیلا چال کی آمد تھی ہے؟ اسکی مٹی ۱۹۹۹ء عیسوی میں جب اشاعت ہوئی تو وہ خود ایک شدید بحران صورت حال کا نتیجہ تھی۔ لیکن اس کی اشاعت کے فوراً بعد ہی ظہور حوادث کا وہ سلسلہ شروع ہوا جو اسی طور پر بے حد خطرناک اور انکسالی تھا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ دہشت گردی پر ایسے سنگسار و کٹاکتے قتل کیے گئے جنہوں نے صورت حال کو بکسر دیا کہ دیکھو یہ صورت حال کی یہ تبدیلی کب اور نا قابل یقینی حوادث کا قتل غیر قبیح جن کے دور میں انسانیت ملے آئے اور ان کا براہ راست اثر اس مسئلہ پر پڑا۔

حوادث کے اس انقلابی ماحول میں ہمارا موردِ نگاہ توحیدِ اہم تھے جنہوں نے اسی عاجز کو
 مجبور کر دیا کہ اب حالات کا نہ صرف یہ کہ قریب تو جان کر دیا جائے بلکہ اس میں وہ امور بھی با تفصیل
 زیرِ بحث لائے جائیں جنہیں اب تک مثالی نہیں کیا گیا تھا۔ حالات کی ان اکت سے تجزیہ کے
 اہم کی ضرورت اور اس سے احتکاء کے لیے ضروری ہے کہ ان اسبابِ حادثہ کے تاثر کا بھی
 ذکر کر دیا جائے جو اس تفسیل کا سبب ہوئے۔

پہلا سبب : سلامتی کونسل

اس تعلق سے پہلا سہجہ امر یہ کہ خود برطانیہ کا اتمام حدود کے تعلق سے بالخصوص اور
سہا حتیٰ کو تعلق کے تعلق سے بالخصوص وہ چیزیں کہ اس سے پہلے وہاں تھیں جس کے حدود خالی پر چھو کر
۱۹۹۹ء کے نوٹر میں واضح طور پر ابھرے گئے تھے لیکن اس کی حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۹۹ء میں منظر عام پر
آئی۔

امریکہ اور برطانیہ کا وہ تجربہ ان کی فیصلہ تھا۔ — برحقی اور چاہوں جیسے ملکوں کے مقابلے میں یہ سچی کوشش کی مستقل رکیت کے لیے بخوبی اشیاء کے ایک ملک کا انتخاب۔ — ہائی واپس

کی جان بچاؤ میں یہ ایک غیر معمولی فیصلہ ہے جس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اقوام متحدہ کی تشکیل کے حقیقی منظر سے واقفیت رکھتے ہیں۔ یہ کتنا کسی اختیار سے غلط نہ ہو گا کہ اقوام متحدہ کی پہلی سالہ جان بچاؤ میں یہ سب سے بدنام دور ہی فیصلہ ہے۔ اگلی اس فیصلے کو پوری طرح جاننے آئے اور نہ ہی حتمی ہوئے میں مزید چند دن گھنٹوں کے باجم یہ فیصلہ چھٹک پوری طرح سوچ سمجھ کر اگلی ترین سناچ کر لیا گیا ہے اس لیے اس میں کسی رد و بدل کا امکان نہیں بلکہ اس کے دور رس نتائج کا تصور بھی نہیں ہے کہ چند ہی مہینوں میں شروع ہو جائے۔

دراصل یہ وہی فیصلہ تھا جس کے کپلے کے بعد امریکی صدر مسٹر کلتھن کے لیے ناگزیر ہو گیا کہ وہ متحدہ لوگوں کو اس سے انکار کرنے کے لیے اور اس کا کے میں بدگ بھرنے کے لیے انویٹیشن کا دورہ کریں۔ چنانچہ امریکی صدر کے حالیہ دوروں کی جان بچاؤ میں شامہ کل بدگ بھرنے کی صدر نے اس حرکت کا انتظام کے ساتھ کسی غلطی کا دورہ کیا اور جیسا سوچا وہ صدر امریکہ مسٹر کلتھن نے مارچ ۱۹۷۵ء میں ۱۰۰۰۰۰ میں انویٹیشن کے تین ملکوں کا دورہ کیا۔

چونکہ یہ دورہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے اور اس کے انعقاد نیا پ دورہ کی اثرات مرتب ہوتے جا رہے ہیں اس لیے اس کے حقیقی منظر کا جائزہ لینے بغیر اس کی اہمیت کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

اگلی اقوام متحدہ (U.N.C.D) حکومت وچال کی پہلی باضابطہ شکل ہے۔ اس کے قیام کے لیے کئی ممالک کے برادرانہ گزشتہ چار سو سال سے کوشاں تھے۔ غیر ماسن، فرانسول اور انسان دوستی کے وسیع پردوں میں انھیں کے درجہ کو انسانی شہریت کی وائٹس و عزت یہ و روسی (Azarish de' Rossi) (Oca-108) نے اپنی کتاب میں (Meor Enayim) میں بیان کیا ہے۔

نویاتی قوم قوموں کو جان لینا چاہئے کہ ہم سرانگل کے بنے گئے لوگ ہیں
منظر طور پر یہ ہے ہیں ہائیڈ کے آواز اور کیا (NCC) کی وائٹ کہ اس کے
پانچ ہیں کہ انہی راست کے لیے ہر قوم حکومت کر رہی ہے اس میں ہر ملک کی طاقت
کی بھی تبد سے نہ ہوا اس میں ہر قوم کی صاحب کہ ہم اپنے گھروں کے سب سے زیادہ
طرف انھیں دے گئے ہیں ہوا کے تمام نئے گھروں کے لیے دعا کریں اور اس کی کوئی
کسی دوسرے پر حکومت نہ لگائے اور یہ کہ وہی کے دلوں سے ہر طرح کے غرض اور

نفرت کو دور کر دے اور اس کی جگہ اس دنیا میں امن کی شجرکاری کر دے: اس لیے کہ ان قوموں کے امن میں ہمارے لیے بھی امن ہے۔“

(Meor Enayim: Azariah de' Rossi, Montua, 1573(A.D), P.169b) ۱۔

یہودیوں کو عقائدی ولولے سے پر کر دینے اور قلبی اطمینان سے آسودہ کر دینے کے لیے ابلیس نے انہیں دینی جواز کی فراہمی کی۔ چنانچہ ساری دنیا کے یہودی مسیح دجال کی آمد سے قبل اس کے لیے ایک عالمی حکومت کے قیام کی کوشش، اور ہیکل سلیمانی کی از سر نو تعمیر کے دینی جذبے کے تحت کام کرنے میں سرگرم ہو گئے۔ انہیں اس کا قطعاً احساس نہیں کہ ایسا کر کے وہ اللہ کی رضا کی تکمیل کے بجائے طاغوت اور دجال کے لیے سرگرم ہیں۔ وہ اس مسیح کے لیے نہیں جس کا انتظار ان کے آبا کر رہے تھے اور جنہیں اپنی پہلی بعثت پر وہ نہ صرف جھٹلا چکے ہیں بلکہ اپنے علم کی حد تک اسے مصلوب بھی کر چکے ہیں بلکہ اس مسیح کے مخالف مسیح دجال کے لیے کوشاں ہیں (اس دجل کی تفصیلات ان شاء اللہ آئندہ ابواب میں آئیں گی)۔ امن، خوشحالی اور عدل کا وہ دور جسے دراصل حضرت مسیح علیہ السلام مسیح دجال اور اس کے حلیفوں کو قتل کر کے پوری روئے ارض پر ان شاء اللہ قائم کریں گے۔ یہ یہودی اس دور کو دراصل مسیح دجال کے لیے قائم کرانا چاہتے ہیں۔ ابلیس نے انہیں یہ دھوکہ دیا ہے کہ اصلی مسیح مسیح دجال ہے اور اللہ رب العزت کا بھیجا جانے والا مسیح یعنی عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام دراصل مسیح دجال اور دہشت گردوں کا سردار ہے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

چنانچہ اقوام متحدہ کا چارٹر دراصل مسیح دجال کا چارٹر ہے۔^۲ چنانچہ انیسویں صدی میں عالمی نظام کی تعمیر کی کوششیں ہوں (جن کا ذکر عالم اسلام کی اقتصادی صورت حال صفحات ۲۰-۲۳ میں کیا گیا ہے) یا ۱۸۹۷ء میں بازل (Basel) میں صیہونی تنظیم کا قیام ہو یا اس کے تحت پوری کی جانے والی منصوبہ بندی — جن میں قابل ذکر سائیکس پیکٹ خفیہ معاہدہ (Sykes-Picot Secret Agreement 1904) (۲) اعلان بالفور (Balfour Declaration 1916) (۳) وارسای معاہدہ (Treaty of Versaille 1921) (۴) لیگ آف نیشنز کا قیام (League of Nations) اور (۵) کیلاگ براؤنڈ پیکٹ

(Kellog - Briand Pact 1928) ہیں — یہ دراصل اسی اقوام متحدہ کے قیام کی کوششیں تھیں جو اپنے ظاہر کے اعتبار سے زمین پر امن، خوشحالی اور عدل کی اسی ربانی حکومت کے قیام کے لیے ہے جسے مسیح قائم کریں گے۔ لیکن باطن کے اعتبار سے یہ مسیح دجال کی وہ حکومت ہے جسے ابلیس ربانی مسیح کو ختم کر کے قائم کرنا چاہتا ہے۔ اور جس کے لیے اس کے حلیف یہودی اور دیگر شیاطین راہ ہموار کر رہے ہیں۔

حاشیہ ۲ میں مذکورہ تفصیلات جنہیں مندرجہ ذیل چھ عنوانات کے تحت ملخص کیا جاسکتا

ہے یہ ہیں

- (1) Peace among animals, no ravenous beast, the child (Adam) leading them.
- (2) Desert and waste become beautiful and fertile.
- (3) Abundance without labour.
- (4) The waters and trees.
- (5) The new state is on the mountain, in accordance with the idea that Paradise was on a mountain — This mountain is now to be Mt. Zion.
- (6) There is to be no bodily defect or sorrow or war but everywhere happiness and contentment while Yahweh will be present among men.

ترجمہ:

- (۱) جانوروں کے مابین امن قائم ہو جائے گا۔ کوئی جانور درندہ صفت نہیں رہے گا۔ یہاں تک کہ آدمی کا بچہ اس سے کھیلے گا۔
- (۲) تمام صحرا اور بنجر زمین خوبصورت اور زرخیز ہو جائے گی۔
- (۳) لوگوں کو کم محنت کرنا ہوگی اور دافر مقدار میں ہر چیز پیدا ہوگی۔
- (۴) ساری زمین میں ہر جگہ دافر مقدار میں پانی پوری اور درخت دستیاب ہوں گے۔
- (۵) زمین پر نئی ریاست (ریاست ربانی) ایک اونچے پہاڑ پر قائم کی جائے گی۔ اور یہ اس تصور کے مطابق ہے کہ الجنت اونچی جگہ پر قائم تھی — اب اس اونچے پہاڑ کا تصور جبل صیہون میں بدل چکا ہے۔
- (۶) لوگوں میں کسی قسم کی جسمانی اور طبعی خرابی باقی نہیں رہے گی۔ ہر شخص دکھ اور غم سے آزاد ہو گا۔ زمین پر جنگ کا نام و نشان باقی نہیں رہے گا، ہر طرف خوشیاں ہی

خوشیاں ہوں گی اور طمانیت اور سیری ہوگی اور یہودالوگوں کے مابین موجود ہوگا۔
 دجال کی اسی آئندہ حکومت کے ابتدائی خدوخال کو صدر امریکہ فرینکلن ڈوائٹ روزولٹ
 نے یکم جنوری ۱۹۴۲ء کو **Declaration by United Nation** کے نام سے پیش کیا
 تھا۔ یہ دجالی پیش خیمہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو وجود میں آ گیا۔ دجالی حکومت کے مذکورہ مقاصد کی تکمیل
 کو اس کے چارٹر میں ان الفاظ میں متعین کیا گیا:

- (1) To maintain international peace and security.
- (2) To develop friendly relations among nations based on respect for the principle of equal right and self-determination of peoples;
- (3) To co-operate in solving international economic, social, cultural and humanitarian problems and in promotion respect for human rights and fundamental freedoms;
- (4) To be a centre for harmonizing the actions of nations in attaining these common ends. ۳

- ترجمہ:
- (۱) بین الاقوامی امن اور سلامتی کو بحال رکھنا۔
 - (۲) قوموں کے مابین مساوی حقوق اور قوموں کے حق خود اختیاری کے اصول کی بنیاد پر دوستانہ تعلقات کو فروغ دینا۔
 - (۳) بین الاقوامی معاشی، معاشرتی، ثقافتی اور انسانی مسائل کو حل کرنے میں تعاون کرنا اور انسانی حقوق اور بنیادی آزادی کے تحفظ کو فروغ دینا۔
 - (۴) ان مشترکہ مقاصد کے حصول کیلئے قوموں کے مابین تعامل کو منجم کرنے کیلئے مرکز کی طرح کام کرنا۔

اس مقام پر اقوام متحدہ، سلامتی کونسل، عالمی ٹرائینلز اور ہیگ کی عالمی عدالت کی حقیقت کو سمجھنے کیلئے ان کے یہاں استعمال ہونے والی اصطلاحات کی ذمہ داری (Equivocality) اور ان کی سریت (Cryptology or Cryptic Import) کا سمجھنا ضروری ہے۔

ان میں سے مفہوم کی ایک قسم تو وہ ہے جو معروف ہے اور قانون کی کتابوں میں عموماً اس

کا ذکر ملتا ہے۔ اور عام طور پر یہودیت اور دجالی طاقتوں کے علاوہ لوگ اسی مفہوم کو جانتے اور سمجھتے ہیں۔ لیکن اصطلاحات کی اس معنویت سے الگ ایک اور معنویت ہے جو ان اصطلاحات سے اصلاً مقصود ہے۔ چنانچہ یہودیت اور دجالی قوتیں آپسی بیانات میں ان اصطلاحوں کا استعمال مؤخر الذکر معنویت کے ساتھ کرتی ہیں۔ ہر چند کہ یہاں اس کا موقع نہیں کہ ان سینکڑوں بلکہ ہزاروں اصطلاحات کا ذکر کیا جائے اور ان کے اصل معانی (Imports) یا خفیہ معانی (Hidden Meanings) بتائے جائیں تاہم زیر بحث عنوان کے تعلق سے چند اصطلاحات کا ذکر کرنا مفید ہو گا۔

(۱) بین الاقوامی (International) : اس کے دو معانی لیے جاتے ہیں۔ پہلا (۱) وہ تعلق، معاملہ یا نزاع جس کا تعلق دو ایسے فریقوں سے ہو جن میں دونوں غیر یہودی ہوں۔ دوسرا (۲) وہ تعلق، معاملہ، یا نزاع جس کا تعلق دو ایسے فریقوں سے ہو جن میں ایک یہودی اور دوسرا غیر یہودی ہو۔

عام طور پر اس لفظ کا استعمال پہلے معنی میں ہوتا ہے۔ کبھی کبھی دوسرے معنی میں۔
(۲) آفاقی (Cosmopolitan) : یہ ایک خفیہ اصطلاح ہے۔ جب اس کا استعمال واحد میں Nation یا People کے ساتھ ہو یعنی Cosmopolitan Nation or People تو اس کا مطلب ہے یہودی قوم۔

(۳) آفاقی شہر (Cosmopolitan city) : یہ بھی یہ ایک خفیہ اصطلاح ہے۔ اور اس کا استعمال بعض اوقات یہ بتانے کے لیے ہوتا ہے کہ فلاں شہر میں یہودی اچھی خاصی تعداد میں آباد ہیں۔

(۴) اقوام (Nations) : اس کا استعمال ٹھیک اسی طرح ہوتا ہے جیسے بین الاقوامی (International) لفظ کا۔

(۵) بین الاقوامی امن (International Peace) : بیسویں صدی کے اوائل سے اس کے استعمال میں باضابطگی اور دقت آگئی ہے۔ اب اس کا مفہوم ہے یہودی قوم کے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے موافق عالمی صورت حال۔ چنانچہ اس کا استعمال مثبت اور منفی دونوں اعتبار سے ہوتا ہے۔

مثبت استعمال: کسی خطے میں یہودیوں کی جان اور مال کو خطرہ درپیش ہو اور اس کا سبب وہاں پھیلی ہوئی قتل و غارت گری ہو قطع نظر اس کے کہ اس کا سبب کچھ بھی ہو اور یہ کہ وہ سبب معقول ہو یا نامعقول۔ تو اس صورت میں اس قتل و غارت گری کو بند کرانا جس سے بالواسطہ یا بلا واسطہ یہودیوں کی جان و مال محفوظ ہو جائیں خواہ اس عمل سے دوسری اقوام کی جان اور مال کے تحفظ کا بھی سامان کیوں نہ ہو جائے اسے بین الاقوامی امن (International Peace) کا مثبت استعمال کہتے ہیں۔

منفی استعمال: کسی خطے یا پوری روئے زمین میں یہودیوں کی جان اور مال کی ترقی اور ان کے مقاصد کے حصول کے لیے اگر جنگ کا بھڑکنا اور دوسری اقوام کی جانوں اور مالوں کی بے دریغ بربادی ضروری ہو تو ایسا کرنا اور ایسی جنگ بھڑکانا بین الاقوامی امن (International Peace) کا منفی استعمال ہے۔

پوری اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی یورپی تاریخ اور بیسویں صدی کے نصف اول کی عالمی تاریخ منفی استعمال کی بہترین مثال ہے جبکہ بیسویں صدی میں ۱۹۲۱ء سے لے کر اب تک اس کے مثبت استعمال کی بھی کئی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔

(۶) بین الاقوامی سلامتی (International Security): اس اصطلاح کا مفہوم ہے کسی خطے یا پوری روئے ارض کی وہ کیفیت جس سے یہودی جان و مال سلامت رہیں اور ان کے مقاصد کے حصول کی راہ مسدود نہ ہو۔ بین الاقوامی امن اور بین الاقوامی سلامتی میں فرق کیفیت کے اظہار اور حکمت عملی کے اظہار کا ہے۔ اول الذکر میں پہلی صورت نمایاں ہے اور ثانی الذکر میں دوسری صورت۔

(۷) بین الاقوامی نزاع (International Dispute): اس اصطلاح سے عام طور پر وہ معنی لیے جاتے ہیں جس کا تعلق دو فریقوں کے مابین نزاع سے ہو اور ان میں دونوں فریق غیر یہودی ہوں۔ چنانچہ اقوام متحدہ ایسے نزاعات کے حل کا کوئی پروگرام نہیں رکھتی۔ چونکہ یہ نزاعات ہر چند کہ یہودیوں سے متعلق نہیں ہیں لیکن چونکہ ان کی موجودگی میں یہودی مقاصد کی تکمیل میں رکاوٹ پڑتی ہے اس لیے ان نزاعات کو اس طرح ختم کر دینا یا زیر قابو کر لینا جو یہودی مقاصد کے حصول کی راہ کو دبا کر دے اقوام متحدہ کے مقاصد کا ایک حصہ ہے۔ عام طور پر ایسے نزاع

یا نزاعات کو جن میں ایک فریق یہودی ہو بین الاقوامی نزاع نہیں کہا جاتا۔

(۸) بین الاقوامی خطرہ (International Threat) : یہ اصطلاح بھی بڑی دقیق

ہے۔ اس کا پورا استعمال اس طرح عام طور پر کیا جاتا ہے:

Threat to the International Peace and Security.

اس کا مفہوم ہے وہ تمام افراد، گروہ، حکومتیں، ان کے افعال و اعمال یا نزاعات جن سے یہودیوں کی عالمی سلامتی کو خطرہ ہو یا ان کے مقاصد کے حصول میں حقیقی مانع یا موانع ہوں۔

(۹) انسانی حقوق (Human Rights) : انسانی حقوق سے مراد ہے وہ کیفیت،

قانون، انتظام یا حالت جس سے یہودیوں کی جان اور مال محفوظ ہوں یا انہیں کوئی حقیقی خطرہ نہ ہو۔

(۱۰) بنیادی آزادی (Fundamental Freedom) : اس سے مراد وہ ساری

آزادی یا ان ساری قوموں کی آزادی ہے جن سے یہودی اپنے مقاصد کا حصول کر سکیں۔ وہ ساری پابندیاں جو یہودیوں یا ان کے عملیوں کے مقاصد کے حصول میں رکاوٹ بنیں بنیادی آزادی کے منافی ہیں۔

(۱۱) معاشی یا مالی بحران (Economic or Financial Crisis) : معاشی یا مالی

بحران سے دو باتیں مراد ہیں۔

(۱) کسی خطے یا پوری روئے زمین میں وہ معاشی یا مالی صورت حال جس سے مقامی یا عالمی

طور پر یہودی مفادات کو خطرہ درپیش ہو۔

(۲) کسی خطے یا پوری روئے زمین میں وہ معاشی یا مالی صورت حال جو یہودیوں کے ذریعہ

اپنے مقاصد کے حصول کے لیے قائم کیے جانے والے دو عالمی اداروں IMF اور IBRD

یا World Bank کے اپنے مقاصد کے پورا کرنے یا ان کے عہدگی سے کام کرنے میں رکاوٹ پیدا کرے۔

(۱۲) حکمت عملی کے علاقے (Strategic Areas) : کسی خطے یا پوری روئے

زمین میں وہ تمام علاقے جو یہودیوں کے مقاصد کے حصول کے نقطہ نظر سے بے حد اہم ہوں۔

(۱۳) قانون کی حکمرانی (Rule of Law) : بظاہر اس اصطلاح کا مفہوم یہ ہے کہ

کسی خطہ کر ض بالخصوص قومی ریاستی نظام (Nation State System) میں لا قانونیت اور

آمریت نہ ہو بلکہ قانون اور ضابطہ کی حکومت قائم ہو جو پارلیامنٹ کو جوابدہ ہو۔
 لیکن اس کا حقیقی مفہوم ہے کسی خطہ ارض یا قومی ریاستی نظام میں کسی ایسے قانون کا نہ پایا جانا یا اگر ہو تو اس کا خاتمہ جس میں بالواسطہ یا بلاواسطہ یہودیوں کی کارروائیوں اور بالخصوص ان کے اپنے مقاصد کے حصول میں کی گئی کارروائیوں پر قدغن لگایا گیا ہو۔ دنیا میں وہ خطہ یا ملک جہاں یہودیوں کو سب کچھ کرنے کی کھلی چھوٹ ملی ہوئی ہو اسے ایک ایسا ملک کہا جاتا ہے جہاں قانون کی حکمرانی (Law of Rule) ہے۔

(۱۳) عالمی حکمرانی (Global Governance) : اس کا عام مفہوم ہے پورے روئے ارض پر تمام لوگوں کے جمہوری حقوق کی پاسداری کرنے والی عالمی حکومت اور اس کی کارروائی یا کارکردگی یا اس کا طریقہ انتظام۔

لیکن اس کا حقیقی مفہوم ہے پورے خطہ ارض پر قائم وہ براہ راست یہودی حکمرانی جسے وہ ”برگزیدہ قوم کی حکمرانی“ (Governance of the Chosen People) کہتے ہیں۔ جب ساری دنیا میں وہ حکمرانی قائم ہو جائے گی تو یہی مثالی عالمی حکمرانی سے تعبیر کی جائے گی۔

(۱۵) عالمی مہذب معاشرہ (Global Civil Society) : اس کا عام مفہوم ہے پوری روئے زمین کے ہر حصے میں ایسے افکار و نظریات پر قائم معاشرہ قائم کرنا جہاں جمہوریت، انسانی حقوق اور آزادی رائے کو یقینی صورت میں دیکھا جاسکے۔ لیکن اس کا حقیقی مفہوم ہے پوری روئے زمین پر ایسی معاشرت قائم کرنا اور اس کے تحت ایسے نظام حکومت، نظام رہائش اور نظام علوم قائم کرنا جہاں یہودیوں کی ہر خواہش کی تکمیل ممکن ہو اور ان کے مقاصد کی تکمیل میں نہ صرف یہ کہ کوئی مزاحمت نہ ہو بلکہ پورا معاشرہ اسے اپنا مقصد حیات سمجھ کر خود یہودیوں کے لیے اسے پورا کرنے میں سرگرم ہو جائے۔

(۱۶) عالمی مہذب اخلاقیات (Global Civic Ethics) : وہ نقطہ نظر، آئیڈیا لوجی، علوم، طرز رہائش اور پسند و ناپسند کا معیار جو عالمی مہذب معاشرہ کی تکمیل کرتے ہیں۔ مہذب اخلاقیات کہلاتی ہیں۔ چنانچہ پوری روئے ارض پر اس کی توسیع اور اس کے مطابق ارض کا انتظام عالمی مہذب اخلاقیات کہلاتا ہے۔

(۱۷) ریاستوں کو کھلی طور پر غیر عسکری بنانا (Total Demilitarization of

(States) اس کا ظاہری مفہوم ہے کہ پوری روئے ارض سے جنگ اور جنگ کی تباہ کاریوں کے امکانات کو ختم کرنا۔

جبکہ اس کا حقیقی مفہوم ہے یہودیوں کے علاوہ دنیا کی تمام قوموں میں اس عسکری صلاحیت (Potential) کو کلی طور پر ختم کر دینا جو کبھی بھی یہودیوں کے خلاف استعمال ہو سکتی ہو۔ اور یہ اس صورت میں ہو کہ خود موجود یہودی عسکری صلاحیت اپنے معیار کے اعتبار سے دنیا میں بے مثل Unparalleled ہو جائے اور ناقابل چیلنج برقرار رہے۔

حکومت دجال کے اس ابتدائی خاکے میں بظاہر سب سے اہم ادارہ جنرل اسمبلی (General Assembly) ہے جو محض ایک ندوہ خطابہ کی حیثیت سے قائم کیا گیا۔ چنانچہ اسے محض عضو خطابی (Deliberative Organ) قرار دیا گیا اور اس دجالی حکومت کے مقاصد کی تکمیل کا اصلی ادارہ سلامتی کاؤنسل (Security Council) طے پایا۔ چنانچہ اسے بنیادی طور پر ذمہ دار ادارہ قرار دیا گیا ہے اور اس کے مقاصد اور فرائض کی تعین اس طرح کی گئی:

- (1) to maintain international peace and security in accordance with the principle and purposes of the United Nations;
- (2) to investigate any dispute or situation which might lead to international friction;
- (3) to recommend methods of adjusting such disputes or the terms of settlements;
- (4) to formulate plans for the establishment of a system to regulate armaments;
- (5) to determine the existence of a threat to the peace or act of aggression and to recommend what action should be taken, to call on Members to apply economic sanctions and other measures not involving the use of force to prevent or stop aggression;
- (6) to take military action against an aggressor;
- (7) to recommend the admission of new members and the terms on which states may become parties

to the statute of the International court of Justice;
 (8) to exercise the trusteeship functions of the United Nations in "Strategic areas";
 (9) to recommend to the General Assembly the appointment of the Secretary General and together with the Assembly, to elect Judges of the International Court.

ترجمہ:

- (۱) اقوام متحدہ کی اصولیات اور مقاصد کے مطابق بین الاقوامی امن و سلامتی کو بحال رکھنا۔
- (۲) کسی نزاع یا صورت حال کی جس کے بین الاقوامی تصادم کا باعث ہونے کا اندیشہ ہو جانچ کرنا۔
- (۳) ایسے نزاعات کے سمجھوتہ کرانے کے طریقوں کی یا سمجھوتہ کے شرائط کی سفارش کرنا۔
- (۴) ہتھیار بندی کو قابو میں رکھنے کے نظام کے قیام کے منصوبوں کو تیار کرنا۔
- (۵) امن کے خطرہ اور جارحیت کے عمل کے وجود کو متعین کرنا اور اس بات کی سفارش کرنا کہ کیا اقدامات کیے جائیں۔ ارکان سے کہا جائے کہ وہ معاشی پابندیاں عائد کریں اور دوسرے ایسے اقدامات کریں جن میں طاقت کا استعمال نہ ہو تاکہ جارحیت واقع نہ ہو یا رک جائے۔
- (۶) جارح کے خلاف عسکری کارروائی کرنا۔
- (۷) نئے ارکان کے داخلہ کی اور ان شرائط کی سفارش کرنا جن پر ریاستیں بین الاقوامی عدالت انصاف کے ضابطہ میں شریک ہو سکیں۔
- (۸) "حکمت عملی" کے علاقوں میں اقوام متحدہ کے واقف کی ذمہ داریاں ادا کرنا۔
- (۹) جنرل اسمبلی کے سکرٹری جنرل کے اپوائنٹمنٹ کے لیے سفارش کرنا اور اسمبلی کے ساتھ اس کا انتخاب کرنا اور اسی طرح بین الاقوامی عدالت انصاف کے ججوں کا انتخاب کرنا۔

حکومت دجال کی یہی وہ تشکیل ہے جس پر تبصرہ کرتے ہوئے اس عہد کے مشہور یہودی مفکر اور دانشور Cecil Roth نے یوں لکھا ہے۔

"These, in the present generation, Jews have endeavoured to act up to the noble sentiment expressed by Azariah de' Rossi, nearly, four centuries ago."^۵

ترجمہ:

"اس طرح، موجودہ نسل میں، یہودیوں نے ان نیک جذبات کے شایان شان عمل کرنے کی کوشش کی جن کا اظہار عزاریہ دروسی نے چار صدیوں قبل کیا تھا۔"

اور اس وقت جب یورپ انہیں یہودیوں کی بھڑکائی ہوئی آگ میں جلنے لگا تھا اس نے یہودیوں کی کوشش کو روکنے اور ان کو سیوتا کر کے والوں کو اس طرح دھمکی دی تھی:

"For two thousand years, then, the Jews have formed part of Europe. They have throughtout that period --- though more intensively during the past centuries, since the gates of Ghetto were broken down --- made their contribution to the common heritage: sometimes as intermediaries sometimes as pioneers, more often (so far as their activities were not curtailed) as participants. In the long run, their contribution has become interworven inextricably with the common stock by a thousand different strands. Disintegrate these, and the tree of western culture would be mutilated. Allow them unobstructed growth, and it may bear in the future through this means fruit yet more splendid than in the Past."^۶

ترجمہ:

"اس وقت، تقریباً دو ہزار سالوں سے یہودی یورپ کا حصہ بن چکے تھے۔ اس پوری مدت میں --- گرچہ پچھلی صدیوں میں زیادہ شدت کے ساتھ خاص طور پر جب سے Ghetto کے دروازے توڑ کر گرا دیئے گئے۔ انہوں نے مشترکہ وراثت کے لیے اعانت کی ہے۔ کبھی واسطہ بن کر، کبھی رہنما بن کر، بیشتر (جہاں تک کہ ان کی سرگرمیوں پر پابندی نہیں تھی) شریک بن کر۔ آخر کار، ان کی اعانتیں عام لوگوں میں ہزاروں مختلف تانوں بانوں کی طرح پھیل گئیں۔ ان تانوں اور بانوں کو بکھیر دیجئے اور دیکھ لیجئے کہ مغربی ثقافت کا درخت کس طرح ٹھونٹھا ہو جاتا ہے۔ اس کے

برخلاف انہیں بے روک ٹوک بڑھنے دیجئے تو دیکھ لیجئے گا کہ مستقبل میں کس طرح اس سے بھی شاندار پھل برآمد ہوں گے۔“

چنانچہ اپنے قیام سے لے کر اب تک اقوام متحدہ نے بالعموم اور سلامتی کونسل نے بالخصوص وہی کیا ہے جو اس دجالی حکومت کے قیام، توسیع اور استحکام کے لیے ضروری تھا۔ وہ سارے مسئلے حل کیے گئے جن کا حل یہودیوں کے لیے ضروری تھا حتیٰ کہ ایک مصنوعی قوم آباد کر دی گئی اور ایک مصنوعی ملک وجود میں لادیا گیا۔ ان چھوٹے سے چھوٹے مسئلوں کو بھی قابل توجہ سمجھا گیا اور ان کے حل میں پیش قدمی کی گئی جو یہودیوں کے لیے براہ راست یا بالواسطہ ضروری تھے اور ان مسئلوں کو جو اپنی جگہ کتنے ہی بڑے اور خطرناک کیوں نہ ہوں اور جن کے حوالے سے لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں جانوں کا زیاں ہوایا ہو رہا ہونا قابل التفات قرار دیئے گئے۔ یہاں تک کہ اس ابتدائی خاکے نے پچاس سال پورے کر لیے۔ اس پوری مدت میں بطور خاص خلافت اسلامیہ کا خاتمہ کر دیا گیا اور پوری اسلامی دنیا پر اس دجالی حکومت نے اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ امت مسلمہ کی قرآن و سنت سے دوری، اس کے علماء اور دانشوروں کی بے حسی اور حکمرانوں کی گمراہی نے پوری ملت اسلامیہ کو اس مملکت کا مجبور شہری یا غلام بنادیا جس کا استیصال ان پر واجب تھا اور جس کی کسی بھی شے سے استفادہ ان پر حرام تھا چہ جائیکہ اس کا حصہ بن کر اس کے استحکام اور توسیع میں آلہ کار بننا۔

پچاس سالوں کی کامیابی نے یہودیوں کے لیے حکومت دجال کو پوری طرح قائم کر دینے کی راہ صاف کر دی چنانچہ انہوں نے اقدام کیا اور اس طرح اس حکومت کا دوسرا دور ۱۹۹۱ء سے شروع ہو گیا جس کا خاکہ ۱۹۹۵ء میں

"Our Global Neighbourhood : The Report of the Commission on Global Governance "

کے نام سے شائع کیا گیا جس کی سفارشات درج ذیل تھیں۔ ان سفارشات پر ایک گہری نظر اور ۱۹۲۵ء میں اقوام متحدہ کے چارٹر کا تقابلی مطالعہ بڑی آسانی سے یہ باور کرا سکتا ہے کہ کس طرح ۱۹۲۵ء میں قائم کردہ دجالی حکومت اب اپنے دوسرے مستحکم دور میں داخل ہو گئی ہے۔ سفارشات درج ذیل ہیں:

Summary of Proposals in Chapter Six: (Strengthening International Law)

(1) All members of the United Nations should accept the compulsory Jurisdiction of the World Court.

(2) The Chamber procedure of the World Court should be modified to address its dangers and to increase its appeal to states.

(3) World Court judges should be appointed for one ten-Year term only, and a system introduced to screen potential members for jurisprudential skills and objectivity.

(4) States should be encouraged to include in future agreements and treaties provisions for the settlement of any inter state disputes.

(5) The UN Secretary General should have the right to refer the legal aspects of emerging disputes to a full bench of the World Court for advice at an early stage.

(The Security Council)

(6) A distinguished legal person should be appointed by the Security Council to provide independent advice on international legal proposition to the Council.

(7) The Security Council should make greater use of the World Court as a source of advisory opinions and, wherever possible, avoid being the judge of what international law may or may not be in particular cases.

(Enforcing International Law)

(8) An international criminal court should be established with an independent prosecutor or panel of prosecutors of the highest moral character as well as the highest level of competence and experience.

(9) International treaties should include provision to help countries that may otherwise face financial hardship in complying with them.

(10) Failing voluntary compliance, Security Council enforcement of World Court decisions and of other international legal obligations should be pursued.

(11) An appropriate body should be asked to explore ways in which international law-making can be expedited without calling into question the consensual nature of International Law.

ترجمہ:

باب ششم کی سفارشات کی تلخیص

بین الاقوامی قانون کو مستحکم کرنا

(۱) اقوام متحدہ کے تمام اراکین کو چاہئے کہ وہ عالمی عدالت کے دائرہ اختیار کو لازم اور واجب تسلیم کریں۔

(۲) عالمی عدالت کی کارروائی کے طریقہ کار میں اس طرح تبدیلی کی جائے تاکہ یہ ان خطرات کا مقابلہ کر سکے جو اس کے لیے پیدا ہو گئے ہیں یا ہونے والے ہیں ساتھ ہی ساتھ اس کے لیے بھی تاکہ دیگر ملکوں کے لیے اس کی جاذبیت میں اضافہ ہو۔

(۳) عالمی عدالت کے جج ایک دہہ سالہ مدت کے لیے تعینات کیے جائیں اور ایک ایسا نظام جاری کیا جائے تاکہ انصاف کی مہارت اور معروضیت رکھنے والے ایسے باصلاحیت اراکین کی پرکھ کر تعیناتی کی جاسکے۔

(۴) ملکوں کو اس بات پر ابھارا جائے کہ وہ آئندہ کرنے والے معاہدوں اور اتفاق رائے میں اس بات کو شامل کریں کہ بین الممالک تنازعات پر (اس عدالت کے تعلق سے) شق ہو۔

(۵) اقوام متحدہ کے سکرٹری جنرل کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ کسی پیدا ہونے والے تنازعہ کے قانونی پہلو کے تعلق سے عالمی عدالت کے پورے بیج سے قانونی مشورہ طلب کرے۔

سلامتی کونسل

(۶) سلامتی کونسل کے ذریعہ ایک منفرد ماہر قانون کی تعیناتی ہو جو کونسل

کے بین الاقوامی قانونی تجاویز پر آزادانہ رائے فراہم کرے۔

(۷) سلامتی کو نسل عالمی عدالت کا مشیرانہ مآخذ کی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ استعمال کرے اور جہاں تک ممکن ہو کسی مخصوص بین الاقوامی مسئلے میں کیا بین الاقوامی قانون ہونا چاہئے یا نہ ہونا چاہئے کے تعلق سے فیصلہ کرنے والا بننے سے احتراز کرے۔

بین الاقوامی قانون کا نفاذ

(۸) اعلیٰ ترین اخلاقی کردار اور اعلیٰ ترین صلاحیت اور تجربے سے متصف آزاد حاکم یا حکام کی تعیناتی کے ساتھ ایک بین الاقوامی فوجداری عدالت کیا قیام کیا جائے۔

(۹) بین الاقوامی معاہدوں میں یہ شق موجود ہو کرے کہ اگر کسی ملک کو ان کے فیصلوں کی تعمیل کرنے میں مالی دشواری کا سامنا ہو تو ان کی مدد کی جائے۔

(۱۰) رضاکارانہ عملدرآمد میں ناکام ہونے کی صورت میں سلامتی کو نسل عالمی عدالت کے فیصلے کو نافذ کرنے اور دیگر عالمی قانونی واجبات کی ادائیگی کے لیے کارروائی کرے۔

(۱۱) بین الاقوامی قانون کی متفقہ صورت کو مجروح کیے بغیر ایک بین الاقوامی قانون بنانے کے لیے ایک مناسب باڈی کو کام کرنے کے لیے کہا جائے۔

ان سفارشات کو رو بہ عمل لانے اور پورے عالم میں اس دجالی حکومت کو مستحکم کرنے کے لیے طریقے بتائے گئے ہیں جن کی تفصیل باب ۱۷ میں درج کی گئی ہے جس کی تلخیص مندرجہ ذیل ہے:

- (1) Establishment of Global Governance.
- (2) Establishment of Global Civil Society.
- (3) Promotion of Global Civic Ethics.

اور شق نمبر ۲ اور ۳ کے لیے سر دست قومی حکومتوں سے کام لیا جائے اور ساری دنیا میں NGO's کا جال پھیلا دیا جائے اور ان سے کام لیا جائے۔

- (4) Strengthening of Global Security.

اور اس کو مستحکم کرنے کے لیے

- (a) Total Demilitarization of States.

(b) Nuclear Disarmament

نیوکلیری طور پر نہتہ کرنے کے لیے چار محاذ متعین کئے گئے ہیں:

(1) The earliest possible ratification and implementation of existing agreements on nuclear and other weapons of mass destruction;

(2) the indefinite extension of the Non-Proliferation Treaty;

(3) the conclusion of a treaty to end all nuclear testing; and

(4) the initiation of talks among all declared nuclear powers to establish a process to reduce and eventually eliminate all nuclear arsenals

ترجمہ:

(۱) نیوکلیری اور عام تباہی لانے والے ہتھیاروں کے تعلق سے موجود اتفاق

رانے کی جلد از جلد توثیق اور ان پر عمل درآمد کرانا۔

(۲) عدم پھیلاؤ معاہدے میں غیر معینہ مدت کی توسیع کرانا۔

(۳) تمام نیوکلیری تجربوں کے خاتمے پر معاہدہ کرانا۔

(۴) تمام نیوکلیری اسلحہ سازوں کو کم کرنے اور فی الحقیقت ان کے کلی خاتمے

کے طریقوں کو وضع کرنے کے لیے تمام اعلان شدہ نیوکلیری طاقتوں کے مابین بات

چیت کا آغاز کرنا۔

(5) Establishment of an Economic Security Council

(ESC) to ensure Financial Economic Globalisation.

(۵) مالی معاشی مالیت کو یقینی بنانے کے لیے ایک معاشی سلامتی کونسل

قائم کرنا۔

جنس کے مقاصد ہوں گے:

(1) to continuously assess the overall state of the World economy and the interaction between major policy areas;

(2) Provide a long-term strategic policy framework in order to promote stable, balanced, and

sustainable development;

(3) Secure consistency between the policy goals of the major international organisations, particularly the Bretton Woods bodies and the World Trade Organizations (WTO) ; and

(4) give political leadership and promote consensus on international economic issues.

ترجمہ:

(۱) عالمی معیشت کی حالت اور خاص پالیسی میدانوں میں باہمی تعامل کا سالانہ بلا فصل جائزہ لینا۔

(۲) مستحکم، متوازن اور پائیدار ترقی کی افزائش کے لیے طویل المدت حکمت عملی کے لائحہ کی فراہمی کرنا۔

(۳) بڑے بین الاقوامی اداروں بطور خاص برٹن وڈس ادارے اور عالمی ادارہ تجارت (WTO) کے پالیسیوں کے مقاصد میں تطبیق کی حفاظت کرنا — اور

(۴) سیاسی قیادت دینا اور بین الاقوامی معاشی امور میں اتفاق رائے کی افزائش کرنا۔

ان کے تحت WTO ایک اقوام متحدہ کے عضو کی طرح کام کرے گا اور ایک (Global Competition Office) قائم کرے گا۔ دوسری جانب برٹن وڈس ادارے (Bretton Woods Institutions) یعنی آئی ایم ایف (IMF) اور ورلڈ بینک (WB) کی کارکردگی کو اس حکومت و جال کے استحکام کے لیے مزید ترقی دی جائے گی جو درج ذیل ہیں:

(1) Enlarging its capacity for balance of payments support through low conditionality compensatory finance.

(2) having oversight of the international monetary system and a capacity to ensure that domestic economic policies in major countries are not mutually inconsistent or damaging to the rest of the international Community.

(3) releasing a new issue of Special Drawing Rights; and

(4) improving its capacity to support nominal exchange rates in the interest of exchange rate stability.

ترجمہ

(۱) کمتر شرائط پر مبنی تلافی معیشت کے ذریعہ توازن ادائیگی کے لیے مدد دینے کی استعداد میں توسیع کرنا۔

(۲) بین الاقوامی مالی نظام کی نگرانی کرنا اور ایسی استعداد کو یقینی بنانا تاکہ بڑے ممالک کے اندرون ملک معاشی پالیسیاں باہم غیر مطابق یا بقیہ بین الاقوامی برادری کے لیے نقصان دہ نہ ہوں۔

(۳) خصوصی حصول حق کی نئی صورتوں کو داکرنا۔

(۴) شرح تبادلہ کے مفاد میں برائے نام شرح تبادلہ کی امداد کے لیے استعداد کو بڑھانا۔

(6) Reformation of the United Nations.

یہ جامع بات ہے جس کے تحت درج ذیل تجاویز دی گئیں ہیں:

(۱) سلامتی کونسل کو دوسرے مرحلوں میں از سر نو تشکیل دی جائے۔

(الف) پہلے مرحلے میں پانچ اسٹینڈنگ ممبر مقرر کیے جائیں جو دوسرے مرحلے میں بھی برقرار رہیں۔ جن میں دو صنعتی ممالک سے اور ایک ایک افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ سے ہو۔ مزید ازیں سلامتی کونسل کے غیر مستقل ارکان کی تعداد ۱۰ سے ۱۳ کر دی جائے۔ اور فیصلہ کے لیے لازمی ووٹوں کی تعداد ۹ سے بڑھا کر ۱۳ کر دی جائے۔ ویٹو کو کلی طور پر ختم کرنے سے قبل اسے کم سے کم استعمال کرنے پر اتفاق کیا جائے۔

(ب) دوسرے مرحلے میں پورے سلامتی کونسل کی ۲۰۰۵ تک تشکیل نو کی جائے۔

(۲) جنرل اسمبلی کو برقرار رکھا جائے اور مزید قوی بنایا جائے۔

(۳) ٹرسٹی شپ کونسل کو نیا مینڈیٹ دیا جائے۔

(۴) ہر سال Forum of Civil Society کا انعقاد کیا جائے جس میں

Civil Society Organisations کو مدعو کیا جائے۔

(۵) پوری دنیا میں عورتوں کو Global Governance میں مرکزی

حیثیت دی جائے۔

(7) Strengthening the Rule of Law world-wide.

اس کے تحت ایک عالمی قانون بنایا جائے اور ساری دنیا کو اسی عالمی قانون کے ماتحت کر دیا جائے۔^۸

۱۹۹۵ کے وسط سے ہی ان سفارشات اور تجاویز پر عمل درآمد شروع ہو گیا ہے جو چند سالوں میں پایہ تکمیل کو پہنچ جائیں گی۔ لیکن ان تمام تجاویز کا کلیدی اور سب سے بنیادی حصہ نمبر ۶ کے ذیل میں سلامتی کونسل سے متعلق ہے۔ ظاہر ہے کہ اقوام متحدہ کی بالعموم اور سلامتی کونسل کی بالخصوص کوئی ایسی تشکیل نہیں ہو سکتی جو یہودیوں کے منصوبہ حکومت دجال کے خلاف جاتی ہے۔ اس لیے سلامتی کونسل کی موجودہ صورت حال میں جہاں پانچ مستقل ممبر ہیں اور ان کو وینو کے اختیارات ہونے کے باوجود اصل قوت امریکہ اور برطانیہ کو حاصل ہے کوئی تبدیلی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ یہ دجالی حکومت پوری طرح قائم نہیں ہو جاتی۔ اور اس کے قیام کے بعد کسی سلامتی کونسل کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے۔

یہی وہ حالات تھے جن میں یہودی قوت اور اس کے تحت امریکہ۔ برطانیہ۔ سلامتی کونسل۔ آئی ایم ایف۔ ورلڈ بینک انتظام میں ایک بحران آتا ہوا محسوس ہوا۔ یہودیوں کو اپنے اس انتظام کے تعلق سے جسے یہاں امریکہ۔ برطانیہ۔ سلامتی کونسل۔ آئی ایم ایف۔ ورلڈ بینک انتظام کہا گیا ہے یہ بات تقریباً پچیس سال قبل معلوم ہو چکی تھی کہ یہ انتظام دیگر قوموں کے لیے ناقابل برداشت ہو چکا ہے۔ تاہم وہ اسے کسی صورت اس وقت تک تھامے رکھنا چاہتے تھے جب تک انہیں کوئی امید سے بھر دوسرا راستہ میسر نہ آجائے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ دنیا کی موجودہ حالت میں اسے بہت دنوں تک قائم رکھنا مشکل ہو گا۔ تاہم دو باتیں انہیں بطور خاص پریشان کر رہی تھیں:

(۱) ہر طرح کے مظالم کے باوجود عالم اسلام کا شکست تسلیم کرنے اور ان سے فکری، علمی، ذہنی، جذباتی، ثقافتی ہم آہنگی سے انکار کر دینا اور اس کے برخلاف اپنے تشخص کو بچانے کا عزم مصمم رکھنا۔

(۲) جرمنی اور جاپان پر ہر طرح کے حربے آزمانے کے باوجود ان کا یہودیوں کے خلق

کردہ امریکہ۔ برطانیہ۔ سلامتی کونسل۔ آئی ایم ایف۔ ورلڈ بینک انتظام کا حصہ بننے سے انکار کر دینا اور اپنے ماضی کو نہ بھلانے پر اصرار کرنا۔

انہیں امید تھی کہ وہ:

(۱) عالم اسلام کو کچل دیں گے اور انہیں اپنا حاشیہ بردار بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ کم از کم مسلم حکمرانوں کے رویے سے انہیں اسی کا اندازہ ہو رہا تھا۔

(۲) انہیں اس بات کی بھی امید تھی کہ وہ بالآخر جرمنی اور جاپان کو — بطور خاص جنگ عظیم دوم کے بعد پیدا ہونے والی نسل یا کم از کم تیسری نسل کو جو ۱۹۶۰ء کی دہائی میں پیدا ہوئی ہے — رام کر لیں گے اور انہیں بھی اپنا حاشیہ بردار بنالیں گے۔

(۳) انہیں اس کی بھی پوری پوری امید تھی کہ وہ کسی مسلم طاقت کو جو ہری قوت ہرگز بننے نہیں دیں گے۔

یہودیوں کو کیا خبر تھی کہ ایک نئی راہ ڈھونڈھنے کی کوشش میں جب وہ سوویت یونین کی از سر نو تشکیل کرنے کے لیے اس فلک بوس عمارت کو زمین بوس کریں گے تو ایک نئی صورت حال پیدا ہو جائے گی۔ اور وہ نئی صورت حال تھی ڈاکٹر ہیلموٹ کول (Dr. Helmut Kohl) کی سربراہی میں ایک نئے یورپ کی تشکیل کا آغاز۔ چنانچہ ۱۹۸۹ء کے بعد یورپ میں اتحاد کی ایک نئی لہر چلی جو Maastricht ہوتے ہوئے اب Euro سے آگے چلی گئی ہے۔ یورپ میں اتحاد تاریخی طور پر یہودی۔ اینگلو سکسن انتظام کے لیے ہمیشہ بحران کا باعث ہوا ہے۔^۹

یہودی۔ اینگلو سکسن انتظام کی اس تشویش کو ٹیمو تھی گارٹن ایش (Timothy Garton Ash) نے اس طرح بیان کیا ہے:

"The trouble is that those designs for European Unification that were peaceful were not implemented, while those that were implemented were not peaceful. The reality of unification was either a temporary solidarity in response to an external invader or an attempt by one European State to establish continental hegemony by force of arms, from Napoleon to Hitler."^{۱۰}

ترجمہ:

”مشکل یہ ہے کہ یورپ کے اتحاد کے لیے ان منصوبوں پر جو پرامن تھے عمل نہیں کیا گیا۔ اور جن پر عمل کیا گیا وہ پرامن نہیں تھے۔ پولین سے لے ہٹلر تک، اتحاد کی حقیقت یا تو یہ رہی کہ وہ کسی خارجی حملے کے وقت ایک وقتی یکجہتی تھی یا یہ کہ وہ کسی ایک یورپی ملک کے ذریعہ طاقت کے استعمال سے ایک برا عظمی غلبہ کی کوشش تھی۔“

ہر چند کہ دوسری جنگ عظیم میں جاپان کے تمام کردار کی ذمہ داری اپنے اوپر لیتے ہوئے وہاں کے اس وقت کے بادشاہ اور موجودہ بادشاہ کے والد نے اپنی وہ حیثیت ختم کر دی تھی جسے تمام جاپانیوں کے مرجع اور الوہی نسل کی اولاد کی حیثیت حاصل تھی۔ لیکن بائیں ہمہ ابتدائی چند سالوں کو چھوڑ کر بطور خاص ۱۹۸۰ کے بعد ہر سال ۳ مئی کو جو کہ جاپان کے موجودہ امریکیوں کے ذریعہ بنائے گئے دستور کے نفاذ کا دن ہے وہاں کی حکومت رائے عامہ کا جائزہ لیتی ہے کہ کیا اب اس دستور کو از سر نو قوم کی امنگوں کے مطابق ڈھالا جاسکتا ہے بطور خاص اس کی دفعہ ۹ کو جس میں جاپان نے دائمی طور پر جنگ سے الگ رہنے کا عہد کیا ہے۔ دفعہ کے الفاظ ہیں: ۲

The Japanese people forever renounce war as a Sovereign right of the nation and the threat or the use of force as a means of settling international disputes."

ترجمہ:

”جاپانی عوام جنگ اور دھمکی یا طاقت کے استعمال سے جو بین الاقوامی نزاعات کے حل کرنے کے لیے ہوں — بحیثیت ریاست کے خود مختار انہ حق کے ہمیشہ کے لیے دست بردار ہوتے ہیں۔“

یہ دفعہ مزید کہتی ہے:

Land, sea and air forces, as well as other war potential, will never be maintained."

ترجمہ:

”بری، بحری اور فضائی قوت اور اسی طرح دیگر جنگی صلاحیت اب کبھی بھی برقرار نہیں رکھی جائے گی۔“

چنانچہ اس سال بھی یہ بات بڑی شد و مد سے زیر بحث آئی۔ جاپان کے موجودہ وزیراعظم اور ابھی ابھی فوت ہونے والے وزیراعظم دونوں اعتدال کے ساتھ ہی سہی مگر اسی خیال کے حامی نظر آتے ہیں۔ ان کا اعتدال اور اظہار میں احتیاط ممکن ہے ان کی عملیت (Pragmatism) کا نتیجہ ہو مگر وہ خوب سمجھتے ہیں کہ عوام کی رائے اصلاً ٹوکیو کے گورنر مسٹر شنتارو ایشی ہارا (Shintaro Ishihara) کے ساتھ ہے جن کا کہنا ہے کہ جاپان کو اس امر کی ساختہ دستور کو یکسر بدل دینا چاہئے۔

تیسری جانب عالم اسلام کے بہترے حکمرانوں کی سالوسی، خاموشی یا مجبوری کے ساتھ حاشیہ برداری کے باوجود پوری امت اور بطور خاص عامۃ المسلمین میں بڑھتے ہوئے دینی رجحان، شعور جاں سپاری اور مغرب سے نفرت نے یہودیوں کو مزید برا فروختہ اور انہیں مزید غیر انسانی طور پر کچلنے کی طرف مائل کر دیا ہے۔ یہودی قوت کی یہی حواس باختگی جو مختلف پردوں میں، مختلف بہانوں یا تدبیروں سے اور مختلف ہاتھوں کے ذریعہ تقریباً تمام ہی براعظموں میں مسلمانوں کے قتل عام، نسل کشی، در بدری، عصمت دری، بایکاٹ، اذیت دہی اور بے عزتی کی صورت میں ظاہر ہو رہی ہے۔ یہودی ان ساری تدبیروں کے باوجود امت کے عزم میں لچک کے آثار دور دور تک نہیں پار رہے ہیں۔

چوتھی جانب اپنے تمام حربوں، تدبیروں اور دھمکیوں کے باوجود وہ اس میں ناکام ہو گئے ہیں کہ کسی مسلم ملک کو جوہری طاقت ہرگز بننے نہ دیں گے۔ اس ناکامی نے انہیں یکایک ایک ایسے خطرے کے اندیشے میں مبتلا کر دیا ہے جس کا نتیجہ یہ بھی برآمد ہو سکتا ہے کہ بیسویں صدی میں کی گئی ان کی ساری کوششیں صفر ہو کر رہ جائیں۔ چنانچہ ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے ایک خطرناک فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ وہی فیصلہ ہے جس کی تعمیل کے پہلے مرحلے کے لیے صدر امریکہ نے جنوب ایشیا کا سفر کرنا ضروری سمجھا۔

لیکن جنوب ایشیا کا ہی سفر کیوں؟ اس کے دو اسباب نظر آتے ہیں۔

(۱) یہودیوں کا یہ احساس کہ ساری دنیا میں اسلامی بیداری کا مرکز فی الوقت جنوب ایشیا ہے۔

(۲) جنوبی ایشیا کی ایک قوم کے ایک موثر طبقے کا یہ باور کرادینا کہ وہ قوم اور یہودی۔

اینگاؤ سیکسن انتظام قدرتی حلیف ہیں۔ اور امریکہ کا اس پر شرح صدر ہو جانا۔^{۱۱}

ایک جانب امریکہ اور جاپان کے مابین اس پر اتفاق کے باوجود کہ دونوں اپنے اختلافات کو مزید ہوا نہیں دیں گے (مئی ۱۹۷۷ء) یہ بات یقینی ہو چکی ہے کہ اب ان دونوں کے اختلافات یعنی جنگ عظیم دوم کے بعد یہودی قوم کا قائم کردہ امریکہ۔ برطانیہ، سلامتی کونسل۔ آئی ایم ایف۔ ورلڈ بینک انتظام کی روشنی میں جاپان امریکہ تعلقات Point of No Return تک پہنچ گئے ہیں۔

دوسری جانب ۱۹۸۹ء سے جاری ہلٹ کول طوفان کو ہر چند کہ اس طرح روک دیا گیا ہے کہ خود ہلٹ کول کو صدارت سے الگ کر دیا گیا اور ان پر طرح طرح کے الزامات لگائے گئے لیکن ان سب کے باوجود یورپ میں ان کا لایا گیا اتحاد کا طوفان اب بھی پوری شدت سے آگے بڑھ رہا ہے جس کا نتیجہ اہل یورپ کا کوسوو آپریشن میں نائنو کا بے دلی سے ساتھ دینا اور کسی درجے میں امریکی۔ برطانوی فوجوں سے عدم تعاون کرنا ہے۔

باشندگان برصغیر کے لیے بالعموم اور باشندگان ہند کے لیے بالخصوص سن ۲۰۰۰ عیسوی کی شروعات بظاہر نہایت روشن اور امید افزاء اور باطن سخت تاریک اور بدترین معلوم ہوتی ہے۔ اگر صدر کلنٹن کے اس دورے کے مضمرات مخصوص رخ پر گئے اور اس کے عواقب اسی طرح سامنے آئے جو اس طرح کے قدرتی تحالف کا منطقی نتیجہ ہے تو یہ ایک ایسی ہولناک صورت ہوگی جس کی نظیر اس خطے کی تین ہزار سالہ تاریخ میں کوئی دوسری نہیں ملے گی۔

صدر امریکہ کلنٹن کا دورہ ظاہر ہے طرفین کے اتفاق کا نتیجہ ہوگا یعنی اس بات پر اتفاق کہ دونوں اپنی اپنی جگہ محسوس کرنے لگے کہ ان کے مخصوص مقاصد کی تکمیل اس تحالف میں ممکن ہے۔ اس صورت میں یہ بالکل جداگانہ بات ہے کہ دونوں کے مقاصد الگ الگ ہوں۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں کے مقاصد ایک ہی ہوں یا ایک ہی بات کے دو الگ الگ پہلو۔ ایسی صورت میں طر امین کا یہ تصوراتی اتفاق بلا روک ٹوک عملی اتفاق میں بدل جائے گا۔ اور بہت اہم امور میں گہرائی تک جاسکتا ہے۔

کلنٹن نے مارچ ۲۰۰۰ء میں بھارت کا دورہ کیا اور انہوں نے بھارتی جنتا پارٹی کی قیادت والی حکومت کے ساتھ بہت سے میدانوں میں متفقہ اقدامات کے لیے معاہدے اور مفاہمت کیے جن میں سب سے اہم بات امریکہ کی بعض شرائط کے ساتھ ہندوستان کی سلامتی کونسل کے مستقل رکنیت پر آمادگی ہے۔

اس کے معا بعد اپریل میں برطانوی وزیر خارجہ کلک کا دورہ ہند ہوا اور انہوں نے بھی انہیں شرائط کے ساتھ ہندوستان کی سلامتی کو نسل کی رکنیت کے استحقاق کی حمایت کی۔ اپریل کے وسط میں بھارت کے صدر کا دورہ فرانس اور اس کے معا بعد فرانس کے دو وفد کی بھارت آمد ہوئی۔ اس میں سب سے ابھری ہوئی بات بعض شرائط کے ساتھ سلامتی کو نسل کی مستقل رکنیت کے لیے بھارتی استحقاق کی فرانس کے ذریعہ حمایت ہے۔ بھارت جیسے ایشیائی ملک کا سلامتی کو نسل کا مستقل رکن بنانا اہل ایشیا کے لیے خوشی اور اطمینان کی بات ہے لیکن کل تک مغرب کا بھارت کو رکنیت سے محروم رکھنا اور آج حمایت کرنا تشویش کا باعث ہیں۔ تشویش کی بات یہ ہے کہ کہیں عالمی استعماری قوتیں بھارت کی موجودہ حکومت کے مخصوص رجحانات کا اپنے استعماری مقاصد کے لیے استحصال کرنا تو نہیں چاہتیں۔ اگر ایسا ہے تو لازماً اس کا نقصان صرف اور صرف بھارت کو ہوگا۔ تشویش کی دوسری بات یہ ہے کہ عالمی سطح پر یہ اتفاق اور تحالف ایک ایسے وقت میں ہو رہا ہے جب بھارت کی اندرونی صورت حال بعض پہلوؤں سے اتنی سنگین ہو چکی ہے کہ جس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ شاید ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء میں بھی صورت حال اتنی سنگین نہیں تھی۔ بابرہی مسجد کا انہدام، ناڈا میں ہزاروں مسلمانوں کی گرفتاری اور مہینوں بلکہ سالوں، دستور کی موجودگی میں بااقتدار قید و بند اور اذیت، قانون اور حکومت کے بعض بے قابو حلقوں کا فاشٹ عناصر کی کھلی حمایت اور ان کے لیے قانونی چھتری کی فراہمی، پورے ملک میں مسلمانوں کو برسر زمین خوفزدہ کرنا، مسلم معیشت کے خلاف درپردہ اور علانیہ عملی اقدامات، دستور کی ترمیم کی کارروائی کا آغاز، مذہبی تعمیرات بل کے ذریعہ ہر طرح کے مذہبی، ثقافتی اور تہذیبی اداروں، سرگرمیوں اور تشخصات کا خاتمہ کرنے کی کوشش، مخصوص علاقوں اور زمینوں سے مسلمانوں کی جبری بیدخلی، تمام دینی، ثقافتی اور تہذیبی سرگرمیوں کو غیر ذمہ دارانہ طور پر دہشت گردی قرار دینا، تمام دینی، ثقافتی اور تہذیبی مقامات کو دہشت گردی کے اذی قرار دینا، مسلمانوں کا انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ سے اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے دستوری چارہ جوئی کے حق کا صرف کاغذ پر باقی رہ جانا، پولس اور پیرا پولس فورسز کے معتد بہ حصہ کو فاشی جذبات سے بھر دیا جانا اور فوج کے بعض طبقات کا اس سے اچھوتا نہ رہنا، بیوروکریسی کے بہت بڑے طبقے کا انہیں سرگرمیوں میں متحرک ہو جانا ایک ایسی صورت حال کو جنم دے رہا ہے جس کے عواقب کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

اس مخصوص صورت حال میں مشہور ماہر حکمت عملی اور قومی سلامتی کو نسل کے رکن کے سبر منیم (K. Subrahmanyam) کا یہ اظہار خیال کہ۔

"Containing International terrorism, religious extremism and narcotics traffic constitute a major area of agreement" (between India & the United States).^{۱۲}

ترجمہ:

"بین الاقوامی دہشت گردی، مذہبی انتہا پسندی اور منشیات کے لین دین کو قابو

میں لانا اتفاق کے بڑے حصے کے بطور ہے (جو بھارت اور امریکہ کے مابین ہے)

بہت معنی خیز ہے۔

ہر چند کہ یہ بات بے حد حیرانی کی ہے کہ ہندوستان کے سب سے بڑے فکری گروہ (Ideological Group) آر ایس ایس کی ہندوستان کے تعلق سے عالمی پالیسی امریکہ کی عالمی پالیسی کے بالکل علی الر غم اور اس سے متصادم ہے۔ آر ایس ایس ایک نظریاتی گروہ ہے اور سبر منیم کی تلقین خالصتاً ابن الوقتی اور موقع پرستی کے اصول پر قائم ہے۔ ہر چند کہ سبر منیم نے اپنے فلسفے کو عملیت (Pragmatism) کا لبادہ اوڑھایا ہے لیکن وہ اپنی اس عملیت کی پیش کش میں یہ بتانے سے قاصر رہے کہ اگر ایک بار بھارت اس عملیت کا سہارا لے کر اپنی ریاستی اصولیت سے ہٹ جائے اور کچھ دنوں کے بعد اسے یہ اندازہ ہو کہ امریکہ بھارت اور اپنے مفادات کے توازن کے ساتھ تکمیل سے زیادہ صرف اپنے مفادات کی تکمیل چاہتا ہے اور اسے بھارتی مفادات سے کوئی خاص غرض نہیں تو پھر بھارت اس صورت حال سے اپنے کو کیونکر نکال پائے گا اور اس کی عملیت کیا ہوگی۔ اور یہ خطرہ اس صورت میں اور بھی عیاں ہوتا نظر آتا ہے کہ وہ خود یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ صرف اس کا مسئلہ نہیں جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے:

The US is interested in the Indian markets just as every country is interested in every country's markets. India should explore the possibilities of the US markets for Indian Software and skills."

ترجمہ:

"امریکہ بھارت کے بازار میں دلچسپی رکھتا ہے ٹھیک اسی طرح جیسے ہر ملک

کسی دوسرے ملک کے بازار میں دلچسپی رکھتا ہے۔ بھارت کو چاہئے کہ وہ امریکہ کے بازار میں بھارتی سوفٹ ویئر اور ہنرمندی کے امکانات کے دروازے وا کرے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں:

There can be no doubt on the basic assumption that the US would like to perpetuate its position as the sole superpower in the world, to give its citizens the highest per capita income and to be the dominant decision-maker in all major strategic, economic, technological and environmental global decisions."

ترجمہ:

"اس بنیادی مفروضے میں کوئی شک نہیں کہ امریکہ دنیا میں اپنے سپر پاور کے مقام کو دہائی بنائے رکھنا، اپنے شہریوں کو سب سے زیادہ فی کس آمدنی دینا اور تمام بڑے تدبیری، معاشی، تکنیکی اور عالمی ماحولیاتی فیصلوں میں غالب فیصلہ کن کی حیثیت میں رہنا چاہتا ہے۔"

ظاہر ہے کہ اس صورت میں بھارت کا اس غار میں داخل ہونا جتنا خوشنما اور آسان ہوگا اختلاف کی صورت میں اس غار سے نکلنا اتنا ہی بھیاںک اور مشکل۔

لیکن اب جب کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بھارتی جنتا پارٹی کی حکومت نے اس سمت جانے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو سبرامنیم کی الفاظ میں بھارت اور امریکہ کے متفقہ مقاصد اس خطے میں اقلیتوں کے لیے بے حد تشویشناک ثابت ہوں گے۔ حالات کے اس رخ پر چلے جانے کے بعد وزیر داخلہ ایڈوائی کا بیان مزید تشویشناک مضمرات کا حامل سمجھا جاسکتا ہے کہ اب بھارت پر بیرونی خطرے اور اس کے اندرونی خطروں میں فرق باقی نہیں رہ گیا ہے۔

اب ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ یہ خطہ ایک ہزار سال کے اجتماعی امن کے بعد پھر قتل عام اور بڑے پیمانے پر عوامی بید خلی (Mass Exodus) کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ جس کا تلخ تجربہ بھارت کی تاریخ نے بطور خاص دوسری صدی عیسوی اور نویں صدی عیسوی کے مابین کیا تھا۔

لیکن اس سے قبل یہ دیکھنا ضروری ہے کہ امریکہ اور برطانیہ کی اس خطے کے تعلق سے

پالیسی میں اچانک تبدیلی اور ان کی جانب سے بھارت کے انتخاب کا اصل سبب کیا ہے؟
کہیں ایسا تو نہیں کہ:

(۱) یہودی قوت یہ محسوس کر چکی ہے کہ اب اس کی اور عالم اسلام کی کشمکش ناگزیر ہو کر عالمی جنگ کی صورت اختیار کرنے جا رہی ہے۔

(۲) یا یہ ہے کہ وہ اب اس کا فیصلہ کر چکے ہیں کہ عالم اسلام کو کچل دینے میں مزید تاخیر ان کے عالمی منصوبے کو ہی درہم برہم کر کے رکھ دے گی لہذا ایسا اقدام ناگزیر ہو گیا ہے۔ لیکن وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ایسا قدم ایک عالمی جنگ پر منتج ہوگا۔

(۳) یا یہ ہے کہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ مسجد اقصیٰ کو ڈھانے اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر نو اور پورے جزیرۃ العرب پر قبضہ کر لینے کو مزید ٹالنا خطرناک ہو گا لہذا اس آپریشن کے کرنے کا وقت گزر رہا ہے ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ایسا آپریشن ایک عالمی جنگ پر منتج ہوگا۔
(۴) کیا وہ اس نتیجے تک پہنچ گئے ہیں کہ ایک عالمی جنگ کی صورت میں جرمنی اور جاپان نہ صرف یہ کہ ان کا ساتھ نہیں دیں گے بلکہ ممکن ہے کہ مخالفانہ رول ادا کریں۔ اور اس صورت میں سلامتی کو نسل میں ان کی رکنیت ہولناک نتائج پیدا کرے گی؟

(۵) کیا وہ اس نتیجے تک پہنچ گئے ہیں کہ جنگ عظیم دوم کے بعد انہوں نے جرمنی اور جاپان کے عزت نفس کو جس طرح پامال کیا ہے اس کے سبب کسی بحرانی صورت میں ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا ہے؟

(۶) کیا اس کا سبب عالم اسلام سے ہونے والی عالمی جنگ کی مخصوص حکمت عملی ہے؟ یہ بات واضح ہے کہ کسی ایسی آئندہ جنگ کی تین خصوصیات ہوں گی۔ (۱) ایک جانب سے اعلیٰ فنی جنگی مشنری کی حرکت High-tech war machinery mobilisation اور دوسری جانب سے ادنیٰ اور متوسط جنگی مشنری کی حرکت (Low and medium tech-war) Machinery mobilisation (۲) بے حد و حساب خام مال کی کھپت (High Consumption of Raw Material) (۳) غیر معمولی اور بے شمار انسانی جانوں کا تلف ہونا (War of Over-kill)۔ ظاہر ہے اس صورت حال میں کئی باتیں قابل ذکر ہوں گی:

(۱) یہودیوں کا موت سے بے حد ڈر ناجب کہ ایک عام اندازہ کے مطابق ایک ایسی عالمی

جنگ کے چھڑنے کی صورت میں اب ۳۰ سے ۵۰ کروڑ لوگوں کے مرنے یا زخمی ہونے کا اندیشہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ۵۰ کروڑ کے کئی زیاں میں اگر یہودیوں اور مسلمانوں کی اموات کا تناسب ۱:۱۰۰ بھی ہو جب بھی یہودیت ۵۰ لاکھ اموات کو برداشت نہیں کر سکے گی۔

(۲) اس صورت میں اس کے لیے جرمنی اور جاپان بے کار ہیں۔ وہ ان کے لیے اتنے جانوں کی قربانی دینے کی صلاحیت سے قاصر ہیں۔

(۳) یورپ کا کوئی ملک شاید اب کسی ایسی جنگ کے لیے تیار نہ ہو۔ مثلاً: روس اور مشرقی یورپ کے ممالک۔

(۴) جنگ عظیم اول اور دوم کے سابقہ رکارڈ کی بنیاد پر وہ یہ قیاس کرنے میں حق بجانب ہیں کہ بھارت ان کے لیے اتنے جانوں کی قربانی دے سکتا ہے۔ خود اس ملک کی اندرونی صورت حال میں ایک طبقے کے لیے یہ تاریخی حکمت عملی دور رس نتائج کی حامل ہو سکتی ہے۔

(۵) انسانی وسائل کے ساتھ ساتھ کسی ایسی جنگ میں خام مال اور اب اس Globalised دنیا میں Industrial Base بھی ناگزیر ہیں۔ جرمنی تو خیر کسی حد تک ورنہ جاپان تو خام مال کے تناظر میں بالکل بے کار ہے۔ بھارت ہر دو اعتبار سے مالا مال ہے۔

(۶) جرمنی اور جاپان دونوں یہودیوں کے علاقہ دشمنی کی باہری سرحدوں پر واقع ہیں اور کسی ایسی جنگ میں ان کا تعاون مؤثر نہیں ہوگا۔ اس کے برخلاف یہودیوں کے نقطہ نظر سے بھارت باہری سرحدوں (Peripheral) پر ہونے کی بجائے عالم اسلام کے وسط میں واقع ہے جو ہر اعتبار سے Mobility اور اسٹرائٹک کے لیے موزوں ہے۔ یہودیوں اور امریکہ کو اس سے چنداں غرض نہیں کہ اس صورت میں بھارت کو کتنے نقصانات کا سامنا ہوگا اس لیے کہ صرف اپنے مفادات کو سامنے رکھنا ان کی تاریخ رہی ہے۔

(۷) کسی ایسی متوقع جنگ میں بیلٹک میزائلوں کا رول سب سے زیادہ ہوگا۔ ایسی صورت میں بین براعظمی بیلٹک میزائل کا رول بہت کم نظر آتا ہے۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ ان کے وار ہیڈس جوہری ہوں۔ اور روایتی وار ہیڈس کے ساتھ بین براعظمی میزائلوں کے استعمال کی کوئی گنجائش نہیں۔ نہ مالی اعتبار سے اور نہ جنگی اعتبار سے۔ لہذا اس بات کے زیادہ امکانات ہیں کہ درمیانے اور چھوٹے درجے کے بیلٹک میزائل ہی زیادہ تر استعمال کیے

جائیں۔ اس صورت میں واقعی علاقہ جنگ (Real War Theatre) کا معاملہ یہودیوں کے لیے سنگین ہو گا خاص طور پر اس لیے کہ ان کے دماغوں میں پہلی اور دوسری جنگ عظیم کی یاد ابھی محو نہیں ہوئی ہے۔ چنانچہ اسی تناظر میں بھی بھارت ان کے لیے نہایت موزوں علاقہ ہے۔ جہاں وہ اپنے مفادات کی جنگ بھارتی سر زمین پر لڑنا چاہتے ہیں۔

ایسی صورت میں اگر یہودیوں کو بھارت کی آمدگی بھی مل جائے تو یہ ہر صورت سے جرمنی اور جاپان کے مقابلہ میں زیادہ مفید ہوگی۔

کیا مسٹر کلنٹن کا دورہ دراصل اس سلسلے کا آغاز ہے جس کا منطقی نتیجہ غزوہ ہند ہو سکتا ہے؟ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنگ ظہور دجال سے معا قبل کسی نزدیکی عہد میں ہوگی۔ یہ جنگ بے حد خوں آشام ہوگی، جس میں جان اور اسباب کا بے حد زیاں ہوگا۔ جس کی شرذعات مقامی اہل ایمان پر غیر انسانی مظالم، ان کی بے بسی اور ان کی داورسی کے حوالے سے ہوگی۔ (ان امور پر تفصیلی بحث ان شاء اللہ آگے آئے گی) عین ممکن ہے کہ حالات کے وقوع پذیر ہونے کا وہ آخری سلسلہ جس کی آخری کڑی ظہور دجال اور پھر قتل دجال ہے اس کا آغاز غزوہ ہند سے ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا سبب ہو جنوب ایشیا میں مسلمانوں کا قتل عام اور ان کا کلی صفایا کر دینے کے اقدامات جس کے آثار بد قسمتی سے پوری طرح نمایاں ہوتے جا رہے ہیں۔

امریکہ اور برطانیہ کے اس فیصلے کے تناظر میں ان کے مقاصد کو اس طرح ملخص کیا جاسکتا ہے:

(۱) جنوب ایشیا میں مسلمانوں کو نہتہ کرنا (Disarmament of Muslims in South Asia)

(۲) یہودیوں کے نقطہ نظر سے جنوب ایشیا میں نام نہاد اسلامی لہر کو روکنے کے لیے اسلامی سرگرمیوں، تشخصات اور ثقافت کا خاتمہ کرنا — اس صورت میں اس ایجنڈے کی طرف پیش رفت جس کے تحت

(۱) پورے جنوبی ایشیا کو اسلامی جذبات اور عواطف سے پاک کرنا اور

(۲) بھارت میں مسلمانوں کو بہر صورت de-Islamise کرنا یا انہیں

Liquidation کی حد تک Marginalise کر دینا گزیر ہے۔

اگر حکمت عملی کی بنا ہی ہے اور ایسا نہیں لگتا کہ اس کے سوا کوئی اور بات یہودیوں کو منظور ہوگی۔ تو اس صورت حال میں یہ وہ انقلابی تبدیلی ہے جو لازماً تاریخی رخ اختیار کرے گی اور پھر صورت حال ہر ایک کے قابو سے باہر ہو جائے گی۔

چنانچہ پہلا سوال جو سبب بنا اس تجزیہ کا وہ یہ ہے:
کیا نژاد ہند کے وقوع پذیر ہونے کے سلسلے کا آغاز ہو گیا ہے؟^{۱۳}

دوسرا سبب: عیسائی یہودیت کے تخریبی عزائم

اس تجزیے کا دوسرا سبب ہے ۱۹۹۹ء کے اوائل میں ڈینور کولوریڈو دسپنسینلسٹ (Denver Colorado Dispensationalist) لوگوں کے ایک گروپ کی جسے Concerned Christians کہا جاتا ہے اسرائیل آمد اور مسجد اقصیٰ کو بم سے اڑانے کی کوشش کرتے ہوئے ان کی گرفتاری اور ان کا امریکہ واپس بھیجا جانا۔ یہ گروہ امریکہ اور دیگر پروٹسٹنٹ عیسائی دنیا میں پھیلے ہوئے ان سینکڑوں گروہوں میں سے ایک ہے جو Dispensationalists یا Fundamentalists کہلاتے ہیں۔ عیسائیت میں یہودی سازش کے نتیجے میں رونما ہونے والی تفریق کی سب سے بڑی پیداوار پروٹسٹنٹ عیسائی ہیں جو رومن کیتھولک سے الگ ہو کر اب خود سینکڑوں فرقوں میں بٹ چکے ہیں۔ یہ تفریق دراصل یہودیوں کی کاشتہ و پرداختہ تھی اس لیے یہودیت سے قربت اور ان کے عمل کی حیثیت سے کارگزاری ان میں سے ہر فرقے کا خاصہ اور مقصد وجود ہے۔^{۱۴} ہر چند کہ ان کا ظاہری تشخص عیسائیت کا ہے لیکن یہ عیسائی سے زیادہ یہودی ہیں اور زیادہ بہتر طور پر کہا جائے تو یہودی عیسائی یا عیسائی یہودی ہیں۔

موجودہ عہد میں پروٹسٹنٹ اور بطور خاص امریکہ میں رہنے والے پروٹسٹنٹ بنیادی طور پر دو ظاہری تشخص میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں پہلا — لیبرل پروٹسٹنٹ (Liberal Protestant) ہیں اور دوسرا کنزرویٹیو پروٹسٹنٹ (Conservative Protestant) اور ظاہر ہے پہلا گروہ نہایت قلیل ہے۔ یوں تو ہر پروٹسٹنٹ وہی عقاید اور جذبات رکھتا ہے جو اسرائیل، بنو اسرائیل اور یہودیت سے قریب تر ہیں لیکن کنزرویٹیو بطور خاص اس تعلق سے زیادہ

شدید احساسات رکھتے ہیں۔

انقلاب فرانس سے قبل تقریباً ۱۷۰۰ سالوں بعد روئے زمین پر پہلی یہودی حکومت بحر اٹلانٹک کے، اس پار امریکہ میں قائم کی گئی جو آج حکومت ریاست ہائے متحدہ امریکہ (United States of America-USA) کہلاتی ہے۔ چونکہ یہ ایک یہودی حکومت تھی اور امریکہ کا قیام یہودیوں کے مقصد اصلی سے پہلے کی ایک منزل تھی اس لیے اسے نیا بابل (New Babylon) کے نام سے پکارا گیا۔^۱ امریکہ کے قیام کا مقصد اصلی اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ روئے ارض سے خلافت اسلامیہ کا خاتمہ کر دیا جائے۔ چنانچہ خلافت عثمانیہ کا خاتمہ اور فلسطین پر قبضہ کر کے مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کو ڈھا کر ہیکل سلیمانی کی تعمیر کرنا اور عظیم اسرائیل سلطنت قائم کرنا امریکہ کا مقصد وجود ہے۔

اس لیے بالکل ابتداء سے اب تک ریاستہائے متحدہ امریکہ میں حکومت اور اس کے ہر نظام کی بنیادی ساخت یہودی فریمسین پروٹسٹنٹ رہی ہے جسے کسی دوسرے تناظر میں WASP White-Anglo-Saxon-Protestant بھی کہتے ہیں جو پوری طرح اس کی حقیقت کو ظاہر نہیں کرتا۔

امریکہ کا پہلا صدر اور اس کا بانی مبنی جارج واشنگٹن نہ صرف یہ کہ ایک کٹر فریمسن تھا بلکہ اس کے بڑے روحانیین میں اس کا شمار ہوتا تھا۔^۲

امریکہ کا دستور اور اس کی حکومت، اس کی فوج کی تشکیل، اصول اور مقاصد فریمسن مقاصد کی تکمیل کے سوا کچھ نہیں۔ ہر چند کہ یہاں اس موضوع پر تفصیل سے لکھنے کی گنجائش نہیں تاہم چند ضروری اور اہم امور درج کیے جاتے ہیں۔

(۱) ریاستہائے متحدہ امریکہ قیام اسرائیل اور باضابطہ قیام حکومت دجال سے قبل کی ایک عبوری حکومت ہے۔ اس لیے "City on the Hill" یعنی Capitol Hill دراصل علامت ہے Mt Zion کی۔

(۲) چونکہ امریکہ عیسائی ریاست نہیں بلکہ ایک یہودی ریاست ہے یہی سبب ہے کہ امریکہ کا سب سے بڑا سرکاری تہوار کرسمس نہیں بلکہ "Thanksgiving" ہے جو دراصل Jewish Festival of Harvest of Succoth کا دوسرا نام ہے۔

(۳) چونکہ ریاستہائے متحدہ امریکہ یہودی ریاست ہونے کے ساتھ ساتھ فریمسن توجیہ کی حامل یہودی ریاست بھی ہے یہی سبب ہے کہ دستور امریکہ میں the Declaration of Human Rights دراصل ایک خالص فریمسن ایجنڈہ ہے۔

(۴) ریاستہائے متحدہ امریکہ کی سرکاری مہر اور نشان the Great Seal of the United States مشہور فریمسن مہر اور نشان ہے۔

(۵) چونکہ امریکہ محض ایک سیاسی وجود کا نام نہیں بلکہ یہودی روحانی سفر کی ایک منزل ہے اس لیے اس کا تقدس پوری طرح اور ہر جگہ ملحوظ رکھا گیا ہے۔ واضح ہو کہ White House فریمسن اور یہودی روحانیین کی اس مقدس آبادی کو کہتے ہیں جو بیکل سلیمانی سے باہر دنیا میں کسی جگہ ہو سکتی ہے۔ یہ وہی جگہ ہے جسے یہودی روحانیین کی تاریخ میں Casa blanca بھی کہتے ہیں۔

(۶) افواج امریکہ کے صدر دفتر اور سپریم کمانڈ ہیڈ کوارٹرز کو Pentagon کہتے ہیں۔ یہ دراصل فریمسنوں کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام کی مہرباں ڈھال کا نام ہے۔ چنانچہ دنیا میں پائے جانے والے فریمسنوں کے دو احزاب اس علامت کا اظہار دو طرح سے کرتے ہیں۔ ان میں ایک Pentalpha اور دوسرا Hexalpha ہے۔ Pentagon یعنی پنج گوشہ دراصل اسی کا اظہار ہے۔ چنانچہ امریکہ کا فوجی ہیڈ کوارٹرز Pentagon دراصل دجال کے ظہور سے قبل ابلیس کی یہودی فوج کا عالمی صدر دفتر ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی بے محل نہ ہوگی کہ حکومت امریکہ دنیا کی پہلی فریمسن حکومت نہیں ہے۔ اپنے قیام کی ترتیب کے اعتبار سے وہ دوسری حکومت ہے اور رتبہ اور وقار کے اعتبار سے، بھی دوسری حکومت ہے۔ چنانچہ روئے زمین پر پہلی باضابطہ فریمسن حکومت اور دراصل اس وقت روئے ارض پر قائم تمام فریمسن حکومتوں میں سب کی ماں اور بزرگ ترین حکومت دراصل حکومت برطانیہ ہے۔ اور اس کی روحانیت کی علامت اس کی موجودہ بادشاہت ہے۔ یہ حکومت ۱۶۸۸ میں قائم ہوئی۔ اور وہاں کی بادشاہت نے فریمسن کی روحانی امامت کا مقام اٹھارہویں صدی کے بالکل اوائل میں حاصل کر لیا جواب تک چلا آتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ امریکہ کی حکومت اور وہاں کے فریمسن روحانیین دراصل حکومت برطانیہ اور یہاں کے روحانیین

کے تابع فرمان ہیں۔ اس طرح فریمسن کی دوسری باضابطہ حکومت ریاستہائے متحدہ امریکہ ہے جو ۱۷۷۶ء میں قائم ہوئی۔ فریمسن کی تیسری باضابطہ حکومت حکومتِ فرانس ہے۔ جو ۱۷۸۹ء میں قائم ہوئی۔ اس طرح رتبہ کے اعتبار سے اس کی حیثیت تیسری ہے۔ چنانچہ اس وقت فریمسن حکومتوں کی روحانی اور اقتدار اعلیٰ کی ترتیب حسب ذیل ہے۔

ڈگری 30 32 33 (1)



اعلیٰ ترین ذمہ دار حکومت اسرائیل



اعلیٰ ترین ذمہ دار حکومت برطانیہ



اعلیٰ ترین ذمہ دار حکومت امریکہ



اعلیٰ ترین ذمہ دار حکومت فرانس

یہاں ایک بات ایسی ہے جس کا ذکر کیا جانا بے حد ضروری ہے اور وہ بات ہے گزشتہ دو صدیوں میں عالم اسلام میں ہونے والی سازشوں سے مسلم قائدین، علماء، دانشوران اور عوام الناس کی مجرمانہ حد تک بے خبری۔ کسی قوم کی قیادت کے لیے خواہ وہ قیادت دینی علوم سے متصف لوگوں کی ہو یا عصری علوم سے متصف لوگوں کی اس سے بڑی ناکامی، نااہلی اور بے پروائی اور کیا ہو سکتی ہے کہ پورے دو سو سالوں سے ان کے مابین رہ کر اسلام اور ملت اسلامیہ کے دشمن علانیہ طور پر پوری ملت اسلامیہ کو ذبح کر دیئے کی سازش اور تیاریاں کرتے رہے اور وہ اس سے بے خبر رہے۔ کوئی آنکھ دیکھ نہ سکی۔ کوئی کان سن نہ سکا کوئی دماغ سمجھ نہ سکا۔ کوئی دل بے قراری محسوس نہ کر سکا۔ آخر کیوں؟ قیادت و سیادت کے استحقاق کے دعوئے، ولایت و نیابت رسول اللہ ﷺ کی اجارہ داری کے اعلانات اورینظر بنور اللہ کے زمزموں کی کیا یہی حقیقت ہے؟ یہ عاجز پورے وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی ہر استعماری کوشش خواہ وہ برطانیہ کی ہو یا فرانس کی، ہالینڈ کی ہو یا بلجیئم کی وہ باضابطہ اور منظم طور پر فریمسن کوششیں تھیں۔ بلکہ تاریخ کا گہرا مطالعہ بتاتا ہے کہ ۱۷۸۰ء سے لے کر ۱۸۲۱ء تک ہونے والی برطانیہ اور فرانس کے مابین ہر کشمکش کا

صرف ایک ہی عنوان تھا اور وہ یہ تھا کہ عالمی فریمسن کے اس اعلیٰ ترین 'ELDER' پر کون باور کرادے کہ فریمسن کے مقاصد کو وہی کسی سے زیادہ احسن طریقے سے پورا کر سکتا ہے لہذا وہی اس کا مستحق ہے کہ 'ELDER' اسے اپنا نائب یا خادم خاص بنالے۔ رقابت کی اس لڑائی میں بالآخر فرانس ہار گیا اور برطانیہ نے اپنی اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کر کے نیابت کا مقام حاصل کر لیا۔ جس کی قیمت نیولین کو سینٹ ہیلینا میں قید کی صورت میں ادا کرنی پڑی۔ بہر حال فرانس کا درجہ اس صدر نشین نے دوسرا رکھا جواب تیسرا ہے۔

چنانچہ ان تمام قوتوں — برطانیہ، فرانس، ہالینڈیا بلجیم — کا مقصد اذلیں وہ عالمی فضا تیار کرنا تھا جس کی خواہش مند فریمسن تحریک تھی۔ ان میں سب سے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ سلطنت برطانیہ نے کیا۔ جس کا ہر سربراہ اور بطور خاص مرد سربراہ ہمیشہ فریمسن تحریک کا سرگرم رکن ہی نہیں بلکہ عظیم سلطنت برطانیہ کے حدود میں بلا فصل روحانی اور انتظامی سربراہ چلا آتا ہے۔ حکومت برطانیہ سے الگ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سارے اعلیٰ عہدے دار عام طور پر فریمسن تھے۔ بعض گورنر جنرل اور وائسرائے ہندوستان فریمسن تحریک کے روحانی اور انتظامی پیشوا بھی رہے ہیں۔

لیکن ان باتوں سے الگ ہٹ کر گزشتہ صدیوں کے دوران استعماری علاقوں میں چار ایسے شعبے ہیں جہاں فریمسن تحریک نے باضابطہ تنظیم اور کاڈر (Cadre) بنائے۔ دراصل یہ وہی شعبے ہیں جن کو بعد میں عالمی تحریک فریمسن سے جوڑ دیا گیا۔ واضح ہو کہ یہ تنظیم اور کاڈر ان خاص الخواص کاڈر سے الگ ہیں جن میں مسلم نوابان اور راجگان شامل تھے چنانچہ وہ تنظیم اور کاڈر درج ذیل ہیں:

(۱) تعلیم

(۲) سول سروس

(۳) فوج

(۴) عدلیہ

چنانچہ یہ کاڈر ان تمام مسلم ملکوں میں قائم کیا گیا جہاں درج ذیل میں سے کوئی بھی صورت پائی جاتی تھی۔

(۱) وہ مسلم علاقے جو براہ راست مغربی استعمار کا حصہ ہوں مثلاً برٹش انڈیا بیسویں صدی میں مصر اور سوڈان

(۱') وہ مسلم علاقے جو بالواسطہ مغربی استعمار کا حصہ ہوں مثلاً رام پور کی ریاست یا سلطنت آصفیہ

(۲) وہ مسلم علاقے جو غیر سرکاری طور پر مغربی استعمار کا حصہ ہوں مثلاً ۱۹۲۳ء کے بعد عراق، ٹرانس جاردن اور شام۔

(۳) وہ مسلم علاقے جو غیر سرکاری طور پر مغربی استعمار کے اثرات میں ہوں مثلاً: ایران، افغانستان

(۱) تعلیم: تعلیم کے تمام بڑے مراکز Utrecht, Sorbonne, Cambridge, Oxford کبھی فریمسن کے مراکز تھے اور ہیں۔ ان تعلیم گاہوں میں جانے والا ہر مسلم اتنا خوش قسمت نہیں تھا جو اس شعر کا مصداق بنتا۔

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوہ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

مثلاً اس عظیم الشان کبرج یونیورسٹی Cambridge University کی حقیقت صرف ایک عنوان میں مضمر ہے اور وہ ہے 'The Cambridge Apostles' — اور اگر کسی کے پاس وہ چشم بصیرت ہو تو وہ آج بھی اس کا مشاہدہ کر سکتا ہے کہ کبرج کے یہ Apostles کون کون تھے؟ کیا کیا تھے؟ کیا کیا بنے؟ اور کیا کیا کیا؟ اگر صرف اس فہرست کو ہی ملاحظہ کر لیا جائے جو رچرڈ ڈیکن Richard Deacon نے اپنی کتاب:

The Cambridge Apostles: A History of
Cambridge University's elite Intellectual Secret
Society, Robert Royce Limited, London 1985.

کے آخر میں دی ہے۔ تو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ یہ Apostles کس مقصد کے لیے یکجا ہوئے تھے اور اس لبادے میں کون چھپا تھا۔

بشتے از خردارے اس فہرست سے صرف چند نام پیش کیے جاتے ہیں تاکہ اس سلسلے کی باقی کڑیاں جوڑی جاسکیں۔

Balfour, Arthur J. (1st. Earl) (۱)

Balfour, Francis Maitland, (۲)

Balfour, Gerald William (2nd Earl) (۳)

لطف کی بات یہ ہے کہ مصنف کتاب A.J. Balfour پر درج ذیل حاشیہ تحریر کرتا ہے:

"A. J. Balfour is an unconfirmed member, but because of the evidence for and against, it seems fitting that his name should be recorded."

ترجمہ: اے، سبے، بیلفور ایک غیر موثق رکن ہیں — لیکن ان شواہد کی بنیاد پر جو اس تعلق سے اثبات اور نفی میں پائے گئے ہیں یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نام رکن کے بطور درج کیا جائے۔

واضح ہو کہ یہ وہی بیلفور ہیں جو اسرائیل کے قیام کے پہلے خطہ تیار کرنے والے اور حکومت برطانیہ کے وزیر خارجہ کی حیثیت سے Balfour Declaration (۱۹۱۷) کے خالق تھے۔

ہر چند کہ پوری فہرست ایک نگار خانہ عالم ہے۔ تاہم صرف چند نام اور بیان کر دیئے جائیں تاکہ اس کی دوسری کڑیاں بھی مل جائیں:

Theodore Beck (۱)

Strachey, (Sir) Arthur (۲)

Strachey, Lytton (۳)

Strachey, J. Beaumont (۴)

واضح ہو کہ ان میں تھیوڈور بیک علی گڑھ اور نیشنل کالج کے دوسرے اور پہلے باضابطہ پرنسپل بنائے گئے۔ سر آر تھر اسٹریچی — جان اسٹریچی کے بیٹے اور الہ آباد ہائی کورٹ میں وکیل تھے بعدہ بمبئی ہائی کورٹ میں جج اور الہ آباد کے چیف جسٹس (۱۸۹۹ء) ہو گئے تھے۔ ۱۹۰۱ء میں شملہ میں انتقال کیا۔ جان اسٹریچی ۱۸۷۴ء میں صوبہ صرحہ کے لیفٹنٹ گورنر تھے۔ اب ذرا ایک اقتباس ایک یہودی مصنف David Lelyveld کی کتاب

Aligarh's First Generation: Muslim Solidarity in British India, Princeton University Press. 1978

سے ملاحظہ فرمائیں:

"The recruitment of young professors from Oxford and Cambridge was consistent with the basic decisions that Sayyid Ahmad had made during his stay in England. Once again the mediating role was played by Sayyid Mahmud, who returned to Cambridge on a visit in 1883 with the intention of finding a successor to Siddons. The man selected, Theodore Beck, was presented to Sayyid Mahmud at Trinity College by John Strachey's son, Arthur Beck had grown up in London Beck took his Tripos examinations in mathematics, and was also elected to the elite **secret society** called the 'Apostles'."

ترجمہ:

(علی گڑھ میں قائم مسلم اینگلو اورینٹل کالج کے) نوجوان پروفیسروں کی آکسفورڈ اور کیمبرج سے بحالی ٹھیک اس بنیادی فیصلے کے عین مطابق تھی جو سر سید احمد خاں نے اپنے قیام انگلینڈ کے زمانے میں کیے تھے۔ ایک بار پھر سید محمود نے واسطہ کاردار ادا کیا جو ۱۸۸۳ میں سڈن کی جگہ لینے والے پرنسپل کی تلاش میں کیمبرج گئے تھے۔ منتخب شخص — تھوڈور بیک — سید محمود کے سامنے جان اسٹریچی کے بیٹے آر تھر کے ذریعہ ٹرینیٹی کالج میں پیش کیے گئے — بیک لندن میں پلے بڑھے تھے۔... بیک نے ریاضی میں ٹرائپوس امتحان لیا تھا — اور ان کا انتخاب اس اعلیٰ ترین خفیہ سوسائٹی میں بھی ہوا تھا جسے اپوسٹلز (Apostles) کہا جاتا تھا۔

اس اقتباس کے اندراجات کی مزید تصدیق کے لیے ملاحظہ فرمائیں:

(1) Aligarh Institute Gazette, Sept 7, 1886,

(2) Dictionary of National Biography 1901-1910

P.439

چنانچہ برطانوی غلامی کے عہد میں ۱۷۶۵ء سے ۱۹۴۷ء تک تعلیم کے میدان میں جو

سرکاری یا نیم سرکاری یا غیر سرکاری کوششیں ہوئیں ان کی حقیقت کیا تھی؟ فورٹ ولیم کالج، کلکتہ مدرسہ، مدرسہ غازی الدین حیدر دہلی، دہلی عربی کالج، سلسلہ مدرسہ عالیہ، مدرسہ ایجوکیشن بورڈ اور دیگر سلسلوں کی حقیقت تو جانے دیجئے ان میں صرف ایک سلسلہ تعلیم یعنی علی گڑھ مدرسہ جو بعد میں علی گڑھ تحریک کے نام سے معروف ہوا اس کی حقیقت اس سلسلہ نسب سے بخوبی جانی جاسکتی ہے۔

(۲) سول سروس: ایسٹ انڈیا کمپنی ہو یا سلطنت برطانیہ — سول سروس (Civil Service) اس کی ریڑھ کی ہڈی تھی۔ برطانوی استعمار میں سول سروس کا باضابطہ آغاز جس تعلیم گاہ سے ہوا وہ برطانیہ کے مقام ہیلی بری Haileybury کی تعلیم گاہ ہے۔

برطانیہ کا یہ مقام وہ اہم مرکز ہے جہاں سے فریمسن تحریک پوری سلطنت برطانیہ کی رگوں میں دوڑنے کے لیے نکلتی تھی۔ پوری انیسویں صدی میں ہر سول سرونٹ اسی منہل سے پانی پی کر آرہا تھا۔ لہذا اصلاً یہ وہی ہیلی بیرین (Haileyburian) ہیں جنہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو زندگی کے ہر شعبے سے بیک بنی و دو گوش بیدخل کر دیا۔ ان کے ہی وہ کارنامے ہیں جن کا ایک انجبار ۱۸۵۷ء میں ہوا۔ (Peter Penner: The Patronage Bureau cracy in

North India, Chanakya Publication, Delhi - 1986) لیکن ۱۸۶۰ء تک یہ طبقہ آسمان کی طرح پھیل چکا تھا۔ چنانچہ بعد کے دنوں میں جب ہندو نژاد مسلمان سول سروس میں آنے لگے، تو انہیں ترقی کا سب سے آسان زینہ فرمسن تحریک میں شمولیت کا ملا۔ اور یہ ایک ہولناک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی بڑی تعداد جو سول سروس میں تھی وہ فریمسن ہو گئی یا کم از کم اس کے لیے نرم گوشہ رکھنے لگی یا اس کی آلہ کار بن گئی تاکہ اعلیٰ حکام کی خوشنودی حاصل ہو سکے۔ چنانچہ ہندوستان ہو یا مصر، ٹرانس جازن ہو یا عراق انہوں نے وہی کیا جو فریمسنری کے مقاصد کے تحت ضروری تھا۔ ہندوستان میں تقسیم ملک سے قبل ہر مسلمان سول سرونٹ (ہمارے کرم فرما بزرگ جناب منظور احسن جامعی مرحوم کے تجزیے اور روایت کے مطابق) چودھری محمد علی نہیں تھا۔ چنانچہ دنیا میں ہر جگہ مسلم عوام کی امنگوں کا خون جن مسلمانوں کے ہاتھوں ہوا ان میں سے ایک یہ مسلم سول سرونٹ بھی تھے۔ پاکستان کے قیام کے بعد اس کے پہلے گورنر جنرل محمد علی جناح نے جن کے قدموں کے شل ہو جانے (Cold Feet) کا طعنہ دیا تھا وہ صرف فوج نہیں

تھی بلکہ سول سرونٹ بھی تھے جو قوم اور اسلام سے زیادہ فریمسنری کی خدمت کر رہے تھے۔

(۳) فوج: برطانیہ ہو یا فرانس فریمسنری کا سب سے منظم کاڈر فوج میں قائم تھا۔ چنانچہ انیسویں صدی کے ہندوستان میں برطانوی فوج تو فریمسنری کا اپنا ہی دستہ تھی۔ صورتحال اتنی غیر معمولی تھی کہ فوج اور فریمسنری تحریک برطانیہ کے تمام استعماریوں میں بشمول ہندوستان میں شانہ بہ شانہ ہی نہیں بلکہ یکجان ہو کر چل رہی تھی۔ یعنی ہندوستان میں قائم ہر فوجی کنٹونمنٹ دراصل اس علاقے میں فریمسنری کا صدر دفتر بھی ہوا کرتا تھا۔ یہ صورت حال یکساں طور پر پوری اٹھارہویں صدی، انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں برقرار رہی۔ واضح ہو کہ یہ صورت حال صرف ہندوستان ہی میں نہیں تھی بلکہ برطانیہ، فرانس اور اس کے ہر استعماریا زیر اثر علاقے میں تھی۔ برطانیہ اور فرانس میں قائم تمام اعلیٰ تعلیم کے عسکری ادارے دراصل اس کے مراکز تھے جہاں سے نکلنے والے افسروں میں سے اسی فیصد فریمسن ہو کر نکلتے تھے۔ یہ روایت آج بھی برقرار ہے۔ مسلم ملکوں کی فوجوں نے گزشتہ ۱۰۰ سالوں سے جو فساد برپا کیا ہے خواہ وہ مصر میں ہو یا شام، عراق، بھارت، پاکستان میں یا انڈونیشیا میں اس کا راز اسی عنوان میں ہے۔ عالم عرب میں بعث کی حقیقت پانا بہت مشکل نہیں۔ اخوان المسلمین کے ساتھ مصر، شام اور عراق کے فوجی حکمرانوں کا وحشیانہ سلوک اور کیمپ ڈیوڈ کا معاہدہ سب کی تشریح اسی باب میں مل سکتی ہے۔ اسی میں اس سوال کا جواب بھی مل جائے گا کہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے آزاد اور خود مختار ہونے کے بعد بھی ۱۹۵۶ء تک اس کی فضائی فوج کا نام The Royal کے ساتھ کیوں شروع ہوتا تھا۔ حسن ظہیر (Hasan Ziaheer) کی The Times And Trials of Rawalpindi Conspiracy (OUP, Karachi 1998) اور یہودی مصنف اسٹیفن کوہن (Stephen Cohen) کی (The Pakistan Army, OUP, Karachi. 1998) تو صرف جزوی اور سطحی واقعات کی کتابیں ہیں۔ ایر کموڈور انعام الحق (Inamul Haq) صاحب ایک سادہ اور طبعاً شریف آدمی تھے لہذا انہوں نے صرف آپ بیتی تک محدود ہو کر جو کچھ لکھا ہے وہ Tip of an Iceberg کے برابر بھی نہیں۔ اور انعام الحق صاحب ان تہہ خانوں تک جا بھی نہیں سکتے تھے اس لیے کہ مسلم ملکوں کی فوجوں میں فریمسن تحریک کے تہہ خانوں تک پہنچنا بہت آسان نہیں۔ چنانچہ انعام الحق صاحب نے جو کچھ اپنی کتاب

"Memories of Insignificance: Daru -ut-
Tazkeer, Lahore, 1999.

میں اکھا ہے وہ ایسا ہی ہے جیسے کسی ٹوٹے ہوئے تارے کی روشنی۔

۱۹۶۰ء کے بعد پاکستانی فوج کے افسروں میں دین دار افراد کی تعداد یقیناً بڑھنا شروع ہوئی جو ۱۹۷۱ء کے بعد اور تیز ہو گئی لیکن اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں کہ فریمن افسروں کا کاڈر کمزور ہو گیا۔ پورے ملک میں پھیلے سیاست دانوں، ریٹائرڈ فوجی افسروں، عدلیہ، بیوروکریسی، فارن ڈپلومیٹس اور تعلیمی اداروں میں ان کے مضبوط اور منظم کاڈر اور دوسری جانب دین دار طبقات — علماء، تحریکات اسلامی اور عام دینی مزاج رکھنے والے عوام — کی پھپھوندی لگی ہوئی اور سڑی ہوئی۔ — علمی، عقلی، تجزیاتی، احتسابی اور عملی فضا نے — جن میں قرآن، سنت اور تاریخ اسلامی کی گہرائیوں سے عمومی لاعلمی، اپنے علم و عقل اور اسلام کے فہم کو آخری سمجھنا، اسلام اور دین اللہ کی حفاظت سے زیادہ اپنے ہوائے نفس سے بنائے گئے شخصیات کی حفاظت کی فکر کرنا، علمی، فکری اور عملی دنیا میں ایسی باتوں کو مسلمات سمجھنا جو خود قیاس مع القیاس بلکہ قیاس علی القیاس پر قائم ہوں — فریمن جیسے ذہین طبقے کو مستحکم ہونے میں مدد دی ہے۔ برصغیر کے علماء ہوں یا تحریک اسلامی کے افراد وہ جس Stale اور Stereotyped علمی، فکری اور عملی قوت کو بروئے کار لارہے ہیں اس سے چیخ پکار کی فضا تو برقرار رکھی جاسکتی ہے لیکن قوموں کی تاریخ بدلی نہیں جاسکتی چاہے کہ اس سے امت محمدیہ مستجابہ کے فرائض منصبی کی ادائیگی۔ ساری دنیا کے مسلمانوں کے تعلق سے جو ذمہ داری جنوبی ایشیا کے مسلمانوں پر عائد ہو گئی ہے اے کاش وہ اس تاریخی ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے حضرت علامہ اقبال کا شاہین نہ بن سکتے تو نہ سہی کم از کم امراء القیس کے گھوڑے کی طرح تو ہو جاتے

مکر مفر مقبل مدبر معاً

كجلمود صخر حطة السيل من عل

۱۹۷۱ء اہل پاکستان کے لیے عام الحزن کی طرح آیا لیکن دین دار طبقات کی جہالت اور عجب نے اس موقع کو گنوا دیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ان دین دار طبقات کی جدوجہد سے نہیں بلکہ قدرت کی اپنی سنت کے تحت (خدا شری برا نگیزد کہ خیری ماوراء باشد) تقسیم ملک کے بعد پہلی

بار وہاں ایک Tectonic Upheavel آیا تھا جس میں بہت گہرائیوں میں پوشیدہ رہنے والی زیر زمین تہیں بھی ابھر کر اوپر آگئیں تھیں اور تھوڑی سی تفتیش بھی اہل پاکستان کو پورے عالم اسلام میں پہلے عدم استحکام کے ذمہ دار عفریتوں سے آگہی دلا سکتی تھی۔ لیکن چونکہ یہ دین دار طبقہ بالکل ہی سادہ لوح تھا لہذا بہت جلد ان ذہین لوگوں نے سب کچھ برابر کر دیا اور وہ تہیں پھر زمین کی گہرائیوں میں چلی گئیں۔ حمود الر حمن کمیشن کارپوریشن ہر چند کہ بہت حاوی اور جامع نہیں تھا تاہم بہت غنیمت تھا۔ لیکن کیا یہ صرف حکومت کی ذمہ داری تھی کہ وہ حقائق کا پتہ لگاتی؟ کیا تو میں حکومت کے بل پر جیا کرتی ہیں؟ عین ممکن ہے کہ جناب الطاف گوہر کی یہ بات درست ہو کہ ۱۶ تا ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو بعض لوگوں کا کورٹ مارشل ہوا تھا لیکن عام طور پر پھیلی ہوئی یہ بات قطعاً درست نہیں کہ حمود الر حمن کمیشن کے ذریعہ سامنے لائے جانے والے حقائق اس لیے (Intern) کر دیئے گئے کہ اس سے قوم کا مورال مجروح ہوتا۔ حقیقت یہ نہیں بلکہ اصلی حقیقت یہ تھی کہ اس رپورٹ میں بالیقین کچھ ایسے شواہد ضرور سامنے آگئے ہوں گے جن سے ان طبقات کی سازش کا علم ہو جاتا جو عالمی سطح پر اسلام اور اہل اسلام کے عدم استحکام کا سبب چلے آرہے تھے اور اسی کے ذیل میں ان افراد کی حقیقت کا بھی علم ہو جاتا جو ۱۹۷۱ء سے اب تک اپنے مقاصد میں سرگرم رہے تھے۔ چند جنزلوں اور بیوروکریٹس کو قربان کر کے اگر اصلی حقائق پوشیدہ رہ جاتے تو یہ ایک آسان سودا تھا۔ اور ایسا ہی کیا گیا لیکن میرا خیال ہے کہ اگر حمود الر حمن کمیشن کی رپورٹ پوری طرح شائع بھی کر دی جاتی جب بھی یہ دیندار طبقہ اس سے کچھ بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اس لیے کہ اگر اس میں وہ بنیادی صلاحیت اور آمادگی پائی ہی جاتی تو کیا دنیا میں دیگر جگہوں پر پہلے حقائق کم چشم کشا تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس دیندار طبقہ نے قسم کھالی ہے کہ وہ نہ اپنے اوپر نظر ثانی کرے گا نہ اپنا احتساب کرے گا نہ خود کو حقیقی اسلام کے سائے میں لائے گا بلکہ طرح طرح کے شرعی جہالت کے حیلوں سے اپنے جمود اور تعطل کو سند جواز عطا کرے گا۔

کیا ان حضرات کو اس کا علم ہے کہ لندن میں قائم عالمی گرینڈ لاج (The Grand Lodge, London) کو کلکتہ سے ۲۸ دسمبر ۱۹۷۸ء کو لکھی گئی ایک درخواست پہنچی تھی جس میں استدعا کی گئی تھی کہ فریمسری کی عالمی تحریک بر صغیر میں باضابطہ فریمسری کے قیام اور اس کے لاج (Lodge) کو سند تقدیس (sign of Consecration) عطا کرے۔ جس کے

بعد ۶ فروری ۱۷۲۹ء کو برصغیر میں پہلا فریمسن لاج The Lodge at Fort William قائم کیا گیا اور اسی سال یعنی ۱۷۲۹ء میں کیپٹن رالف فارونٹر (Captian Ralph Farwinter) کو "Provincial Grand Master of East India in Bengal" اور جیمس ڈاؤسن (James Dowson) کو "Provincial Grand Master of East India" مقرر کیا گیا۔ چنانچہ دیکھتے دیکھتے فریمسن کی شاخیں بلوچستان کی ایرانی سرحد سے لے کر بشمول افغانستان — رنگون تک اور کشمیر سے لے کر کنیا کماری تک قائم ہو گئیں۔ ظاہر ہے جب ملک تقسیم ہوا اور پہلے بھارت اور پاکستان اور بعد میں بنگلہ دیش وجود میں آئے تو ان میں بھی انتظامی تبدیلیاں لائی گئی ہوں گی۔ پاکستان اور بنگلہ دیش میں فریمسنری کی قوت، اقتدار اور صورت حال اور اس سے وابستہ افراد کا انداز صرف اسی سے لگایا جاسکتا ہے کہ تقسیم ملک کے بعد بھارت میں فریمسنری کی ساری ذمہ داری ایک ایسی ذات کے کاندھوں پر ڈال دی گئی جو ساری دنیا کے فریمسن اکابر میں ان کے اپنے مطابق اپنے تقویٰ، فکری اصابت اور فریمسنری سے وابستگی کے اعتبار سے عظیم المرتبت تھی اور بعد کی تاریخ نے ثابت کر دیا کہ اس ذات نے ہندوستان کے فریمسن اکابر میں تقدس کا وہ مقام حاصل کیا جو کسی غیر برطانوی اور غیر یہودی کو کبھی نہیں مل سکا ہو گا۔ اور وہ ذات گرامی کوئی اور نہیں بلکہ نواب مشتاق علی خاں کے پوتے اور نواب سر حامد علی خاں کے بیٹے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فرزند ارجمند اور ۱۹۳۰ء سے ریاست رامپور کے نواب — میجر جنرل ہزہاکنس ڈاکٹر نواب سید رضا علی خاں بارٹ، جی سی آئی ای، کے سی ایس آئی، ڈی لٹ، ایل ایل ڈی ہیں۔

جب ۱۹۶۱ء میں نواب سید رضا علی خاں کا انتقال ہوا تو عالمی فریمسنری تحریک میں ان کا سورج نصف النہار پر تھا۔ عالمی فریمسنری کے ایک بڑے قائد کے الفاظ میں ”عالمی فریمسنری نواب صاحب کے خدمات جلیلہ کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی اور اس سے ہمیشہ Inspiration لیتی رہی گی۔“

۱۷۲۹ء میں برصغیر میں قائم ہونے والی فریمسنری تحریک نے ۱۵ تا ۲۰ دسمبر ۱۹۹۸ء کو اپنے دہلی اجلاس میں اس کا فیصلہ کیا ہے کہ یہ تحریک اب اس مقام پر آگئی ہے کہ برصغیر میں اپنی سرگرمیاں علانیہ طور پر انجام دے۔ کیا ۱۹۹۸ء کے اوائل سے یہ محسوس نہیں کیا جا رہا ہے کہ

اچانک برصغیر کا موسم بدل چکا ہے۔ اہل نظر لوگوں کی نگاہ میں کارگل کا پورا واقعہ (Episode) اور اس کا تسلسل رد عمل (Chain Reaction) عالمی فریمسز کی ایک سوچی اور سمجھی اسکیم تھی جس کی پہلی سطح مذہبی اور دینی تھی۔ اس لیے کہ جذباتی اور گہری معلومات اور تجزیاتی قوت سے محروم علماء اور تحریکات اسلامی کے افراد کے لیے یہ نعرے بے حد ہوشربا ثابت ہوتے ہیں اور ان نعرہوں کے بلند ہوتے ہی ان کی رہی سہی قوت مدد کہ بھی معطل ہو جاتی ہے اور یہی موقع ہوتا ہے فری مسز کی اپنے کسی گرینڈ پلان (Grand Plan) کو عملی شکل دینے کا۔ چنانچہ اس واقعے کے پہاڑ کے پیچھے فریمسز کی عالمی فوج کھڑی تھی اور اس نے بڑی چابکدستی سے پوری ملت اسلامیہ کو آئندہ چند سالوں کے لیے جملہ معترضہ کے ہفت خواں طے کرنے کے لیے بھیج دیا اور اس دوران وہ اپنا عالمی پلان پورا کر لیں گے۔ اس عاجز نے پوری ملت کو ”یا ساری الجبل!“ سے پکارا لیکن ایسا لگتا ہے کہ صرف اہل حل و عقد ہی ان الفاظ اور ان کی معنویت سے نا آشنا نہیں بلکہ بیشتر تحریکات اسلامی کے افراد بھی ان کی ہی طرح بسم اللہ کے گنبد میں بیٹھنا پسند کرتے ہیں۔

چونکہ فی زمانہ علماء اور تحریکات اسلامی کے بیشتر افراد جو مغرب سے سخت تشویش رکھنے کے باوجود اس سے حد درجہ مرعوب اور لاشعور کی سطح پر اس کے بے حد مشتاق ہیں اور اس لیے ان میں اکثر منفری ملکوں کے اسفار اور اس نگار خانہ کی سیر کو اپنی عظمت اور مقبولیت اور رسوخ فی الدین کے لیے سند سمجھتے ہیں — نہ مشرق میں رہ کر مغرب کی حقیقت سمجھ پاتے ہیں نہ مغرب جا کر۔ یہی سبب ہے کہ اس وقت پوری ملت کے پاس امت کا اپنا کوئی آزاد عالمی منصوبہ نہیں۔ اور ملت کی ساری سرگرمیاں خواہ تحریکی ہی کیوں نہ ہوں فی الواقع مغرب کے چھیڑے ہوئے ساز پر منفی اور مثبت رد عمل کے سوا کچھ نہیں۔

بہر حال ہم ان جملہ ہای معترضہ کے بعد پھر اسی سلسلہ بحث کی طرف واپس آتے ہیں جہاں ہم مسلم ملکوں کی فوجوں کا ذکر کر رہے تھے۔ لہذا ان تمام حقائق کے باوجود اس عاجز کی باتوں کا یہ مطلب قطعاً نہ لیا جائے کہ مسلم ملکوں کی فوجوں میں سارے کے سارے افسر اسی قبیل کے ہیں۔ ایسا قطعاً نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان فوجوں میں قوت ایمانی اور تقویٰ سے لبریز ایسے ایسے لوگ موجود ہیں کہ ان میں سے کسی دستے میں ایک شخص کی موجودگی بھی فرشتوں کی پوری فوج کے اتارنے کا باعث بن سکتی ہے۔

(۴) عدلیہ: عہد حاضر میں فریمسری کی سب سے باوقار اور خاموش تنظیمیت کی علامت مغربی طرز پر قائم عدلیہ ہے جو تقریباً تمام مسلم ملکوں میں پائی جاتی ہے۔ ہر چند کہ اس کی شروعات انیسویں صدی میں برطانیہ کے Lincoln's Inn اور فرانس کے قانون کے مراکز سے ہوئی تھی لیکن چونکہ عدلیہ کے باوقار حضرات عام معاشرے سے الگ تھلگ اور بااثر ہوتے تھے لہذا تاریخ یہ بتاتی ہے کہ تقریباً تمام ہی مسلم ملکوں میں فریمسری کو رائج کرنے میں مغربی طرز کی عدلیہ کا کسی سے کم ہاتھ نہیں۔ عام طور پر فریمسری کی سریت بچوں کے پروکار لبادے میں باسانی چھپ جاتی تھی۔ اور آج بھی اس کا مشاہدہ باسانی کیا جاسکتا ہے کہ عبوری حکومتِ دجال (اقوام متحدہ) کی تمام Supra- State Activities میں یہی برسرکار اور ریٹائرڈ جج سب سے پیش پیش ہیں۔

ان تفصیلات سے کوئی شخص یہ گمان نہ کرے کہ مسلم ملکوں کی تعلیم گاہوں، سول سروس، فوج اور عدلیہ کے سوا دیگر شعبوں میں فریمسری کے کاڈر موجود نہیں۔ یہ کاڈر ہر جگہ ہیں یا کم از کم ان میں انفرادی طور پر منسلک و مربوط افراد خواہ وہ سیاسی پارٹیاں ہوں، NGO's یا بعض طبقاتی شخصیات مثلاً: ڈاکٹر، دکلاء، انجینیر، حتیٰ کہ علماء، پیر صاحبان اور مشائخ بھی۔ جو بات بے حد افسوسناک ہے وہ یہ ہے کہ پورے عالم اسلام کے سب سے بیدار مغز طبقات یعنی تحریکات اسلامی میں بھی اس تعلق سے بے خبری ہی بے خبری پائی جاتی ہے۔ اس عاجز کا اندازہ ہے کہ ان کے یہاں بھی فریمسری نے انکلیو (Enclave) بنا لیے ہیں۔ میں نے عالم اسلام کی ایک بہت بڑی تحریک اسلامی کے بڑے قائدین میں سے ایک سے اس تناظر میں بات کی۔ میں نے ان کے سامنے اس صورت حال کو ایک مسئلے کی شکل میں رکھا۔ میں نے پوچھا:

اگر کوئی شخص تحریک میں ہو اور اس کی تنظیمی سرگرمیاں دستور کے مطابق بظاہر اطمینان بخش ہوں اور اس میں کسی غفلت اور تعطل کا احساس نہ پایا جاتا ہو بلکہ وہ دوسرے سے یا سب سے زیادہ سرگرم نظر آتا ہو اور کسی ذریعہ سے قائد تحریک کو یہ معلوم ہو جائے کہ وہ شخص کسی خطرناک اسلام دشمن تحریک سے وابستہ ہے لیکن اس کا کوئی ثبوت بھی نہ ہو تو دستور کے مطابق قائد اسے تحریک میں رہنے یا اسے ذمہ دارانہ منصب تک پہنچنے سے کیسے روک سکتا ہے جب کہ صورت حال یہ ہو کہ دستور میں کسی منصب کی اہلیت جو بتائی گئی ہے اس کا فیصلہ عام ارکان کرتے ہیں جن کی بڑی

تعداد کو نہیں معلوم کہ مثلاً: عالم بالکتاب والسنہ ہونے، رسوخ فی الدین کا حامل ہونے یا اہل الرائے ہونے کا حقیقی اور مطلق مفہوم کیا ہے بلکہ عام طور پر وہ اسکے معروف مفہوم کو ہی جانتے ہیں جن میں مطلق کے بجائے اضافی صورت حال کا زیادہ لحاظ رکھا جاتا ہے اور عام طور پر تحریکات میں وابستگی اور اہل الرائے ہونے کا مدار اس پر ہوتا ہے کہ مثلاً کون اپنی تحریروں یا تقریروں سے جو عموماً زیادہ ہوتی ہیں کتنا نمایاں ہے۔ اور بطور خاص اس صورت حال میں کہ اگر:

(۱) قاید بلا ثبوت اسے تحریک سے ہٹانا چاہے تو اسے غیر دستوری قرار دیا جائے گا۔

(۲) قاید ثبوت نہ ہونے کی صورت میں یا اس کے باوجود اس کے بارے میں

تحفظات کا درپردہ یا علانیہ اظہار کرے تو اسے غیبت بلکہ بہتان یا نجومی قرار دیا جائے گا۔
توان بزرگ قائد نے جواب دیا: بلاشبہ دستور میں تو ایسی کوئی شق نہیں ہے جس کے ذریعہ کسی ایسے شخص کو دستوری طور پر اعلیٰ مناصب تک پہنچنے سے روکا جاسکے۔ خاص طور پر ایسی صورت میں کہ وہ ذی حیثیت اور با وقار بھی ہو۔ لیکن ”ہم تحریک اسلامی کے افراد کی اصابت رائے اور اجتماعی شعور سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ شخص بہت دنوں تک چھپ کر نہیں رہ سکتا۔“

میں نے جواباً پوچھا:

”کیا آپ کی یہ بات آپ کا تصوراتی خیال ہے یا اعتماد یا اس کے پیچھے کوئی واقعہ ہے جس کے تجربے کے بعد آپ اس نتیجے تک پہنچے ہیں۔“

انہوں نے جواب دیا:

”یہ میرا خیال ہے اور مجھے اس پر اعتماد ہے۔“

تب میں نے ان کی جانب معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اس لیے کہ کم از کم ایک ایسے شخص کی حقیقت پابینے پر اللہ نے اس عاجز کو قدرت دے دی تھی جو پچھلے چالیس سالوں سے رکن ہی نہیں ذمہ دارانہ مناصب پر بھی رہتا آیا تھا اور اسلام دشمن قوتوں سے براہ راست منسلک بھی تھا حتیٰ کہ اس کا اسلام بھی مشتبہ تھا۔

در اصل گزشتہ کئی صدیوں سے اس امت کی صورت حال ناگفتہ بہ حد تک خراب ہو چکی ہے۔ عالم عرب تو ساتویں صدی عیسوی کے ختم ہوتے ہی مرگ نما خواہیدگی کی حالت میں چلا گیا تھا اور عالم ترک پر یہ کیفیت سترہویں صدی میں طاری ہو گئی۔ برصغیر پورے عالم اسلام

میں سب سے بہتر حالت میں تھا۔ اور پھر اس پر اللہ کی بے حد و حساب عنایات بھی ہوئیں۔ لیکن یہاں کے جمہور علماء اور مسلم حکمران، فی الواقع بد بخت ثابت ہوئے۔ جس خطے کو تین سو سالوں کے اندر حضرت مجدد الف ثانی، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور حضرت علامہ اقبال رحمہم اللہ علیہم اجمعین جیسی شخصیات دی گئی ہوں اور اس قوم کے جمہور علماء اور حکمرانوں نے انہیں قوم کی علمی و فکری اور روحانی بحرئی سے نکال کر آثار الصنادید بنادیا ہو ان جمہور علماء اور حکمرانوں بلکہ اس پوری قوم کو بد بخت ہی کہا جاسکتا ہے۔ برصغیر کے کسی بھی مکتب خیال کی دینی درس گاہ کے نصاب ان تینوں کے افکار، ان کے تجزیوں حتیٰ کہ ان کی کتابوں سے خالی ہیں۔ ان کا ذکر خواہ کتنا ہی احترام سے کیوں نہ کیا جاتا ہو لیکن اس پورے ذخیرہ علم میں جس کو دینی علوم کہتے ہیں ان حضرات کو قدم رکھنے کی اجازت نہیں۔ اگر معاشرے کے دیگر ذرائع سے جنہیں دراصل غیر مستند مصادر علم (Apocrypha) سمجھا جاتا ہے کوئی استفادہ نہ کرے تو وہ اس سے بھی نابلد رہے گا کہ ان ناموں کے لوگ اس خطے میں کبھی پیدا بھی ہوئے تھے۔

ان تینوں حضرات کی نہاد نبویانہ تھی۔ اگر اللہ تعالیٰ روئے ارض پر ختم نبوت سے پہلے انہیں پیدا کرتا تو ضرور یہ تینوں انبیاء کی صورت میں آتے۔ اور اب جب کہ یہ حضرات قدس تشریف لائے تو ان کے ساتھ جمہور علماء امت اور حکمرانوں نے وہی سلوک کیا جیسا علماء یہود نے انبیاء بنی اسرائیل کے ساتھ کیا تھا۔

چنانچہ امت کا یہی جمود اور تعطل ہے جس نے ایسی مضحکہ خیز صورت حال پیدا کر دی ہے جس کا ذکر بھی دل کی دھڑکن روک دینے کے لیے کافی ہے۔ غضب بالائے غضب یہ ہے کہ ان حضرات کو اس کا قطعاً احساس بھی نہیں ہے۔ چنانچہ برصغیر کے علماء اگر واقعی اپنے دعوے کے مطابق ورثہ الانبیاء ہوتے تو جن ’نیک کاموں‘ کی طرف وہ سن ۲۰۰۰ میں توجہ فرما رہے ہیں یعنی مغرب کی حقیقت سمجھنے کے لیے انگریزی پڑھنا اور کمپیوٹر ٹائپسٹ پیدا کرنا تو ان کو چاہئے تھا کہ ان کاموں کی طرف ۱۷۱۷ اور ۱۷۳۸ء کے مابین توجہ فرماتے۔ ان علماء کرام کا ذکر تو خیر جانے دیجئے فی الواقع امت کا سب سے بیدار سمجھا جانے والا طبقہ یعنی تحریکات اسلامی کا عمومی حال بھی کچھ زیادہ امید افزاء نہیں۔ ان کے بعض طبقات سن ۲۰۰۰ میں ان کاموں کی طرف توجہ فرما رہے ہیں جن کی جانب امت کو ۱۸۲۸ء اور ۱۸۲۳ء کے مابین توجہ کرنی چاہئے تھی۔ کیا انہیں معلوم

نہیں کہ دجاں کا ہر اول دستہ سن ۲۰۰۰ میں ان منصوبوں پر عمل درآمد کر رہا ہے جو اس نے ۱۹۰۱ء میں سوچے تھے۔ اور اپنی تجربہ گاہوں میں ان منصوبوں پر تجربے کر رہا ہے جو اسے ۲۰۸۰ میں کرنے ہیں اور اس کے دماغ ان امور پر Hypothesis قائم کر رہے ہیں جو ۲۱۰۰ کے بعد پیش آسکتے ہیں۔

حالیہ دنوں میں آنے والی ایک خبر تو اتنی وحشت ناک ہے جس پر سنسکرت کا ایک محاورہ ہی یاد آتا ہے جس میں کہا گیا ہے:

وِثَّاشْ سَکَالے وِپَرِیْت بُدِھِی
(جب بربادی کے دن آنے ہوتے ہیں تو عقل خبط ہو جاتی ہے)
خبر ملاحظہ فرمائیں:

”اسلام آباد“: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اور امریکن سینٹر اسلام آباد نے اسلام، مسلم دنیا، اسلامی تحریکات، انسانی حقوق اور خواتین کے مسائل پر انٹرنیٹ پر موجودہ ویب سائٹس کا تعارف کرانے کے لیے ایک مشترکہ پروگرام کا انعقاد کیا۔ جس کا موضوع ”اسلام آن دی انٹرنیٹ“ تھا۔ امریکن سنٹر کے کنزیو لائبریری ڈائریکٹر اسلم مجاہد نے انٹرنیٹ پر موجود ان تنظیموں اور اداروں کا تعارف کرایا جو انٹرنیٹ پر اسلام کی نمائندگی کرتے ہیں اور جن کی اسلام کے حوالے سے انٹرنیٹ پر ویب سائٹس موجود ہیں۔ انہوں نے کہا کہ امریکی یونیورسٹیوں، حکومتی اداروں نے اس سلسلے میں بے شمار کام کیا ہے۔ اسلم مجاہد نے اس ضمن میں مسلم پبلک افیئر کونسل، مسلم دومن لبر، اسلامک سوسائٹی آف نارٹھ امریکہ، امیرکن انسٹی ٹیوٹ آف پاکستان اسٹڈیز اور دیگر کئی ویب سائٹس دکھائیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام اور متعلقہ موضوعات کو انٹرنیٹ پر کتنی کوریج دی جاتی ہے۔ امریکی سینٹر کے انفارمیشن ریسورس آفیسر ہنری میڈسن نے ان سہولیات کے بارے میں حاضرین کو آگاہ کیا جو تحقیقات کاروں، پاپسی سازوں، حکومتی افسران اور صحافیوں کو مہیا کرتے ہیں۔.....

(روزنامہ جسارت، کراچی، ۲۹ جون ۲۰۰۰ء)

عقل و دل و نگاہ کا مرکز اولین ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدہ تصورات
عشق بتا رہا تھا اپنی خودی میں ڈوب جا
نقش و نگار دیر میں خون جگر نہ کر تلف
نومبر ۲۹، ۱۹۴۷ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے قرارداد پاس کر دی کہ فلسطین کو منقسم

کر دیا جائے اور وہاں یہودیوں کی ایک (مصنوعی) ریاست قائم کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ چنانچہ ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو شام سے ذرا قبل سلطنت اسرائیل کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ وہی وقت تھا جس کے ٹھیک چند گھنٹوں کے بعد لیگ آف نیشنز (League of Nations) اور بعد ازاں اقوام متحدہ (U.N.O) کے انتداب فلسطین کی مدت ختم ہو رہی تھی۔ چنانچہ اس تسلسل کی اصل حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہوئے مشہور یہودی تاریخ داں برنارڈ مارٹن (Bernard Martin) نے اس طرح بحث کی ہے:

"Within minutes after the news of Israel's Declaration of Independence flashed across the White House teletype, President Harry S. Truman, ignoring the Counsels of State Department and the American officials, extended de facto recognition to the new state. Three days later the government of the Soviet Union, which --- to general surprise had supported Palestine partition resolution in the United Nations, granted de jure recognition. Most other non-Arab nations quickly followed the United States and Russia, only Great Britain grudgingly withholding recognition as long as it could."

(Bernard Martin: A History of Judaism, Basic Books, Inc, Publishers, N.Y. 1974 Vol.II P-441.)

ترجمہ:

”صدر امریکہ ہیری، ایس، ٹرومین نے — وہاٹ ہاؤس کے ٹیلی ٹائپ کے ذریعہ اسرائیل کے اعلان آزادی کے چند ہی منٹوں کے اندر — اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کے مشیروں اور دوسرے امریکی افسران کے مشوروں کو نظر انداز کرتے ہوئے — اس نئی ریاست کو حقیقی ریاست کے اعتبار سے تسلیم کر لیا۔ تین ہی دنوں کے بعد — سوویت یونین کی حکومت نے بھی — حیرت انگیز طور پر اسے باضابطہ ریاست کے اعتبار سے تسلیم کر لیا۔ جبکہ سوویت یونین نے فلسطین کی تقسیم کے رزلوشن کی حمایت کی تھی۔ بیشتر غیر عرب قوموں نے ریاستہائے متحدہ امریکہ اور سوویت یونین کا اتباع کیا (اور اسرائیل کو تسلیم کر لیا) سوائے برطانیہ کے جس نے اسے تسلیم کرنے کو

اس وقت تک مالا جب تک (ایسا کرنا اس کے مفاد میں تھا)۔ (بالآخر اس نے بھی اسے تسلیم کر لیا۔)

اس سے بڑا ڈرامہ دوسری جانب ہو رہا تھا چنانچہ دوسرے دن پانچ عرب ریاستوں — عراق، مصر، لبنان، شام اور ٹرانس جاردن کی فوجوں نے نئی اور ناجائز ریاست اسرائیل پر حملہ کر دیا۔

عالم عرب کے مخلص مسلمانوں کی سادگی اور ان کے فری میسن حکمرانوں، ان کی فری میسن فوج، یورو کریسی اور سفارت کاروں کی منافقت اور ان کی جنگ زرگری کا نقشہ ایک دوسرے یہودی تاریخ داں میکس آئی ڈیمونٹ (Max.I.Dimont) نے یوں کھینچا ہے:

"The Israeli War of Independence (1948-1949) contains all the elements of drama, intrigue, and luck that one associates with a historical novel. This clash of destinies began when the British Empire folded its Palestinian tents, hauled down the Union Jack, and departed. Five Arab armies, led by the spiritual successor to T.E. Lawrence --- General John Bagot Glubb, honorary Pasha --- immediately swooped down upon Israel from all directions, announcing in their first communique that within a week the fighting would be over and the Jews driven into the Sea."

(Max.I. Dimont: Jews, God and History, Mentor N.Y. 1962, P-423)

ترجمہ:

کسی تاریخی ناول کی طرح اسرائیل کی جنگ آزادی (۱۹۴۸-۱۹۴۹ء) بھی اپنے اندر ڈرامہ، سازش، اور مقدر کے تمام عناصر رکھتی ہے۔ (اسلام اور یہودیت کے) مقدر کا تصادم اس وقت شروع ہوا جب برطانوی سامراج اپنے فلسطینی خیمے کو گرا کر یونین جیک کو اتار کر رخصت ہو گیا۔ چنانچہ پانچ عرب فوجیں لارنس آف عربیا کے جانشین اور وارث جنرل جان بے گوٹ گلب جو اعزازی طور پر پاشا سے ملقب تھا کی قیادت میں تمام سمتوں سے اسرائیل پر ٹوٹ پڑیں۔ اور اپنے پہلے ہی سرکاری اعلان میں (عربوں کے ذریعہ) کہا گیا کہ جنگ محض ایک ہفتے میں ختم ہو جائے گی اور یہودیوں کو

سندر میں پھینک دیا جائے گا۔

اسی مقام پر اس بات کی وضاحت بھی بے محل نہ ہوگی کہ سلطنت برطانیہ، سلطنت امریکہ اور سلطنت فرانس کے قیام اور استحکام کے بعد اور مزعومہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر سے قبل لازم تھا کہ ایک عبوری عالمی حکومت قائم کی جاتی اور اس کے زیر سایہ سلطنت اسرائیل کا قیام ہوتا۔ چنانچہ یہی عبوری عالمی حکومت مجلس اقوام متحدہ UNO ہے۔ جسے ابتداءً حکومت دجال سے موسوم کیا گیا ہے۔ مجلس اقوام متحدہ ۱۹۴۵ء اور ریاست اسرائیل ۱۹۴۸ء میں قائم کی گئی۔


”ڈرامہ دو ہفتے میں ختم ہو گیا۔ پندرہ دنوں کے اندر اسرائیل کا رقبہ دوگنا ہو گیا۔ اور مقدمہ عبوری حکومت دجال (U.N.O) میں چلا گیا۔ پھر اس کے بعد حکومت دجال اور عالم عرب کے فری میسن حکمرانوں کے ڈراموں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہر اگلی منزل کے پہلے ایک ڈرامہ — ریاست اسرائیل کے اعلان کو عرب حکومتوں سے تسلیم کرانے اور اس کی سرحدوں کو مزید توسیع دینے کے لیے ۱۹۴۸ء کا ڈرامہ، نہر سوئز کو بین الاقوامی علاقہ قرار دینے کے لیے ۱۹۵۶ء کا ڈرامہ، قرارداد ۲۴۲ پاس کرانے یعنی ریاست اسرائیل کو جائز ریاست قرار دلوانے اور بیت المقدس پر قبضہ دلوانے کے لیے ۱۹۶۷ء کا ڈرامہ، کیمپ ڈیوڈ اور اس کے ذیلی کیمپ ڈیوڈ معاہدے، کروانے یعنی عربوں کے ساتھ پر امن بقائے باہم کے حق کو منوانے کے لیے ۱۹۷۳ء کی رمضان جنگ کا ڈرامہ، چنانچہ ڈراموں کا یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا کہ مجلس اقوام متحدہ کی بنیادی طاقت سلامتی کونسل ہے۔ سلامتی کونسل کیا ہے، اور کس کی علامت ہے؟ اگر غور کیا جائے تو سلامتی کونسل کے اجلاس میں نشستوں کی صورت حال اس کی حقیقت کو خوب واضح کر دیتی ہے۔ لیکن اس سے قبل ہم یہ جان لیں کہ مہر سلیمانی، سپر سلیمانی اور پنٹاگن کی طرح سلامتی کونسل کی مخصوص نشست گاہ اور اس کی ترتیب کس کی علامت ہے؟

اس علامت کو Catenarian علامت کہا جاتا ہے جس کی دو شکلیں ہیں:

(۱) پہلی محراب کی طرح اوپر ابھری ہوئی جسے Catenarian Arch کہتے ہیں اور

(۲) دوسری افقی پڑی ہوئی جسے Royal Arch Chapter کہا جاتا ہے۔ اگر

محراب کی طرح ابھری ہوئی ہو تو اس کی شکل  یوں ہوگی یہی شکل اگر پڑی ہوئی ہو تو

یوں () ہوگی۔

چنانچہ محراب کی طرح ابھری Catenarian Arch کے بارے میں جو نس کہتے ہیں:

"Freemasonry knows the Arch as not only the symbol of strength but as a symbol of heaven. There is some suggestion of an arch in Job XXVI, II: "the pillars of heaven tremble."^۵

ترجمہ:

”فری مسنری ’محراب‘ کو صرف قوت کی علامت کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ عرش کی علامت کے بطور بھی جانتی ہے۔ ایوب ۲۶/۲ میں اس محراب کے تعلق سے کچھ اشارے دیئے گئے ہیں: ”عرش کے ستون لرزنے لگے۔“

افنی یعنی پڑی ہوئی یعنی Catenarian Arch Chapter ہو تو اس کے بارے میں جو نس کہتے ہیں:

"The august Sanhedrin sat in a semicircle when in judgement. The form of the Royal Arch Chapter based on the catenarian arch is thus the reminder of that ancient assembly. Actually, the assembly was not known as a Sanhedrin until the second century B.C. We learn of the Constitution of the Assembly in Number XI, 16, where "the Lord said unto Moses, Gather unto me seventy men of the elders of Israel, whom thou knowest to be the elders of the people, and officers over them; and bring them unto the tent of meeting, that they may stand there with thee" (Revised Version). This council met within the precincts of the Temple and its presiding officer represented the king, just as the presiding officer in a chapter also represents the king, and is correctly addressed as 'M.E.'^۶

ترجمہ

”عظیم الشان سنہیدرن اسی طرح نصف دائروی ہو کر فیصلے کے لیے منعقد ہوا کرتا تھا۔ رائل آرچ چپٹر کی بنیاد جو Catenarian Arch پر مبنی ہے اس قدیم

مجلس کی یادگار ہے۔ درحقیقت یہ مجلس دوسری صدی عیسوی قبل مسیح سے پہلے
سیدرن کے نام سے جانی نہیں جاتی تھی۔ چنانچہ ہمیں اس مجلس کی تشکیل کا علم شہ
یازدہم ۱۶۱ سے ہوتا ہے جہاں فرمایا گیا: خدا نے موسیٰ سے کہا: اسرائیل کے ستر
بزرگوں کو میرے پاس جمع کر دجے تم لوگوں کے بزرگوں اور سرداروں کی حیثیت سے
جانتے ہو۔ اور انہیں خیمہ ملاقات میں لاؤ جہاں وہ تمہارے ساتھ کھڑے رہیں۔ (نظر
ثانی شدہ متن) یہ مجلس بیت المقدس کے احاطہ میں منعقد ہوئی اور اس میں صدر نشین
ن، بادشاہ کی نمائندگی کی جس طرح چیپٹر نڈ ر نشین بادشاہ کی نمائندگی کرتا ہے۔
اور یہی سبب ہے کہ اسے بجاطور پر M.E کہا جاتا ہے۔“

چنانچہ سلامتی کا نسل ایک عبوری سلامتی کو نسل ہے۔ جب ہیکل سلیمانی کی تعمیر ہو کر
عظیم ریاست اسرائیل قائم ہو جائے گی تو دنیا کی یہ موجودہ سلامتی کا نسل منتقل ہو کر اور صرف
یہودیوں کے ستر افراد پر مشتمل وہ سلامتی کو نسل بن جائے گی جو ہیکل سلیمانی کے اندر اجلاس کرے
گی اور وہی دجالی حکومت کا اصلی روپ ہوگا۔

یہ تفصیلات تو دراصل جملہ ہائی معترضہ کے بطور محض وضاحتاً عرض کیے گئے ورنہ ہم
اس بات کا ذکر کر رہے تھے کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ دراصل ایک ایسی فریسن حکومت ہے جس
کا مقصد وجود ہی اقبہ الصخرہ اور مسجد اقصیٰ کو ڈھا کر اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر کر کے دجال کے استقبال
کی تیاری کرنا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے عالم مغرب کا ہر باخبر آدمی جانتا ہے، چنانچہ اس کی
تفصیلات کا ذکر کرتے ہوئے امریکہ میں مذہبیات کے مشہور دانشور ایڈورڈ اے۔ تریاکیان
(Edward A. Tiryakian) کے خیالات قابل ذکر ہیں۔ واضح ہو کہ مسٹر تریاکیان پر نسلن
اور ہارورڈ میں استاذ اور امریکن سوسائٹی فار اسٹڈی آف ریلیجن کے صدر (۸۴-۱۹۸۱) رہ چکے
ہیں وہ لکھتے ہیں:

"The religious matrix of the United States in
Calvinism and the Social reflection of this cultured
floor in the (formerly) hegemonic White Anglo-Saxon
Protestant (WASP) section of the population are
universally recognised and require no discussion
Essentially, the American setting gave rise to the first
large-scale Puritan civilization, one that, freed from

the worries of a repressive social environment, turned its missionary impetus into a gigantic enterprise of harnessing an equally gigantic physical environment that was viewed as wilderness. Max Weber and one of his leading interpreters, Talcott Parsons, have keenly observed that in reorienting that quest for salvation to "this worldly asceticism", Protestantism introduced a powerful "Cognitive breakthrough", a "lever for social change." In seeing themselves not primarily as benefactors but as stewards or trustees of God's purpose in placing them in front of wilderness, the puritans and their descendants, even unto to-day, helped to create and then re-create not just what Lipset aptly termed "the first new nation" but what in fact was equally the first Protestant nation." کے

ترجمہ:

ریاستہائے متحدہ امریکہ کے مذہبی قالب کا کالونزم سے بنا ہونا اور اس متمدن زمین کے ذریعہ آبادی کے تعلق سے (سابق) غالب سفید فام اینگلو-سیکسن پروٹسٹنٹ (واسپ) رنگ کے معاشرتی عکس کا منعکس کرنا وہ بات ہے جو عالمگیر طور پر تسلیم کی جاتی ہے اور اس پر کسی بحث و تمحیص کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکی انتظام کی صورت میں دنیا میں پہلی بار اتنے بڑے پیمانے پر پورٹین تہذیب برپا ہوئی جو ظالمانہ معاشرتی ماحول کے تفکرات سے آزاد تھی، اس نے اپنے داعیانہ قوی کو ایک عظیم دیوہیکل طبعی فضا کی تعمیر میں لگایا جس میں "صحرا" کو متصور کیا گیا تھا۔ میکس ویبر اور ان کے سرخیل ترجمان مالکوت پارسنس نے دقت نظر سے محسوس کیا کہ نجات کی اس تلاش کو ایک ایسا رخ دینا جو "دنیاوی تجرد" کی صورت میں ہو پروٹسٹنٹ کا وہ کارنامہ ہے جس کے ذریعہ اس نے ایک نئی اور محسوس راہ تلاش کی ہے جو معاشرتی تبدیلی کا بہترین آلہ ہے۔ اپنے کو استفادہ کرنے والوں کی صورت میں دیکھنے کے بجائے بحیثیت نگران اور امانت دار کے دیکھنا جسے خدا نے اپنی رضا کی تکمیل کے لیے صحرا میں رکھا ہوا ہے — پورٹیوں اور ان کے اخلاف نے، آج تک نہ صرف، اس شے کو جسے لپیٹ نے بہت مناسب نام دیا ہے —

پتا

پہلی جدید قوم — بلکہ جو درحقیقت پہلی پروٹسٹنٹ قوم تھی — کو خلق کرنے اور پھر اسے دوبارہ خلق کرنے میں بڑی مدد دی ہے۔ امریکہ میں یہودیوں پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"Infact, because of a deep-structure affinity of Calvinist Puritanism for Judaism, it is in America that Jews have increasingly found full Societal and cultural participation and acceptance, symbolised by widespread acceptance in recent years of the term "Judeo-christian." △

ترجمہ:

درحقیقت، کالوینی پیوریتان کی یہودیت کے ساتھ گہری ترکیبی قربت ہونے کے سبب یہ امریکہ ہے جہاں یہودیوں نے روز افزوں طور پر پوری معاشرتی اور ثقافتی شراکت اور قبولیت پائی جو یہودی عیسائیت کے نام سے حالیہ دنوں میں عام مقبولیت کی صورت میں ایک علامت کے بطور تسلیم کی جا رہی ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں:

In brief, I would argue that being Jewish in America has had some very distinctive cultural advantages. First and foremost, the puritans had a deep identification with Israel. The Bible, particularly the Hebrew Scriptures, was constant referent stemming from the puritan identification of themselves as fleeing from Egypt - corrupt civilization - into the land of Canaan, hence the name of the town New Canaan, Connecticut. Shedding civilization and creating a "city on the Hill" meant a repudiation of the false gods and graven images of that civilization. The puritans deemphasized Christian names and Christian holidays associated with Rome, Paganism, or idleness. Thus Christmas was not celebrated, but Thanksgiving, derived from the Jewish harvest festival of Succoth, became the major holiday;

similarly, the puritans extensively used first names taken from the Old Testament in preference to Christian first names.

Second, the esoteric dimension of American civil religion is one in which Freemasonry has played a leading role from the very beginnings of the Republic, to which it has contributed some of the very basic symbols of the American polity, such as the Great Seal of the United States. Many of the leading figures of the independence movement were Masons, and the Declaration of Independence itself as was the case for the French Counterpart, the Declaration of the Human Rights -- is a manifestation of Masonic principles, including Universalism, the equality and brotherhood of all men, and the freedom of conscience. Central to Freemasonry are symbols, rituals, and mythologies that are linked to the Kabbalistic tradition, so, for example, speculative Masonry relates itself to the ancient craft of architecture whom master architect was Solomon, the builder of the Temple, and Freemasonry utilizes that Hebraic rather than the Christian Calender.

In brief, the Masonic dimension of American culture --- a particularly strong but covert presence in American life, especially in the formative period of the country --- provided Jews with important cultural support and legitimation."⁹

ترجمہ

المختصر۔ میں دراصل یہ کہنا اور ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ امریکہ میں یہودی ہوتا بعض نہایت منفرد تمدنی فوائد کا حامل ہوتا ہے۔ ان میں سب سے پہلی اور ابھری بات یہ ہے کہ پیورٹین اسرائیل سے حد گہری وابستگی رکھتے ہیں بائبل اور بطور خاص عبرانی صحائف ان کے یہاں زندگی کا لازمہ ہیں۔ اس کا تعلق پیورٹین شخص سے ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ (ان کا یورپ سے بھاگ کر امریکہ آکر بس جانا) مصر کی

بدطہنت تہذیب سے بھاگ کر ملک کنعان میں بس جانے کی طرح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے آباد کیے شہر کا نام کنیکٹی کٹ رکھا جس کا مفہوم ہے کنعان جدید۔ (بدطہنت) تہذیب کو خیر باد کہنا اور ”شہر جبل“ تعمیر کرنا اپنے آپ میں اس تہذیب کے باطل خداؤں اور تراشے ہوئے بتوں کی تکذیب کرنا ہے۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ امریکی پیوریشنوں نے روم کے عیسائی ناموں اور تہواروں سے خود کو الگ کر لیا اور انہیں بے وقعت بتا دیا جو دراصل ان کی نظر میں شرک اور بے عملیت کی یاد دلاتے تھے۔ یہی سبب ہے (کہ امریکہ میں پیوریشنوں کے ذریعہ) کرسمس نہیں منایا جاتا بلکہ اس کے بجائے ”تشر“ منایا جاتا ہے جو دراصل یہودیت کے فصل کے کٹنے کے تہوار ”شقة“ سے مستفاد ہے۔ یہی سبب ہے بڑا تہوار ہے۔ اسی طرح پیورٹین عہد نامہ عتیق (OT) میں مذکور ناموں کو اپنے نام کے پہلے جز کے اعتبار سے رکھنے کو اس پر ترجیح دیتے ہیں کہ کوئی عیسائی نام رکھیں۔

دوسری بات یہ کہ امریکی سرکاری مذہب کا بری پہلو وہ امر ہے جس میں فری مسزنی نے قائمانہ کردار ادا کیا ہے۔ اسی فری مسزنی نے اس امریکی جمہوریت کو اس کی بنیادی علامت عطا کیں ہیں جو اس ریاست و حکومت کی اساسی علامتیں ہیں۔ مثلاً ریاستہائے متحدہ امریکہ کا عظیم نشان (Seal)۔ امریکہ کی آزادی کے قائدین کی کثیر تعداد فریمسن تھی۔ اس طرح اپنے ہم رتبہ فرانسیسی انقلاب کے اعلان آزادی کی طرح — امریکہ کی آزادی کا اعلان بھی دراصل فری مسزنی اصولیات، مقاصد اور نصب العین کا اظہار تھا جس میں انسانی حقوق (Human Rights) بنیادی ہے۔ اس کے علاوہ عالمگیریت (Universalism)، تمام انسانوں کے مابین مساوات اور اخوت اور آزادی ضمیر اس کے بنیادی اجزاء ہیں۔ ایسی علامتیں، رسوم اور اساطیر کو جن کا تعلق قبائلی (Kabbalistic) روایت سے ہو فری مسزنی میں مرکزی مقام حاصل ہے۔ یہی سبب ہے کہ مثلاً تاملی فری مسزنی خود کو اس قدیم فن تعمیر سے منسلک کرتی ہے جس کا انی ترین ماہر فن تعمیر سلیمان تھا جس نے Temple کی تعمیر کی تھی۔ اسی طرح فری مسزنی عیسائی تقویم کے بجائے عبرانی تقویم پر عمل کرتی ہے۔

المختصر، امریکی تمدن کا فری مسزنی پہلو، امریکی زندگی میں بالخصوص اس ملک کے تشکیلی عہد میں فری مسزنی کی اس میں مضبوط مگر خفیہ موجودگی نے یہودیوں کو امریکہ میں اہم تمدنی حمایت اور قانونی حیثیت فراہم کی ہے۔

(۱) لبرل پروٹسٹنٹ — Congregationalists

۹ فیصد	Presbyterians	
	Episcopalians	
	Unitarians	
	Methodists	(۲) موڈریٹ پروٹسٹنٹ
	Lutherians	
۲۴ فیصد	American Baptists	
	Disciples	
	Reformed	
	Southern Baptists	(۲) کنزرویٹیو پروٹسٹنٹ
	Church of God	
۱۵ فیصد	Pentecostals	
	Assemblies of God	
	and many others	
۹ فیصد		(۲) بلیک پروٹسٹنٹ
۲۵ فیصد		(۱) کیتھولک
۸ فیصد		(۱) دوسرے
۷ فیصد		(۱) غیر متعلق

لیکن امریکی حکومت بنیادی طور پر دوستونوں پر قائم ہے۔ ان میں پہلا ستون ہے :

Conservative (۲) اور Masonic Secular Tradition (۱)

Protestants۔ یوں تو ہر پروٹسٹنٹ یہودیت کا حامی اور اس کا عمل ہے لیکن کنزرویٹیو پروٹسٹنٹ کا مقصد وجود ہی یہودیت کے مقاصد کی تکمیل ہے۔ چنانچہ فریمسنری نے قیام ریاستہائے متحدہ امریکہ کے بعد اس کا کھل کر اعلان کیا کہ امریکہ کا قیام کیوں ہوا ہے؟ ۱۸۲۳ میں انہوں نے اعلان کیا:

"To the Jewish Nations we are indebted for all

that is ancient, judicious and distinct in Masonry. From them under the great I AM, we derive all we know of the history of man and the will of Heaven." *

ترجمہ

فری مسنری میں جو کچھ قدیم، عادلانہ اور منفرد ہے ان سب کے لیے ہم (فری مسنری کے قبعین) یہودی قوم کے مقروض ہیں۔ انہیں یہودیوں سے عظیم 'میں ہوں' کے تحت ہم تاریخ انسانی اور خدا کی مرضی کے بارے میں جو کچھ جانتے ہیں اصل کر رہے ہیں۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد جہاں ایک طرف لبرل اور موڈریٹ پروٹسٹنٹ کی آبادی میں یہودیت اور اسرائیل کے تعلق سے جوش اور حمایت کے باوجود بظاہر کمی آرہی ہے وہیں کنزرویٹو پروٹسٹنٹ میں بحیثیت تعداد اور بلحاظ یہودیت کی حمایت میں انتہا پسندانہ جذبات کا اضافہ ہو رہا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ کے جن چرچوں میں بے حد اضافہ ہوا ہے ان میں بنیادی طور پر کنزرویٹو ہیں اور ان میں بطور خاص (۱) Evangelists اور (۲) Fundamentalist Bodies ہیں۔

Fundamentalist Bodies سے مراد کالونٹ چرچ میں پیدا ہونے والا وہ گروہ ہے جو انجیلی تعبیر کے اس مکتبہ خیال سے تعلق رکھتا ہے جو Dispensation پر یقین رکھتا ہے جس کا Scofield Reference Bible میں سب سے واضح اظہار کیا گیا ہے یعنی انجیل کو بغیر تاویل کے اسی طرح لینا بطور خاص ان امور میں جہاں سرزمین اسرائیل کے تعلق سے پیش گوئیاں کی گئیں ہیں۔ اور یہ کہ وہ پیشین گوئیاں بالیقین پوری ہوں گی۔ اس طرح اس مکتب خیال کو Premillennialist کہا جاسکتا ہے یعنی وہ لوگ جو حضرت عیسیٰ کی آمد اور اسرائیل کے تعلق سے وعدوں کی تکمیل اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر کے منتظر ہیں۔ یہ تمام طبقات بے حد شدید جذبات کے حامل ہوتے ہیں۔^{۱۱}

۱۹۴۰ کے بعد اس کا ایک گروہ جس میں کچھ اعتدال آگیا تھا Evangelical کہلانے

لگا۔

ان Fundamentalist طبقات میں بہت نمایاں گروہ درج ذیل ہیں:

Seventh - Day Adventist (۱)

The Church of Nazarene (۲)

Assemblies of God (۳)

The Salvation Army (۴)

متعدد Pentecostal Groups (۵)

متعدد Holiness Groups (۶)

لیکن اس میں سب سے مشہور Jerry Falwell اور اس کا گروپ Moral Majority (جسے چند سالوں قبل بظاہر ممنوع قرار دے دیا گیا ہے) اور Pat Robertson ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ بے شمار گروہ ہیں جو بنیادی طور پر Fundamentalists میں شمار ہوتے ہیں۔^{۱۲} دوسری جنگ عظیم کے معا بعد پوری امریکی حکومت اور بطور خاص دہائٹ ہاؤس پر جن تین گروہوں کا 'پورا کنٹرول' ہو گیا ہے وہ ہیں (۱) یہودی (۲) فریمسن اور (۳) Fundamentalists۔ اور یہ تینوں طبقات دراصل عظیم اسرائیل کے قیام اور قبۃ الصخرہ اور مسجد اقصیٰ کو ڈھانے اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر کے لیے کمر بستہ ہیں۔ چنانچہ حکومت امریکہ پر ان کے "مکمل کنٹرول" نے ۱۹۷۰ء کے بعد امریکی حکومت کو مسجد اقصیٰ کو ڈھانے اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر کرنے اور عظیم اسرائیل بنانے کے لیے یکسو کر دیا ہے۔ ۱۹۷۶ء کے بعد آنے والا ہر امریکی صدر یا تو خود Fundamentalist ہوتا ہے یا Fundamentalists کی مدد سے دہائٹ ہاؤس میں آتا ہے یا ان کے درمیان اور ان کے اشاروں پر کام کرتا ہے۔ اس لیے کہ White House اور Pentagon پوری طرح انہیں Fundamentalists کے ہاتھوں میں ہیں۔

جمی کارٹر ایک پر جوش اور انتہا پسند Fundamentalist تھا جو ۱۹۷۶ء میں صدر امریکہ منتخب ہوا۔ لطف یہ ہے کہ ۱۹۸۰ء میں امریکی صدارت کے تینوں امیدوار یعنی اینڈرسن، کارٹر اور ریگن — بنیادی طور پر Fundamentalists تھے اور ان میں کارٹر اور اس کے بعد رونالڈ ریگن کے بعد دیگرے Moral Majority یعنی Jerry Falwell کی مدد سے ہی کامیاب ہوئے۔ امریکہ کے ایوان صدر سے لے کر یونیورسٹیوں تک ہر جگہ انہیں

Fundamentalists کا قبضہ ہے۔ ریگن نے امریکہ کو نیا یروشلم New Jerusalem قرار دیا جو صرف اس لیے وجود میں آیا ہے کہ اصل یروشلم آباد ہو جائے۔

اس Fundamentalist گروہ نے عملاً پوری پروٹسٹنٹ دنیا کو ہیجان میں مبتلا کر دیا ہے اور اس طرح پوری پروٹسٹنٹ دنیا امت مسلمہ، عالم اسلام اور اس کے مقامات مقدسہ کو صفحہ ہستی سے مٹا دینا چاہتی ہیں۔ انہوں نے ایک طرف مسجد اقصیٰ کو ڈھانے کا عزم مصمم کر رکھا ہے تو دوسری طرف عالم اسلام کے خلاف ایک صلیبی جنگ چھیڑنے اور عالم اسلام کو کلی طور پر تباہ کر دینے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں۔

۱۹۷۰ کے بعد امریکہ میں ایسے مواد شائع ہونے لگے اور ایسے جذبات کی تشہیر ہونے لگی جو پوری عیسائی دنیا کو عالم اسلام کے خلاف چڑھالانے اور امت مسلمہ کا خاتمہ کر دینے کے مترادف ہیں یہ ایک حقیقت ہے کہ رومن کیتھولک اور بہت سے آرٹھوڈوکس چرچ نے ان جذبات کا کبھی ساتھ نہیں دیا اور اس طرح کے جذبات کی اشاعت کرنے والے پروٹسٹنٹ ہی واقع ہوئے ہیں اور ان میں کنزرویٹو پروٹسٹنٹ اور ان کے Fundamentalist گروہ پیش پیش ہیں۔ لیکن بایں ہمہ اس کا خطرہ بڑھتا جا رہا ہے کہ یہودی سازش اس اعتبار سے کامیاب ہو جائے کہ مسلمان اور عیسائی باہم صلیبی جنگ میں مبتلا ہو جائیں اور وہ ان کے ذریعہ مسجد اقصیٰ کو تباہ کرا کے اسی طرح اپنا کام پورا کرالے اور الزام دوسروں کے سر ہو جس طرح آج سے دو ہزار سال قبل انہوں نے اپنے علم کی حد تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب دے ڈالا اور سارا الزام رومی حکومت کے کاندھوں پر ڈال دیا۔

۱۹۷۰ء میں سب سے پہلے ہال لینڈ سے Hall Lindsey کی کتاب The Late Great Planet Earth شائع ہوئی جس نے ایک طرف عیسائیوں کو حضرت عیسیٰ کی آمد کی یاد دلا کر خدائی حکومت کے قیام اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر پر ابھارا تو دوسری جانب مزاحم قوتوں یعنی مسلمانوں کے خلاف جذبات براہیختہ کیے۔^{۱۳}

انہیں دنوں تھامس میک کال اور زولا لیوٹ (Thomas McCall & Zola Levitt) کی کتاب Satan in the Sanctuary شائع ہوئی جو اسی طرح کے خیالات سے بھری ہوئی تھی۔^{۱۴}

۱۹۸۷ میں میک کال اور لیوٹ کی دوسری کتاب The Coming Russian Invasion of Israel شائع ہوئی۔^{۱۵}

یہ بات محض جذبات کے اظہار اور انہیں بھڑکانے تک محدود نہیں بلکہ ان Fundamentalists نے — جنہیں دراصل Dispensationalist کہنا زیادہ بہتر ہے — لوگوں کو مسجد اقصیٰ کے ڈھانے اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر کرنے اور مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے منادینے کی عملی کوشش شروع کر رکھی ہے اور وہ بھی نہایت بڑے پیمانے پر۔ ان میں سے صرف ایک گروہ یعنی Jerry Falwell کی صرف ایک کارروائی کی وسعت سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کام کتنے بڑے پیمانے پر انجام دیا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے یہ سارا کام عیسائی نمایہودی اصل یہودیت کے اشارے پر انجام دے رہے ہیں۔ چنانچہ مارچ ۱۹۸۵ء میں مائیامی (Miami) میں ایک راسخ العقیدہ ربانی اجتماع (Conservative Rabbinical Assembly) کو خطاب کرتے ہوئے Jerry Falwell نے یقین دلایا اور اس کا حلف لیا کہ وہ ۷۰ ملین کنزرویٹو عیسائیوں کو اسرائیل کی بقاء، مسجد اقصیٰ کے ڈھانے اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر کے لیے متحرک کرے گا۔ چنانچہ Falwell اس عہد کے بعد ساری دنیا سے عیسائیوں کے ایسے Tour کا انتظام کرنے میں منہمک ہو گیا تاکہ عیسائی ان کے خرچ پر یروشلم جائیں اور تعمیر ہیکل سلیمانی کے اس کار کے لیے اپنی قربانی پیش کریں۔ اسی مجلس میں تقریر کرتے ہوئے اس نے کہا تھا:

"Theologically, all Christians have to support Israel If we fail to protect Israel, we will cease to be important to God."

ترجمہ:

عقیدے کے اعتبار سے ہر عیسائی پر فرض ہے کہ وہ اسرائیل کی حمایت کرے۔..... اگر ہم اسرائیل کی حفاظت کرنے میں ناکام ہوتے ہیں تو ہماری اللہ کے نزدیک کوئی اہمیت باقی نہیں رہے گی۔

ابھی حال ہی میں Grace Halsell کی کتاب

"Forcing God's Hand: Why Millions Pray for a Quick Rapture And Destruction of Planet Earth."

شائع ہوئی ہے جس نے بڑی خطرناک صورت حال کا نقشہ کھینچا ہے۔ واضح ہو کہ

Halsell (ہالسل ہاؤس میں ایک اونچے عہدے پر فائز ہیں اور انہوں نے بھی Jerry Falwell کے ساتھ یرد شلم کا سفر کیا ہے۔

Halsell کا کہنا ہے کہ Fundamentalist گروہ اب تقریباً بے قابو ہو گئے ہیں اور وہ کسی لمحے قبۃ الصخرہ اور مسجد اقصیٰ کو ڈھادیں گے۔ اس دوڑ میں کبھی گروہ ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے لیے کوشاں ہیں۔ خواہ وہ Jerry Falwell ہوں یا Pat Robertson یا Hal Lindsey یا Tim Laflaye۔^{۱۲}

یوں تو پچھلے تیس سالوں سے تقریباً ہر مہینے ایک ایسی کوشش ضرور ناکام بنا دی جاتی ہے جس کا مقصد مسجد اقصیٰ یا قبۃ الصخرہ کو تباہ کر دینا ہو۔ لیکن اب تک یہ کوششیں بیشتر شدت پسند یہودی تنظیموں کی جانب سے ہی ہوتی تھیں۔ یہ پہلی بار ہے کہ عین القدس کے اندر ایک ایسی کوشش سامنے آئی ہے جن میں Dispensationalist عیسائیوں کا ہاتھ تھا۔ یہ کوشش اور اس کی تفصیلات بے حد سنگین ہیں۔

چنانچہ دوسرا سوال جو سبب بنا اس تجزیہ کا وہ یہ ہے: کیا احادیث میں مذکورہ غزوہ روم، المکملہ، غزوہ نصاریٰ اور غدر روم کے وقوع پذیر ہونے کے سلسلے کا آغاز ہو گیا ہے؟ کیا

تیسرا سبب: یہودی تخریبی عزائم

اس تجزیہ کے تیسرا سبب ہے:

(۱) شدت پسند یہودی تنظیموں — گش ایمونیم (Gush Emonim) — تہیہ (Tehiya)، اور ای طرح ۱۰۰ سے زائد یہودی تنظیموں یا ان کی ذیلی تنظیموں کے خفیہ دستوں کا Rabbi Shlomo Chaim، Yisrael Meida، Stanley Goldfoot، Yehuda Etzion، Hacoheh Avnir جیسے خطرناک دہشت گردوں کی سربراہی میں کسی لمحے مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کو تباہ کرنے کے کام کو روبہ عمل لے آنے کے درپے ہونا۔ (۱۹۹۹ء)

(۲) ۱۹۷۹ء سے پاکستان کو جوہری تکنالوجی حاصل کر کے جوہری ہتھیار سے مسلح ہونے

سے روکنے کے چلے آرہے اقدامات اور دوروں کے آخری سلسلے کے بطور ریاستہائے متحدہ امریکہ کی آخری ذمہ دار شخصیت اور وہاں کی فوج کے سپریم کمانڈر کی حیثیت سے صدر امریکہ بل کلنٹن کا بنفس نفیس پانچ گھنٹوں کے لیے پاکستان کا دورہ کرنا اور پاکستان کو تباہ کر دینے کی دھمکی دینا اور اس کے بعد اسے، خلاف عسکری کارروائی کا درپردہ آغاز کر دینا (۲۵ مارچ ۲۰۰۰ء)

(۳) امریکہ کی نگرانی میں اسرائیل اور فلسطینیوں کی بات چیت کا عملاً ناکام ہو جانا اور حکومت اسرائیل کا دو سے پانچ ماہ کے اندر اپنے مقاصد کے حصول کے لیے غیر معمولی اقدام کرنے کا عزم کر لینا۔

(۲۰ اپریل ۲۰۰۰ء)

(۴) اور اس منصوبے پر عمل درآمد کو یقینی بنانے کے لیے پہلے اقدام کے بطور اچانک غیر معمولی طور پر لبنان سے اپنا ۲۰ سالہ قبضہ ختم کر کے اپنی فوجوں کو از خود واپس بلا لینا۔
(۲۳ مئی ۲۰۰۰ء)

(۵) بظاہر بلا سبب اچانک سری لنکا میں جنگ کا تیز ہو جانا اور اس کے بہانے سری لنکا کے اسرائیل سے سفارتی اور عسکری تعلقات کے بحال ہونے کے ساتھ ساتھ سری لنکا میں اسرائیل کی فوجی موجودگی کا قائم ہو جانا اور ٹھیک انہیں دنوں امریکی بحری بیڑے کا وہاں آ جانا اور اب سری لنکا کے ساحلی حدود سے اسرائیل کا اپنے درمیانی فاصلے تک مار کرنے والے جوہری کروڑ میزائل کا تجربہ کرنا۔ (۲۰ جون ۲۰۰۰ء) جس کے پس منظر میں اس صورت حال کا حقیقت بن جانا کہ پورا عالم اسلام — مراکش سے منڈاناؤ تک تین جگہوں پر Sandwich کر دیا گیا ہو اور بطور خاص جنوب ایشیا اور جنوب مغربی ایشیا میں پائے جانے والے ملکوں پاکستان، ایران اور افغانستان کو باقی مسلم دنیا سے کاٹ کر خلیج فارس اور بحیرہ عرب کے مغربی کناروں کے مابین مقید کر دیا گیا ہے۔
(۲۶ مئی ۲۰۰۰ء)

(۶) روس کا اچانک اعلان کر دینا کہ وہ افغانستان پر حملہ کر دے گا اور عملاً اس کی تیاریاں شروع کر دینا۔ (۲۳ مئی ۲۰۰۰ء)

چنانچہ یہ صورت حال بے حد خطرناک اور سنگین مستقبل کا پتہ دے رہی ہے۔ یہ سارے واقعات وقتی اور اتفاقی نہیں ہیں۔ بلکہ ایک طویل تسلسل کے آخری مرحلے کی کڑیاں ہیں۔

یسعیاہ رکوع: ۲ میں ذکر کیا گیا:

”آخری دنوں میں ایسا ہو گا کہ یہو ا کی عمارت کا پہاڑ تمام پہاڑوں پر مستحکم کیا جائے گا۔ اور تمام پہاڑیوں سے زیادہ بلند کیا جائے گا۔ اور ہر قوم کے لوگ موج کی طرح اس کی جانب چلیں گے۔ اور بہت ملکوں کے لوگ آئیں گے اور آپس میں کہیں گے آؤ! ہم یہو ا کے پہاڑ پر چڑھ کر یعقوب کے خدا کے گھر میں جائیں۔ تب وہ ہمیں اپنا راستہ دکھائے گا اور ہم اس کے راستے پر چلیں گے۔ کیونکہ یہو ا کا انتظام صیہون سے اور اس کا کلام یروشلیم سے نکلے گا۔ وہ قوموں کا فیصلہ کرے گا اور قوموں کے جھگڑوں کا فیصلہ کرے گا۔ اور وہ اپنی تلواریں پیٹ کر بل کے پھل اور اپنے نیزوں کو ہنسیا بنائیں گے۔ تب ایک قوم دوسری قوم کے خلاف تلوار نہیں چلائے گی نہ لوگ مستقبل میں جنگ کا فن سیکھیں گے۔“ (Isaiah ۲:۲-۴)

یہ پیشین گوئی ایک حقیقت ہے لیکن یہودیوں نے شیطان سے تحالف اور خدا کے دشمن ہو جانے کے بعد اس کا دوسرا ہی مطلب لیا ہے۔ اور ایسا کرنا ان کی مجبوری تھی۔ یہ پیشین گوئی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے ہے اور یہودی ان کی آمد سے کئی صدیوں قبل اللہ رب العزت کے بھیجے جانے والے مسیح کے دشمن اور ابلیس کی جانب سے بھیجے جانے والے مسیح الدجال کے منتظر ہو چکے تھے۔ لہذا جب اللہ رب العزت کے ارسال کردہ مسیح تشریف لائے تو انہوں نے اپنے علم کی حد تک انہیں مصلوب کر کے ابلیس کے مسیح کے لیے راستہ صاف کرنا چاہا اور اب وہ اس مسیح کا انتظار کر رہے ہیں جو دراصل ابلیس کا ارسال کردہ مسیح ہو گا یعنی مسیح دجال۔ ظاہر ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اب وہ خدا کے دشمن ہیں۔ اور خدا ان کا دشمن لہذا اب ان آیات کی اس تشریح کی کوئی گنجائش نہیں جس کی یرمیاہ ۲۳:۵-۶ (Jeremiah: 23:5-6)

اور ملائگی ۲۳:۳ (Malachi, 3:23) میں خبر دی گئی تھی۔ یہودیوں نے اللہ کے ارسال کردہ مسیح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو سلوک کیا اور ان یہودیوں کو ان کے اس سلوک سے جس کا پورا پورا اندیشہ تھا بار بار باخبر اور متنبہ کیا گیا جیسا کہ (Sanhadrin 97 b) میں آیا ہے:

”اگر اسرائیلیوں نے توبہ کی تو انہیں معاف کر دیا جائے گا۔ اگر نہیں، تو الواحد القدوس ان کے اوپر ایک ایسا بادشاہ مسلط کر دے گا جس کے فیصلے ہامان کے فیصلوں سے زیادہ شدید ہوں گے تب جا کر شاید وہ توبہ کریں اور ممکن ہے انہیں معاف کر دیا جائے۔“

حضرت مسیح علیہ السلام تشریف لائے اور یہودیوں نے وہی کیا جس کا اندیشہ تھا لہذا اللہ نے ان پر (Titus (70A.D) کو مسلط کر دیا۔ جس نے ہیکل سلیمانی کو ڈھا دیا، یہودیوں کا قتل عام کیا اور ہمیشہ کے لیے انہیں بیت المقدس سے نکال دیا۔ Titus کے ذریعہ دربدری کے بعد ساری دنیا میں یہودی ۱۹۲۸ء میں قیام اسرائیل سے قبل تک پورے ۱۹۰۰ سال مارے مارے پھرتے اور ہر جگہ فساد پھیلاتے رہے۔ چونکہ یہودی رب العزت کے مسیح کی آمد سے سینکڑوں سالوں قبل ہی ابلیس کے مسیح کے لیے یکسو ہو چکے تھے لہذا اب ان کی دل بستگی کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ حضرت مسیح کے تعلق سے دی گئی خبروں کو مسیح دجال پر منطبق کریں اور اللہ کے ذریعہ القدس کی آباد کاری اور حضرت مسیح کے ذریعہ قائم ہونے والے نظام عدل کے بجائے ابلیس کے مسیح دجال کے لیے یروشلم کو مفسدانہ کارروائیوں کے لیے آباد کریں، مسیح دجال کے لیے ہیکل سلیمانی کی تعمیر کریں اور اس کی آمد سے قبل اس مجسم فساد کے لیے ”نظام عدل“ قائم کریں۔

چنانچہ Titus کے ذریعہ قتل عام کے بعد اس کوشش کا باضابطہ آغاز ہو گیا اور یہودیت کے اس وقت (132-135A.D) کے سب سے بڑے ربی ربی عقبہ (Rabbi Akiva) نے برکوجہ (Bar Kochba) کو سلطنت روم کے خلاف مسلح بغاوت کرنے اور بزور ہیکل سلیمانی تعمیر کرنے کے لیے آگے بڑھایا۔

سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں اس خیال نے پوری شدت اختیار کر لی کہ کس طرح ساری دنیا کی حکومتوں کو چیلنج کرتے ہوئے اور بطور خاص خلافت عثمانیہ کو نیست و نابود کر کے یروشلم کو آباد کیا جائے اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر کی جائے۔ ہمد زرم کو بعل شیم تو دے اور حبہ اسرائیل کو ربی یہودا الکلائی اور زیوی حرش کلیر نے آگے بڑھایا یہاں تک کہ ۱۸۹۷ء میں صیہونی تنظیم کا آغاز ہوا جس کا بانی بظاہر تھیوڈور ہرنزل (Theodore Hertzl) تھا لیکن جس کے پس پردہ حاتم لوریے (Haim Lorji) ربی ایلیاہ گت ماخر (Rabbi Elijah Guttmacher) اور موسیٰ جس (Moses Hess) جیسے احبار و روحانیین کا ہاتھ تھا۔

۱۹۲۸ء تک یہودی پاگل ہو چکے تھے۔ چنانچہ جنوبی افریقی نژاد یہودی Stanley Goldfoot جس کا ذکر ماقبل کیا گیا وہ شخص ہے جو ۱۹۳۰ء میں فلسطین منتقل ہوا اور یہی وہ شخص

ہے جس نے ۲۲ جولائی ۱۹۴۶ کو مسجد اقصیٰ کے قریب واقع King David Hotel کو جہاں فلسطین کے انتداب کا برطانوی سکرٹریٹ اور فوجی ہیڈ کوارٹر قائم تھا ڈائنامیٹ سے اڑا دیا جو دراصل پہلا قدم تھا ریاست اسرائیل کے قیام کے لیے قوت کا استعمال کا۔

یہ وہی Goldfoot ہے جس نے Stern Gang نامی تنظیم بنائی جس نے فلسطین میں مسلم عورتوں اور بچوں کا بے دردی سے ایسا قتل عام کیا کہ ڈیوڈ بن گورین جیسے مفسد اور متشدد یہودی نے بھی اس کی مذمت ان الفاظ میں کی: ”یہ وہی سلوک ہے جو نازیوں نے کیا تھا“ اور اس تنظیم کو خلاف قانون قرار دے دیا۔

۱۹۶۷ء کے بعد تو ہر مہینے کوئی ایسی کارروائی پکڑی جاتی ہے جس کا مقصد مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کو ڈھارینا ہے لیکن اس عرصے میں (۱۹۶۷-۱۹۹۹) ایسی ۱۰۰ سے زائد کوششیں ہوئیں کہ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی کوشش کامیاب ہو جاتی تو یہ سارے عتبات تباہ ہو جاتے۔

رابرٹ آئی فریڈمین (Robert I. Friedman) نے The Village Voice کے ایک شمارہ میں (۱۹۸۵) میں لکھا:

”مسجد اقصیٰ کا ایک ماڈل تیار کیا گیا، تباہ کرنے کی میقات اور طریقوں کو متعین کیا گیا اور صحرا میں Explosions کا تجربہ کیا گیا۔“ اسرائیلی فوج کے انجینئر کور کے ایک کمانڈر مناحم لونی (Menachem Livni) نے اس کا تجربہ کیا کہ:

”جب مسجد اقصیٰ ڈائنامیٹ سے اڑائی جائے گی تو وہ کس جانب گرے گی اور

انکے ٹکڑے کتنی دور تک اور کس طرح گریں گے۔“

واضح ہو کہ یہ تجربے دراصل اس نزاکت کو دیکھتے ہوئے کئے جاتے رہے ہیں کہ وہیں بالکل ملحقہ وہ حصے بھی ہیں جو یہودیوں کے لیے متبرک ہیں مثلاً دیوارِ گریہ۔

اس تجربے کے بعد انہوں نے عملی اقدامات کیے مگر گرفتار کر لیے گئے۔ ان میں سے ایک دہشت گرد Yehuda Etzion نے عدالت کو بتایا:

”چونکہ اسرائیلی حکومت مسجد اقصیٰ کو اب تک گرانے میں ناکام رہی ہے اس لیے اس نے سوچا کہ اسے خود ہی اس کام کو انجام دے دینا چاہیے۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ میں بالکل معصوم ہوں۔ اس لیے کہ مسجد اقصیٰ کو ڈھادینا جرم نہیں کار خیر عظیم ہے۔“

ہر چند کہ عدالت نے اسے معمولی سزائیں دیں جسے فوراً بعد صدر اسرائیل نے معاف کر دیا۔

ان تمام یہودی دہشت گرد گروہوں کو امریکہ کے یہودی اور Dispensationalists عیسائی کروڑوں ڈالر کی سالانہ امداد دیتے ہیں۔ ۱۹۹۹ء میں جب ڈینور گروپ نے مسجد اقصیٰ کو ڈھانے کی کوشش کی تو اسرائیل کے ربی اعظم نے نہ صرف یہ کہ اس کی مذمت نہیں کی بلکہ اس پر اطمینان کا اظہار کیا۔ شاید اس لیے کہ اسرائیل کے قیام کے بعد اس کے تمام بڑے ربی خود اس کار خیر میں عملاً حصہ لیتے رہے ہیں۔ چنانچہ ربی شلومو گورین (Rabbi Shlomo Goren) جو اسرائیل کا ربی اعظم بنا دراصل وہی شخص ہے جس نے اگست ۱۹۶۷ء میں مسجد اقصیٰ میں اپنے پیچاس مسلح سرائیکیوں کے ساتھ گھس کر اسے اڑانے کی کوشش کی تھی۔

مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کو ڈھانے پر متعین تمام دہشت گرد تنظیموں اور بطور خاص Gush Emonim کو سب سے زیادہ امداد حکومت امریکہ کے خزانے سے ملتی ہے۔^۱ یہودیوں نے اس کا خوب اندازہ لگایا ہے کہ ان کے کسی ایسے عمل کا کیا نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہارورڈ سینٹر فار انٹرنیشنل افیئرز کے اس سرورے کا ذکر کرتے ہوئے ٹیڈی اراں نے لکھا تھا:

”زیر زمین“ کے سربراہوں نے اندازہ لگایا ہے کہ اس ”کریہہ عمل“ (مسجد اقصیٰ) کو بم سے اڑا دینا دنیا کے کروڑوں مسلمانوں کو جہاد کے لیے برپا کر دے گا جو بالآخر پوری انسانیت کو معرکہ المعارک میں جھونک دے گا۔ اس معرکہ المعارک کو انہوں نے جوج و ماجوج کی جنگ سے تعبیر کیا ہے جس کے کائناتی روحانی اثرات مرتب ہوں گے۔ آگ کی اس مطلوب آزمائش سے اسرائیل کا فاتح برآمد ہونا زمین پر مسیح کی آمد کی راہ ہموار کرے گا۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ پوری اسرائیلی قوم مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کے انہدام کے سرسام میں مبتلا ہو چکی ہے۔ اسرائیل کی سڑکوں پر گھومتے ریوں کا یہ نعرہ عام طور پر ہر جگہ سنائی دے سکتا ہے:

”ہم اسی وقت مسیح کو چاہتے ہیں!“
مائش — مائش — ابھی، اسی وقت۔

ظاہر ہے اس صورت حال میں کسی ہولناک حادثے کا اندیشہ کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اب جب کہ اچانک اسرائیلی فوجوں نے لبنان سے انخلاء کر دیا ہے۔ تو کیا پوری طاقت اور تمرد کے ساتھ اور ساری دنیا کی مسلمان حکومتوں اور امت مسلمہ کی آنکھوں کے سامنے اور ان کی مخالفت کے باوجود مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کے ڈھانے کی کارروائی اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر اور عظیم ریاست اسرائیل کے بنانے کا آغاز ہونے والا ہے اور اس کے نتیجے میں:

کیا الملحمۃ الکبریٰ یا العظمیٰ کے وقوع پذیر ہونے کے سلسلے کا آغاز ہو گیا ہے؟
اور اگر ایسا ہے تو کیا ظہور دجال کے پیش خیمے ایستادہ ہونے لگے ہیں؟ اس لیے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا:

الملحمة الكبرى وفتح قسطنطينية وخروج الدجال في سبعة اشهر (رواہ ابوداؤد)

ترجمہ: الملحمۃ الکبریٰ اور فتح قسطنطنیہ اور خروج دجال سات مہینوں میں ہوگا۔

آپ نے مزید فرمایا:

بين الملحمة وفتح المدينة ست سنين ويخرج المسيح الدجال في السابعة (ابوداؤد)

ترجمہ: الملحمۃ اور فتح مدینہ کے مابین چھ سالوں کا وقفہ ہوگا اور مسیح دجال ساتویں میں نکلے گا۔

چوتھا سبب : عالم اسلام پر ہمہ جہت حملہ

اس تحریر کا چوتھا سبب ہے برصغیر میں امت مسلمہ پر عالمی قوتوں کا حملہ۔

پہلا محاذ اس ہمہ جہت حملے کے دو بنیادی پہلو یا محاذ ہیں۔ اہل مغرب کا گزشتہ ۳۰ سالوں میں اس بات پر اتفاق ہے کہ فی زمانہ عالم اسلام میں سب سے بیدار مغز اور مغرب کے تناظر میں ذہین مسلمان برصغیر میں پائے جاتے ہیں چنانچہ برصغیر کی امت مسلمہ فی زمانہ مسلمانان عالم کے دماغ کی طرح کام کر رہی ہے۔ چنانچہ ایسا لگتا ہے کہ ان قوتوں نے اس خطے کی امت پر براہ راست دھاوا بول دیا ہے۔

اکتوبر ۱۲ (۱۹۹۹ء) کو ایسا محسوس ہوا کہ بڑی چابک دستی سے عالمی فریمسٹری نے پاکستان کا اقتدار اپنے زیادہ معتمد لوگوں کے حوالے کر دیا۔ یوں تو وہ ملک ابھی تک اس قیامت خیز صورت حال سے باہر نہیں نکل سکا ہے لیکن ابتدائی ۲۰۰ گھنٹے بڑے ہولناک تھے۔ جب ایک ذہین طبقہ لائی گئی تبدیلی پر ۱۴ ام کی جانب سے غیر متوقع حمایت کو دیکھ کر بے قابو ہو گیا اور فریمسٹری کے رمزیہ الفاظ، کنایوں اور استعاروں کا علانیہ استعمال کرنے لگا۔ بلاشبہ ۲۰۰ گھنٹوں کے بعد اس میں تبدیلی آنا شروع ہو گئی لیکن اب وہی الفاظ اور کنائے زیادہ مہارت کے ساتھ سیکولر پیرایوں اور Overtone کے ساتھ استعمال ہونے لگے جو اب تک بعض اسلامی کلمات کے لاحقے اور سابقے کے ساتھ جاری ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ تقسیم ہند سے اب تک وہاں ایک چھوٹی مگر بے حد موثر لابی ضرور پائی جاتی رہی ہے جو نہایت اہم فیصلے کرنے کے مقام پر فائز چلی آرہی ہے اور ضرور بے فیصلے ملتی ہے اور باسانی مخلصین کو outwit کر دیتی ہے۔

اس سے الگ ہٹ کر عوامی سطح پر ایسا لگتا ہے کہ سرکاری اور غیر سرکاری عالمی قوتوں نے مسلمانوں کی ترقی کے نام پر اس امت کو اس کے اسلامی حصار سے نکال کر اس کی تعلیم، آداب، معاشرت اور معیشت کو عالمی اور باطلانہ نیٹ ورک کا پرزہ بنانے کے لیے حملہ بول دیا ہے۔ یوں تو یہ کوشش ایک ایسے دیو کے مانند ہے جس کے سو سے زائد سر ہیں اور اس میں پایا جانے والا ہر چہرہ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اس کوشش کے ذریعہ کبھی اکیسویں صدی کے نام پر، کبھی ترقی کے نام پر اور کبھی دوسری قوموں سے مسابقت کے نام پر برصغیر کے مسلمانوں کو Cyberspace سے جوڑنے کی اور انہیں اس Electronic Superhighway پر کھڑا کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ سوال اس اچانک پیدا ہونے والے بے قابو جذبہ خیر خواہی کا نہیں بلکہ اس کا ہے کہ اچانک اس مہم میں کود پڑنے والے مسلمان شرفاء کو اہل مغرب کی تائید حاصل ہے اور اس کے لیے مبینہ طور پر نظیر و سائل مہیا کیے جانے کی خبر عام ہے اور یہ شرفاء والہانہ طور پر قوم کو راہ پر لانے کے لیے نکل پڑے ہیں۔ بیسویں صدی کی ابتداء سے نمودار ہونے والی امت مسلمہ کے مابین یہ مخلوق کسی ریکارڈ پلیئر (Record Player) سے ملتی جلتی ہے۔ بے حس، بے شعور مگر اپنے تفویض کردہ کام میں مستعد۔ چنانچہ اہل مغرب کبھی ایک کیسیٹ لگا دیتے ہیں اور کبھی دوسرا۔ یہ پلیئر ہر کیسیٹ عموماً سے بجاتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ دوسری جنگ عظیم کے بعد اہل مغرب۔ نہ انہیں

دو ٹیموں میں بانٹ دیا اور ان میں دو طرح کے کیسٹ لگا دیئے۔ ایک میں کینس (Keynes)، آر تھر کوئسٹر (Arthur Koestler) اور فرائیڈ (Freud) کے نغمے گائے جا رہے تھے تو دوسری طرف دوسرا کیسٹ چیخوف (Chekhov) آسکر لانگے (Oscar Lange) اور مارکس (Marx) کے نغمے بجا رہا تھا۔ ایک طرف منصوبہ بند معیشت (Planned Economy) کی تو دوسری طرف غیر منصوبہ بند معیشت (Unplanned Economy) کی دھنیں بج رہی تھیں۔ لیکن دونوں نغموں کا خاتمہ ہیوی انڈسٹریز پر ہوتا تھا۔ اب اچانک پرانے کیسٹوں کا بجانا روک دیا گیا اور نئے کیسٹ لگا دیئے گئے۔ چنانچہ Protectionism کی جگہ Liberalisation کے اور قومی معیشت (National Economy) کی جگہ Globalization کے نغموں کے کیسٹ بجنے لگے اور یہ پلیئر اسی شان بے خودی سے پھر اپنے کام میں لگ گئے ہیں۔ نہ کل ان کی سمجھ میں آیا تھا کہ IMF اور IBRD کیا ہیں نہ آج وہ اس کا شعور رکھتے ہیں کہ ان کی Restructuring کا مفہوم کیا ہے؟ ابھی وہ سانس بھی نہیں لے پائے تھے کہ انہیں IT (انفارمیشن ٹیکنالوجی) کا نیا کیسٹ دے دیا گیا ہے اور ان کی۔ بے خودی اور وار فنگی دیدنی ہے؟

قبضہ شمشیر سے ہے باہر ہے دم شمشیر کا

پاکستان اور بھارت میں مسلمانوں کے لیے یہ کام سرکاری اور غیر سرکاری دونوں ہی سطحوں پر ہو رہا ہے۔ پاکستان میں یہ کام سب سے منظم طریقے سے اس وقت خود سرکار کے ذریعہ ہو رہا ہے اور بھارت میں غیر سرکاری طور پر ایسی ایجنسیوں کے ذریعہ جن میں مسلمان پیش پیش ہیں۔

پاکستان میں اس طرح کی منظم ترین کوشش نادرا (NADRA) کے ذریعہ ہو رہی ہے جو حال ہی میں قائم کی گئی ہے۔ عہد حاضر میں کسی بڑے سے بڑے نیوٹرون بم کے انسانی آبادی پر گرانے سے زیادہ خطرناک یہ کام ہے۔ یہ ایک دودھاری تلوار ہے۔ اس سے قوم کی فلاح بھی ہو سکتی ہے اور منٹوں میں اسے ذبح بھی کروایا جاسکتا ہے۔ جب تک قوم کو تین باتوں کی کما حقہ یقین دہانی نہ کرا دی جائے یہ عمل قومی خود کشی کے مترادف تصور کیا جائے گا۔ شاید عالمی تناظر میں (NPT & CTBT) پر دستخط کرنے سے زیادہ خطرناک — وہ تین باتیں درج ذیل ہیں:

(۱) اس ڈیٹا بیس کو اہم ترین رازوں کی طرح راز رکھا جائے گا اور کسی بھی چور دروازے سے یہ اجازت یا بلا اجازت عالمی کمپیوٹر نیٹ ورک (Computer Network) میں اسے مندرج (Down Load) نہیں کیا جاسکے گا۔

(۲) راز رکھنے کی یقین دہانی کرانے والے کیا اپنے وجود اور بقا کی یقین دہانی کر سکتے ہیں کہ وہ ہمیشہ اس عہد کو پورا کرنے کے لیے قانونی شخص (Legal Person) کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے باقی رہیں گے۔

(۳) انہوں نے ایسے کیا کیا اقدامات کیے ہیں جن کے ذریعہ بالواسطہ یا غیر معلوم طور پر اس ڈیٹا بیس کو کوئی عوام دشمن اپنے مقاصد کے لیے استعمال نہ کر لے یا کسی کو منتقل نہ کر دے۔

ہندوستان میں صورت حال کم تشویشناک نہیں۔ دہلی سے شائع ہونے والے ایک اردو اخبار میں شائع شدہ ایک خبر سے موجودہ صورت حال کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

”نئی دہلی ۲۶ جون ۲۰۰۰ — (سہارا خبر رسد رضا)

”جامعہ ہمدرد (دہلی)، جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی)، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، سینٹرل دفق کونسل، ہمدرد ایجوکیشنل سوسائٹی، انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر اور مولانا آزاد فاؤنڈیشن کی جانب سے ۲۷ جون کو صبح دس بجے اطلاعی ٹکنالوجی انقلاب اور تعلیمی لحاظ سے پسماندہ اقلیتوں سے متعلق ایک سیمینار کا ہمدرد کنونشن سینٹر ہمدرد منگر، تعلق آباد نئی دہلی میں افتتاح ہو گا۔

اس دو روزہ سیمینار کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالنے کے لیے آج انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر لودھی روڈ نئی دہلی میں جناب سید حامد، جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب شاہد مہدی جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر جناب سراج حسین اور انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے ڈائریکٹر جنرل موسیٰ رضوانے شرکت کی۔

اطلاعی ٹکنالوجی انقلاب اور اقلیتوں، کے موضوع پر جناب موسیٰ رضوانے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ مستقبل قریب میں زندگی کا ہر شعبہ اطلاعی ٹکنالوجی سے متاثر ہو جائے گا۔ اور ہر ٹیلی ویژن انٹرنیٹ سے جڑ جائے گا۔ آنے والی دودھائیوں میں روزگار کے بیشتر دروازے اطلاعی ٹکنالوجی ہی کھولے گی۔ کمپیوٹر اور اطلاعی ٹکنالوجی میں ۲۰۰۸ تک تقریباً ۲۲ لاکھ اسامیاں نکلیں گی۔ اس میدان میں ہندوستانی ماہرین کی مانگ بیرون ملک بھی بہت زیادہ ہے۔ جرمنی، اٹلی، اور دیگر کئی یورپی ممالک میں اس ٹکنالوجی

کے ہندوستانی ماہرین کو قدر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

جامعہ ہمدرد کے چانسلر جناب سید حامد نے کہا کہ پہلی بار ہندوستان کے سات اہم تعلیمی ادارے اطلاعیاتی ٹکنالوجی انقلاب اور اقلیتوں کے بارے میں دوروزہ سمینار کر رہے ہیں۔ اور یہ ایک اچھی علامت ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر جناب شاہد مہدی نے کہا کہ یونیورسٹیاں اطلاعیاتی ٹکنالوجی انقلاب کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کر سکتی ہیں۔ اس لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں گریجویٹ سٹڈیز پر کمپیوٹر خواندگی کو لازمی بنانے کی تجویز پر ہم غور کر رہے ہیں۔ جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر جناب سراج حسین نے اس سلسلہ میں کہا کہ حکومت کے ساتھ ساتھ دانشوروں کو عوام میں کمپیوٹر سے متعلق بیداری پیدا کرنے میں اہم رول ادا کرنا ہو گا۔ اور یہ بتانا ہو گا کہ کون سا کورس طلباء اور طالبات کے لیے بہتر ہے۔ یہ دوروزہ سمینار اسی سمت میں ایک کوشش ہے۔ جہاں تک اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کا تعلق ہے تو مدارس بھی اس سلسلہ میں اہم رول ادا کر رہے ہیں اور اطلاعیاتی ٹکنالوجی انقلاب کو آگے بڑھانے نیز مسلمانوں کو اس ٹکنالوجی میں مہارت فراہم کرانے میں اہم رول ادا کریں گے۔ مسٹر موسیٰ رضا کے مطابق ۲۰۰۸ء تک اطلاعیاتی ٹکنالوجی کے تقریباً ۲۲ لاکھ تربیت یافتہ افراد کی متوقع ضرورت کے پیش نظر سالانہ دو لاکھ پچتر ہزار ایسے افراد کی مانگ ہو گی۔ اگر مسلمان اپنی آبادی کے تناسب سے بھی اس شعبے میں اپنی شرکت درج کرانا چاہیں تب بھی انہیں اپنے ۳۸ ہزار طلباء کو سالانہ تربیت دینا پڑے گا۔ لہذا اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کو اس ٹکنالوجی کی جانب خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔“

(روزنامہ راشٹریہ سہارا، دہلی ۲۷ جون ۲۰۰۰ء)

اسی تعلق سے ایک دوسری خبر کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

سہارنپور۔ ۲ جولائی ۲۰۰۰ء سہارا خبرر شاہد زبیری۔

”ہمدرد یونیورسٹی دہلی کے چانسلر اور مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر و ممتاز دانشور سید حامد نے مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی اور بگڑتی ہوئی خاندانی صحت پر تشویش اور تاسف کا اظہار کیا ہے اور اس کے لیے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ اشارہ سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کو مورد الزام ٹہراتے ہوئے کہا کہ ہمارے ”مہربان“ اس کے لیے تو فکر مند ہیں کہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کو کیسے محدود رکھا جائے مگر وہ ایک قدم بھی مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے نہیں اٹھاتے۔ سید حامد نے ان خیالات کا اظہار ”اسلامی اصولوں اور ہندوستانی کلچر کی روشنی میں ایک

صحت مندر خاندان“ کے موضوع پر ایک سیمینار میں اپنے طویل کلیدی خطبے میں کیا۔
 سیمینار کا اہتمام ایک غیر سرکاری تنظیم (N.G.O) ”پروگرام فار اتھیکل، اکیڈمک
 اینڈ کلچرل انٹرپرائزز (Programme for Ethical, Academic and Cultural Enterprises ---- PEACE----) نے ایک (غیر سرکاری
 N.G.O) تنظیم سفسا (SIFPSA) کے مالی تعاون سے کیا تھا۔ یہ تنظیم ہندوستانی
 حکومت کے ساتھ مل کر ہندوستان میں فیملی پلاننگ (Family Planning) کو
 مقبول عام کرنے کے لیے کوشاں ہے۔“

(روزنامہ راشٹریہ سہارا۔ ۳ جولائی ۲۰۰۰ء)



پانچواں سبب : آئمة المضلین کا تسلط

حملے کا دوسرا محاذ امت کے اندر ارتداد یا فرار من الزحف کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ جو سبب معلوم ہوتا ہے آئمة المضلین کے تسلط کا۔ یہ امت کا داخلی محاذ ہے۔ یعنی یہ وہ محاذ ہے جہاں اسلام، قرآن، سنت اور اسلامی فکر و آداب پر حملے بیرونی طاقتوں کے ذریعہ نہیں بلکہ خود مسلمانوں کے ذریعہ ہو رہے ہیں۔ اس عاجز کا اندازہ ہے کہ گزشتہ ڈھائی سو سالوں میں مغربی استعمار اور مستشرقین کے حملوں نے اسلام اور امت مسلمہ کو ایسی تباہی سے دوچار نہیں کیا جیسی تباہی سے اس داخلی ارتداد اور فرار من الزحف نے صرف تیس (۳۰) سالوں میں کیا ہے۔ مغربی استعمار نے ڈھائی سو سالوں میں اسلام کے تناور درخت کی پتیاں نوچ ڈالیں، شاخوں پر لگے پھول اور پھل توڑ ڈالے، ٹہنیاں حتیٰ کہ شاخیں کاٹ ڈالیں لیکن شجر اسلام پھر بھی سلامت رہا ہے۔ اس کے برخلاف اس موجودہ ارتداد نے اسلام کے درخت کی جڑ ہی کاٹ ڈالی ہے۔ اور اب اس ارتداد کے بطن سے ایک نئی مخلوق پیدا ہوئی ہے جس کا چہرہ مسلمانوں سے مشابہت رکھتا ہے اور جس کے ہاتھوں میں اسلام کے بڑے اونچے اونچے علم بھی ہیں لیکن جن کے کارناموں کو دیکھ کر انیسویں اور بیسویں صدی کے متغربین — سرسید، چراغ علی، ڈپٹی نذیر احمد، مرزا غلام احمد قادیانی، خیر الدین پاشا، ابراہیم شناسی نامق کمال، جمال الدین افغانی، محمد عبدہ طہ حسین اور نیاز فتح پوری جیسے لوگوں کی رو جس بھی اپنی اپنی قبروں میں کانپ جائیں۔

ارتداد کا پس منظر :

اس عاجز نے عرض کیا تھا کہ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور حضرت علامہ اقبال نبویانہ نہاد کے حامل تھے۔ چونکہ یہ حضرات قدس ختم نبوت کے بعد تشریف لائے اس لیے منصب کے اعتبار سے تو نبی نہیں تھے لیکن صفات کے لحاظ سے نبی تھے۔

برصغیر کے مسلمانوں کی بد بختی کا آغاز اصلاً سترہویں صدی عیسوی سے ہوتا ہے جب سے اس خطے کی یہ ملت پے درپے اللہ کی نافرمانیاں کرنے لگی۔ اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے بار بار اسے سنبھلنے کا موقع دیا گیا اور اس ضمن میں اس پر عنایات پر عنایات ہوئیں۔

یہ تینوں مذکورہ حضرات صفات میں مشترک مگر توجیہ میں الگ الگ تھے۔ چنانچہ حضرت مجدد صاحب توجیہؒ ”نبی الملوک“ تھے اور حضرت شاہ ولی اللہؒ ”نبی العلماء“ اور حضرت علامہ اقبالؒ ”نبی المختصر“۔

حضرت مجدد صاحب کی تشریف آوری کا مقصد اصلی یہ تھا وہ اہل ہند کو اور چونکہ یہاں اسلامی مملکت قائم تھی اس لیے اس کے بادشاہ کو دعوت دیں کہ خلافت عثمانیہ اب اس عظیم ذمہ داری کو اٹھاتے رہنے کی اہل نہیں رہی لہذا امت محمدیہ ہند یہ اس ذمہ داری کو اٹھالے چونکہ یہ ذمہ داری کوئی بادشاہ اور وہ بھی سلطنت مغلیہ کا فرماں روا یا سانی اٹھا سکتا تھا لیکن اس سے قبل اسے ایسے اقدامات کرنے چاہئے تاکہ عند اللہ اس کا استحقاق ثابت ہو جائے۔ حضرت مجدد صاحب کی ضرورت بادشاہ کو مخاطب کرنے کی تھی لہذا وہ توجیہؒ نبی الملوک بنا کر بھیجے گئے تھے۔ امت مسلمہ ہند یہ کی پہلی ہولناک ناکامی اللہ کی رضا کو سمجھنے اور اس پر لبیک کہنے سے پہلو تہی کے تعلق سے ہوئی۔ شاہ جہاں اور عالمگیر نے اللہ کی رضا پر لبیک کہنے میں کوتاہی کی تو مسلم سلاطین ہند کو ڈیڑھ سو سالوں تک توبہ کی مہلت دی گئی اور پھر ان پر اللہ کا غضب ٹوٹا اور مسلسل پانچ سو سالوں سے چلی آرہی حکمرانی کو اللہ نے تہس نہس کر دیا اور پانچ سو سالوں سے حکومت کرنے والی قوم غلام ہو گئی۔ اور بادشاہوں کا نام و نشان مٹ گیا۔ وہ عظیم الشان سلطنت مغلیہ تاریخ کا حصہ بنا دی گئی۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تشریف آوری کا مقصد اصلی اس تناظر میں تھا کہ پوری روئے زمین میں ابلیس نے شیطانی علمی اور فکری انقلاب برپا کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اب بادشاہان اور حکومتیں تہذیب و تمدن نہیں دیں گی بلکہ قومیں اور نظام افکار کی بنیاد پر برپا ہوں گے لہذا خلافت اسلامیہ کو روئے زمین پر برقرار رکھنے اور اسے مستحکم کرنے کے لیے فکری انقلاب کی ضرورت ہے۔ لہذا اللہ نے امت مسلمہ ہند یہ کو دوسرا موقع عنایت فرمایا۔ یہ موقع اب علماء کو دیا گیا کہ وہ زمین پر اللہ کی خلافت کو تھام لیں۔ جسے اب عثمانی بہت دیر تک تھامے نہیں رکھ سکتے۔ اب ابلیس کے ہاتھوں ساری دنیا میں افکار کا ایسا طوفان آئے گا کہ اس میں خلافت عثمانیہ تنکے کی طرح بہہ جائے گی۔ لہذا اس سے قبل امت مسلمہ ہند یہ کو چاہیے کہ روئے ارض پر خود اسلامی فکری انقلاب برپا کر کے خلافت اسلامیہ کو مستحکم کر لے۔

چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی توجیہؒ نبی العلماء بنا کر بھیجے گئے۔ برصغیر کے

لوگوں کی بدبختی کے ایام ابھی ختم نہیں ہوئے تھے۔ لہذا جب حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تشریف لائے تو برصغیر کے علماء میں بعض نے قولاً اور تحریراً اور بیشتر نے عملاً ان کی تکذیب کر دی۔ برصغیر کے علماء کے ذریعہ حضرت شاہ صاحب کی دعوت کی تکذیب دراصل انیسویں اور بیسویں صدی میں ابلیس کے عالمی نظام کی ترقی کا سبب بنی۔ چنانچہ برصغیر کے علماء نے خلافت ابلیسیہ کو قائم ہونے سے روکنے اور خلافت اسلامیہ کو نئے افکار و تطبیقات سے سارے عالم میں مستحکم کرنے کی ذمہ داری ادا کرنے سے انکار کر دیا اور ان میں سے بعض اپنے مناظروں میں اور بعض ذکر و فکر صبح گاہی میں اور بیشتر شغلِ عجب میں حسب سابق مشغول رہے چنانچہ برصغیر کے روایتی علماء پر اللہ کا غضب ٹوٹا، ٹھیک ڈیڑھ سو سال کی مہلت تو بہ کے بعد اللہ نے ۱۹۲۲ء میں ان کی سیادت و قیادت کو تہس نہس کر دیا۔ اب ان علماء کا مقدر بنادیا گیا کہ وہ اہل حکومت، اہل ثروت، اہل سیاست اور جملاء کے بواب اور ایجنٹ کا فریضہ انجام دیں۔

حضرت علامہ اقبال کی تشریف آوری ایک ایسے وقت میں ہوئی کہ پوری ملت اسلامیہ ابلیس کے ذریعہ نگلی گئی تھی۔ سلطنت، اقدار، تہذیب، تمدن، افکار، علوم سب پر ابلیس کا مکمل قبضہ ہو گیا تھا۔ اسلامی علوم کے حاملین — روایتی علماء — اجنبی اور محصور ہو چکے تھے۔ ایک طرف ان کی باتیں خود ملت اسلامیہ کی اکثریت کے لیے اجنبی ہو چکی تھی تو دوسری طرف وہ خود اس نظام سے نابار تھے جو ان کے اوپر پچھلے ڈیڑھ سو سالوں سے نافذ ہو چکا تھا۔ لہذا یہ روایتی علماء کھلے آسمان کے نیچے ہونے کے باوجود اپنے ارد گرد سے اس سے زیادہ واقف نہ تھے جتنے اصحاب کہف۔ یہی سبب ہے کہ حضرت علامہ اقبال توجیہ تانی المخصرم بنا کر بھیجے گئے یعنی ایک ایسا شخص جو بیک وقت نظام حق اور اس کی گہرائیوں سے بھی باخبر ہو اور موجودہ نظام ابلیس کی گہرائیوں سے بھی۔ بحیثیت مجموعی امت محمدیہ حضرت علامہ اقبال کے عہد میں بالآخر اس ہولناک حادثے سے دوچار ہو ہی گئی جس سے بچانے کے لیے پچھلے تین سو سالوں سے اس خطے کو اللہ پے درپے بلا رہا تھا۔ اس نبی المخصرم نے ۱۹۱۲ء میں صورت حال کی سنگینی کو پایا تھا۔ اس نے پوری ملت اسلامیہ کو پکارا :

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

بتان رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

یقین محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

بیا پیدا خریدار است جان ناتوانے را
پس از مدت گزار افتاد برما کاروانے را

لیکن بر مغیر کی ملت اسلامیہ نے اور بطور خاص اس کے ملاء نے اس نبی المخضرم کی
تکذیب کر دی۔ قائدین، علماء، مشائخ، اہل مدرسہ اور عصری علوم کے دانش ور، سمجھوں نے
تکذیب کی۔ چنانچہ جب اس کی آنکھوں نے خلافت کا بکھرنا دیکھا تو اس نے پکارا :

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

لیکن یہ قوم ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ نہ علماء، نہ مشائخ، نہ قائدین نہ عصری علوم کے
دانشور۔ چنانچہ اس نے اپنا خون جگر اس طرح سڑکوں پر بہا دیا شاید کہ کوئی آنکھ نم ہو :

آگ بجھی ہوئی ادھر ٹوٹی ہی طناب ادھر کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں
کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لیے مئے حیات کہنہ ہے بزم کائنات تازہ ہیں میرے واردات
کیا نہیں اور غزنوی کارگہ حیات میں بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہل حرم کے سومات
قافلہ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات
اس شخص کو خوب معلوم ہو چکا تھا کہ حضرت مجدد صاحب سے لے کر خود اس کی ذات
تک یہ امت کیوں اللہ کی رضا پر لبیک کہنے میں ناکام ہوئی ہے۔ چنانچہ اس شخص نے اس صدی میں
اپنی کوششوں کی ناکامی کے اسباب میں سے بنیادی سبب کی جو نشاندہی کی ہے وہ بیسویں صدی میں
امت کی تاریخ کا دردناک باب ہے :

آیہ کائنات کا معنی دیریاب تو نکلے تری تلاش میں قافلہ ہای رنگ و بو

جلوتیان مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق خلوتیان میکدہ کم طلب و تہی کدو
میں کہ میری غزل میں ہے آتش رفتہ کا سراغ میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

چنانچہ آنے والی نسلوں کو یہ پیغام دے کر وہ نبی المخصرم اپنے رب سے جا ملا۔

عقل و دل و نگاہ کا مرکز اولین ہے عشق عشق نہ ہو تو شرح و دیں، بتکدہ تصورات
تازہ میرے، ضمیر پر معرکہ کہن ہوا عشق تمام مصطفیٰ عقل تمام بولہب

ارتداد کی شرعاً عات :

۱۹۰۴ء میں یہودیوں اور مغرب میں ان کے حلیفوں — برطانیہ، فرانس، روس، اٹلی وغیرہم کے مابین پورے عالم اسلام کو تہہ و بالا کر دینے، خلافت اسلامیہ کو ختم کر دینے، پورے عالم عرب اور عالم ترک و بربر پر قبضہ کر لینے اور مقامات مقدسہ کو چھین لینے — کے لیے جب سازش مکمل ہو گئی اور عالم عرب اور عالم ترک کے عامۃ المسلمین کو چھوڑ کر بقیہ پوری عربی اور ترکی اشرافیہ عملاً فری مین ہو کر یہودی ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے پورے عالم اسلام کی حفاظت اور نہمکدہ اشت کی ذمہ داری عملاً بر صغیر کے مسلمانوں کو دینی چاہی۔ حدیث کے الفاظ کے مطابق اللہ کی رضا فرشتوں کے ذریعے روئے زمین اور بطور خاص بر صغیر کے صالحین کے قلوب پر منعکس ہوئی۔ اللہ کی رضا کا یہی وہ آفاقی فیصلہ تھا جس کا ظہور بر صغیر میں کسی بھی مسلم علاقے سے زیادہ حتیٰ کہ خود عالم عرب اور عالم ترک سے بھی زیادہ — تحریک خلافت کے نام سے ہوا۔ بر صغیر کی امت مسلمہ کے بعض صالح اذہان و قلوب نے اس ذمہ داری کا ادراک اور وجدان تو پایا جس کا اظہار ان مضامین سے ہوتا ہے جو الہلال میں ۱۹۱۵-۱۹۱۴ء میں شائع ہوئے اور اب مولانا آزاد کی کتاب مسئلہ خلافت میں اور بطور خاص اس کے آخری حصے میں درج ہیں۔

لیکن بر صغیر کے باقیماندہ مسلم حکمران، دانشوران اور بطور خاص علماء و مشائخ کے بروقت اور درست ادراک کے باوجود ان کے اندر کی پرانی خرابی ان کے آڑے آئی۔ چونکہ انیسویں صدی میں ملت کی قیادت کی ذمہ داری علماء پر کلیتاً آگئی تھی اس لیے بحیثیت قائد علماء نے اس نئی اور آفاقی ذمہ داری کے، تناظر میں اپنی معلومات، واقعات عالم پر علمی گرفت، قرآن و سنت میں رسوخ، اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے منصوبہ بندی کرنے، اس منصوبہ بندی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ضروری صلاحیتوں کا ادراک کرنے، پوری امت میں پائی جانے والی صلاحیتوں کو جمع کرنے

اور فقدان کی صورت میں صلاحیتوں کو Upgrade کرنے کے تعلق سے اپنا احتساب نہیں کیا۔ حسب سابق ان پر سرستی طاری رہی۔ کہ (۱) وہ قرآن و سنت کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔ (۲) جو کچھ ان کے پاس ہے وہی اسلام کا علم ہے۔ (۳) جو بات ان کی عقل میں نہیں آتی یا ان کے دائرہ علم سے باہر ہے وہ قرآن و سنت کا علم ہی نہیں ہے (۴) جو کچھ ان کی عقل کے مطابق ہے یا ان کے دائرہ علم کے اندر ہے وہی علم دین ہے۔ (۵) آج بھی روایتی علماء اس کا دعویٰ کرتے ہوئے ملتے ہیں کہ اٹھارہویں، انیسویں اور بیسویں صدی میں باطلانہ نظام کے اہل علم بطور خاص یہودی، عیسائی اور مشرک اہل علم اور علماء ہمیشہ مسلم علماء کی وسعت علم کے سامنے عاجز اور مبہوت ہو گئے اور کوئی بھی عالم دین کبھی بھی عاجز و مبہوت نہیں ہوا اور دوسری طرف تاریخ کی گواہی ہے کہ انہیں دنوں دنیا میں ہر جگہ اسلام اور امت مسلمہ مغلوب بھی ہوتے رہے (۶) جو علم وہ رکھتے ہیں وہ ہر کام کرنے کے لیے کافی ہے۔ (۷) چونکہ وہی اللہ کے برگزیدہ ہیں لہذا ان کا کام صرف پھونکوں سے چل جائے گا۔ (۸) کوئی کام صرف اس لیے نہیں ہو رہا ہے کہ ہم علماء اور مشائخ اس کے لیے نہیں اٹھے ہیں۔ جس دن ہم اٹھ جائیں گے دنیا کا نقشہ بدل ڈالیں گے۔ (۹) ان علماء اور مشائخ کے سوا بقیہ امت، اسلام کی مملکت کے دوسرے درجے کے شہری ہیں اور ناقابل اعتبار ہیں۔ اور ان دوسرے درجے کے شہریوں میں وہ بہر حال غنیمت ہیں جو اسلام سے بالکل نابلد اور ان کے قدردان ہیں۔ ورنہ جو عصری علوم سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ علوم اسلامیہ سے بھی واقف ہیں اور امت اور اسلام کا درد رکھنے والے بھی ہیں وہ تو گویا کسی متعدی مرض والے ہیں جس سے ہر صحیح العقیدہ مسلمان کو دور رہنا چاہیے۔

ظاہر ہے یہ باتیں ان علماء سے متعلق نہیں جو قرآن و احادیث مبارکہ کی نظر میں فی الواقع علماء ہیں۔ ایسے علماء کرام ان علماء معروف کے ہاتھوں مخلص عامۃ الناس کے مانند اسی طرح اذیتیں اٹھا رہے ہیں جیسا انبیاء بنی اسرائیل علماء بنی اسرائیل کے ہاتھوں اٹھاتے تھے۔

چنانچہ اس کا نتیجہ درج ذیل صورتوں میں نکلا:

(۱) برصغیر کی امت مسلمہ اس عظیم آفاقی اور امتی ذمہ داری کو اپنے کاندھوں پر لینے اور اس کا حق ادا کرنے میں بحیثیت ملت مجموعی طور پر ناکام ہو گئی۔

(۲) برصغیر میں موجود امت مسلمہ کی صالح اور مؤثر صلاحیتوں کو (Intensively)

اور (extensively) یکسو نہیں کیا جاسکا۔ اور ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا کی طرح اور وقتی اور جذباتی نعرہ بازیوں میں مشغول بھیڑ کی طاقت کا مظاہرہ تو ہو گیا جس کے دو بڑے نقصانات ہوئے۔
(۱) بیدار دشمن کو امت کی حقیقی طاقت کو زیادہ Accuracy کے ساتھ اندازہ کرنے کا موقع مل گیا۔

(۲) دیگر خوابیدہ دشمن، ناویدہ خطروں کے پیش نظر بیدار ہو گئے۔

(۳) برصغیر اور یہاں آباد امت مسلمہ — یہودیوں اور ان کے مغربی حلیفوں کی نظر میں ان کی اصطلاح International Threat کے اعتبار سے (Main Thrust Point) بن گئے۔ چنانچہ ۱۹۱۴ء کے بعد جہاں یہ مسلم زعماء نعرہ بازیوں میں مشغول تھے ان کے عالمی دشمن ان کے خلاف عالمی سازش تیار کر رہے تھے جن پر عمل درآمد کے لیے ایک خصوصی عالمی ماہر فن اور بیسویں صدی کے یہودی اکابر میں سے ایک Lord Reading ہندوستان آیا۔ اور اس نے صرف تین سالوں میں پوری ملت اسلامیہ ہند اور اس کے ساتھ ساتھ پوری ملت اسلامیہ عالم کی قسمت پر ایک سو سال کے لیے مہر لگادی۔ چنانچہ عالمی صیہونیت کا وہ جرنیل جب ہندوستان سے جا رہا تھا تو اس کی جیب میں کتنے شیخ التفسیر، کتنے شیخ الحدیث، کتنے قطب الاقطاب، کتنے دانشور، سیاست داں اور فوجی جنرلوں کے عہد نامے تھے جن میں سے بیشتر نے طوعاً اور بعض نے مجبوراً عہد کیا تھا کہ اعلیٰ حضرت ہم عہد کرتے ہیں کہ عتبات اسلامیہ کو ڈھانے اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر کرنے میں ہم آپ کا ساتھ دیں گے۔ (یہ موقع نہیں کہ اس عنوان پر یہ عاجز مزید کچھ لکھے)۔

(۴) اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ برصغیر اور اس کے تناظر میں پوری ملت اسلامیہ کی قیادت کے لیے اللہ تعالیٰ نے علماء کی اس نسل کو معزول کر دیا۔ اور در بدر بھٹکنے اور ٹھوکر کھانے کے لیے قوم کو اور ان کی ٹھوکریں کھانے کے لیے علماء کو چھوڑ دیا۔ چنانچہ ۱۹۲۹ء کے بعد برصغیر کی ملت اسلامیہ پر وہ دور شروع ہوا۔ جسے قرآن نے یوں بیان فرمایا ہے:

فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ لِيَسُوءَ أَوْجُوهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا

دَخَلُوهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلِيَتَبَرَّوْا مَا عَلُوا تَتَبَيَّرُوا. (بنی اسرائیل: ۷)

ترجمہ: پھر جب دوسرے عذاب کا وقت آیا تو ہم نے دوسرے دشمنوں کو تم

پر مسلط کر دیا تاکہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں اور مسجد میں اسی طرح گھس جائیں جس

طرح پہلے دشمن گھسے تھے اور جس چیز پر ان کا ہاتھ پڑے اسے تباہ کر کے رکھ دیں۔

(۱) چونکہ برصغیر کی ملت اسلامیہ کے سواد اعظم نے اللہ کی رضا کے پورا کرنے میں

کو تاہی کی اور اب تک توبہ کرنے سے روگرداں رہی تھی لہذا سنت اللہ کے مطابق ۱۹۲۳ء کے بعد سواد اعظم میں جزر یعنی بھانا کا دور شروع ہو گیا جو اب تک جاری ہے۔ خواہ وہ ۱۹۳۶ء کے شمالی ہند کے فسادات ہوں یا ۱۹۴۷ء سے اب تک ہونے والے کلکتہ، جمشید پور، جبل پور، نیلی، مراد آباد، احمد آباد کے نہ ختم ہونے والے فسادات کا سلسلہ ہو یا ۱۹۷۱ء کا بنگلہ دیش کا قتل عام ہو یا گزشتہ دس سالوں سے جاری کراچی کی خونریزی ہو یا بابر می مسجد کا انہدام ہو یا دستور ہند کی دفعہ ۳۴ کی لٹکتی ہوئی تلوار ہو یا مساجد و مدارس کے ختم کر دینے کے لیے مذہبی مقامات بل کی منظوری ہو۔ قرآن کا ارشاد ہے:

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يُقَوْمِ أَنْكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوبُوا إِلَىٰ بِلْدَانِكُمْ فَاقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ. (البقرہ: ۵۴)

ترجمہ: اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم سے اے قوم تم نے نقصان کیا اپنا یہ بچھڑا بنا کر سواب توبہ کرو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف اور مار ڈالو اپنی اپنی جان۔

(۲) چونکہ یہ بھی سنت اللہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رضا کے لیے ایک ملت کی کوتاہی کے بعد دوسری ملت کے برپا کرنے کا فیصلہ اسی وقت کرتا ہے جب اس امت کے ہر ہر طبقے پر اس کی حجت پوری ہو جاتی ہے۔ اور اس مدت میں اللہ اپنی رضا کو اس ملت کے چھوٹے سے چھوٹے گروہ پر پیش کرتا ہے کہ اگر وہ گروہ اسے اٹھالے تو اسی کے بارے میں اللہ کی نصرت کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے برصغیر کے شمال مغربی حصے کو نصف صدی آتے آتے اپنی رضا پیش کر دی اور پورے پچیس سالوں تک اس ملت کے رد عمل کا اللہ نے انتظار کیا۔ افسوس کہ یہ ملت دوسروں سے کچھ مختلف ثابت نہیں ہوئی۔ اس ملت کو تو اپنے وجود اور مقصد وجود کا ہی اور اک نہ ہو سکا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے صرف اپنی قدرت کاملہ (جس میں کسی انسانی طاقت کو دخل نہیں) سے وجود بخشا ہے تاکہ وہ پوری روئے ارض میں اللہ کی رضا کو پورا کرے۔

لیکن ابھی اس ملت کی پیدائش کو دو سال بھی نہیں گزرے تھے کہ اس نے قومیت کی بت پرستی شروع کر دی۔ قرآن نے اسی صورت حال کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

وَجَاوَزْنَا بِبَنِي إِسْرَائِيلَ الْبَحْرَ فَأَتَوْا عَلَىٰ قَوْمٍ يَعْكُفُونَ عَلَىٰ أَصْنَامٍ لَهُمْ قَالُوا يَمُوسَىٰ اجْعَلْ لَنَا إِلَٰهًا كَمَا لَهُمْ آلِهَةٌ قَالَ إِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُونَ. أَنْ هَؤُلَاءِ مَتَّبِعُوا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ. قَالَ اغْبِرُوا هَؤُلَاءِ ابْغِيكُمُ إِلَٰهًا وَهُوَ فَضْلُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ. (الاعراف: ۱۳۸-۱۴۰)

ترجمہ: اور پارا اتار دیا ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے تو پہنچے ایک قوم پر جو پوہنے میں لگ رہے تھے اپنے بتوں کو۔ کہنے لگے اسے موسیٰ بناوے ہماری پوجا کے لیے بھی ایک بت جیسے ان کے بت ہیں۔ کہا تم لوگ تو جہل کرتے ہو۔ یہ لوگ اس چیز سے لگے ہوئے ہیں جو تباہ ہونے والی ہے۔ اور غلط ہے جو وہ کر رہے ہیں۔ کہا کیا اللہ کے سوا ڈھونڈھوں تمہارے واسطے کوئی اور معبود حالانکہ اس نے ساری دنیا میں اپنی بھلائی کے لیے تم کو منتخب کیا ہے۔

چنانچہ پاکستان کے سرداروں نے حضرت علامہ اقبال کے اسلامی محراب کے نیچے کھڑے ہو کر نیت باندھنے سے انکار کر دیا اور اسے بڑی چابکدستی سے اشتیاق حسین قریشی کے مسلمان محراب سے بدل دیا۔ لیکن جس کی آسودگی اسلامی محراب سے نہیں ہو سکتی تھی بھلا اسے مسلمانی محراب میں خاک لطف ملتا۔ اسے تو مرئی بت چاہئے تھا۔ چنانچہ فیصلہ کر لیا گیا کہ ایک بت بنایا جائے گا۔ اور اگر ایسا بت تراشنے کے لیے کوئی ماہر فن ملک میں نہ پایا جاتا ہو تو نہ سہی اس کار خیر کے لیے J. Marshall یا R.E.M. Wheeler، کو بلانا پڑے تو بلایا جائے۔

ظاہر ہے اس کا جو نتیجہ برآمد ہونا تھا ہوا۔ قبلہ کے بدلتے ہی صفا اور مروہ کے بجائے سیٹو (SEATO)، سینٹو (CENTO) اور میڈو (MEADO) کے مابین سعی شروع ہو گئی۔ چنانچہ کعبۃ اللہ کے ڈھانے اور اسلام کے خاتمے کا جو عہد نامہ انفرادی حیثیتوں سے برصغیر کے علماء، مشائخ اور دیگر ارباب حل و عقد نے (۱۹۲۴ء) میں لارڈ ریڈنگ سے کیا تھا اب اسی عہد کی تجدید بحیثیت مملکت خداداد نے کر دی۔ چونکہ ۱۹۲۳ء میں روئے ارض پر وہ جھنڈا گر گیا تھا جسے نبی آخر الزماں ﷺ نے ایستادہ کیا تھا اور اللہ کی نظر میں ابلیس کے مکر کبار کا جواب دینے اور اس جھنڈے کو پھر ایستادہ کرنے کی صلاحیت نہ عرب میں تھی نہ ترک میں اس لیے کہ ان دونوں کی قیادت کے مرتد اور باغی ہونے کے سبب ہی تو یہ جھنڈا گرا تھا اس لیے اللہ کی رضا، برصغیر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ لیکن جب برصغیر کے علماء اور دیگر قائدین نے اس ذمہ داری کو ادا کرنا تو الگ رہا ابلیس کے جھنڈے کو اٹھانے کی حامی بھر لی تو اللہ کی نظر اپنی سنت کے مطابق اس ملت کے اندر موجود کسی بھی چھوٹے گروہ کی طرف دیکھنے لگی جو اس ذمہ داری کو اٹھانے کو آمادہ ہو۔

اس نارنجی گھڑی میں اگر کوئی چھوٹے سے چھوٹا گروہ بھی اس ذمہ داری کو اٹھالیتا اور اس کا حق ادا کرنے کے لیے مٹھی بھر جمعیت کے ساتھ بھی صف آراء ہو جاتا اور اس جھنڈے کو اٹھا کر

ایستادہ کر دیتا تو اللہ اس خطے پر اپنی نعمتوں کی بارش کر دیتا۔ اس انتخاب الہی کے صرف ۱۵ دنوں بعد روئے ارض پر وہ سلسلہ شروع ہونے والا تھا جس کی خاطر رسول اللہ ﷺ کا جھنڈا گرایا گیا تھا۔ چنانچہ ۲۹ اگست، ۱۹۴۷ء کو اقوام متحدہ نے فیصلہ لے لیا کہ اب اس کام کا آغاز کر دیا جائے جس کے لیے خلافت عثمانیہ کا خاتمہ کیا گیا ہے۔

اہل نظر جانتے ہیں کہ برصغیر اور مشرق وسطیٰ میں صرف نو مہینوں کے وقفے سے دو غیر معمولی ظہور کا واقع ہونا دراصل اللہ اور ابلیس کے دو فیصلوں کے مظہر تھے۔ لیکن افسوس کہ برصغیر کی امت مسلمہ اس نازک اور فیصلہ کن گھڑی میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں ناکام ہو گئی۔ قوم اور اس کے ملاء اپنے مقصد و جود کو ہی بھلا بیٹھے اور علماء اور دیگر اہل حق اللہ کی رضا کا حقیقی مفہوم سمجھ کر اقدام کرنے کے بجائے فقہی موشگافیوں میں ہی الجھے رہ گئے۔ چنانچہ بجائے اس کے کہ یہ قوم وہ کام کرتی ہے جس کے لیے اسے برپا کیا گیا تھا یہ وہ کام کرنے لگی جس کا ذکر قرآن میں یوں کیا گیا ہے:

”یاد کرو کہ ہم نے موسیٰ کو کتاب اور فرقان عطا کی تاکہ تم اس کے ذریعے سے سیدھا راستہ پاسکو۔ یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ ”لوگو، تم نے پچھڑے کو معبود بنا کر اپنے اوپر سخت ظلم کیا ہے۔ لہذا تم لوگ اپنے خالق کے حضور توبہ کرو اور اپنی جانوں کو ہلاک کرو اسی میں تمہارے خالق کے نزدیک تمہاری بہتری ہے۔ اس وقت تمہارے خالق نے تمہاری توبہ قبول کر لی کہ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔“

یاد کرو جب تم نے موسیٰ سے کہا تھا کہ ہم تمہارے کہنے کا ہر گز یقین نہ کریں گے، تب تک کہ اپنی آنکھوں سے علانیہ خدا کو نہ دیکھ لیں۔ اس وقت تمہارے دیکھتے دیکھتے ایک زبردست صاعقے نے تم کو آیا۔ تم بے جان ہو کر گر چکے تھے مگر پھر ہم نے تم کو جلا اٹھایا، شاید کہ اس احسان کے بعد تم شکر گزار بن جاؤ۔

ہم نے تم پر ابر کا سایہ کیا۔ من و سلوئی کی غذا تمہارے لیے فراہم کی اور تم سے کہا کہ جو پاک چیزیں ہم نے تمہیں بخشی ہیں انہیں کھاؤ مگر انہوں نے ہمارا کچھ نقصان نہیں کیا بلکہ اپنے اوپر ظلم کیا۔

پھر یاد کرو جب ہم نے کہا تھا یہ بستی جو تمہارے سامنے ہے اس میں داخل ہو جاؤ، اس کی پیداوار جس طرح چاہو مزے سے کھاؤ، مگر بستی کے دروازے میں سجدہ

ریز اوتے ہوئے داخل ہونا اور کہتے جانا خطہ خطہ ہم تمہارے خطوں سے درگزر کریں گے اور نیکوکاروں کو مزید فضل و کرم سے نوازیں گے مگر جو بات کہی گئی تھی ظالموں نے اسے بدل کر کچھ اور کر دیا۔ آخر کار ہم نے ظلم کرنے والوں پر آسمان سے عذاب نازل کیا۔ یہ سزا تھی ان نافرمانوں کی جو وہ کر رہے تھے۔

یاد کرو، جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی کی دعا کی تو ہم نے کہا کہ فلاں چٹان پر اپنا عصا مارو۔ چنانچہ اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور ہر قبیلے نے جان لیا کہ کون سی جگہ اس کے پانی لینے کی ہے۔ اللہ کا دیا رزق کھا پیو، اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔

یاد کرو، جب تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰ! ہم ایک ہی طرح کے کھانے پر مبر نہیں کر سکتے۔ اپنے رب سے دعا کرو کہ ہمارے لیے زمین کی پیداوار، ساگ، ترکاریاں، گیہوں، لہسن، پیاز، دال وغیرہ پیدا کرے۔ تو موسیٰ نے کہا: کیا ایک بہتر چیز کے بجائے تم ادنیٰ درجے کی چیزیں لینا چاہتے ہو؟

ٹھیک ہے، جاؤ، دفع ہو جاؤ، ہٹ جاؤ، اتر دو اور چلے جاؤ کسی جگہ۔ جو کچھ تم مانگتے تھے، اہاں مل جائے گا۔ اور اس طرح ذلت، خواری، پستی اور بد حالی ان پر مسلط کر دی گئی۔ اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے۔ یہ نتیجہ تھا اس کا کہ وہ اللہ کی آیات سے کفر کرنے لگے، اور نبیوں کو قتل کرنے لگے۔ یہ نتیجہ تھا ان کی نافرمانیوں کا اور اس بات کا کہ وہ نافرمانوں پر نافرمانیاں کرنے لگے تھے۔ (البقرہ: ۶۱-۵۵)

چنانچہ اللہ کی رضا پورے بیس سالوں تک بے قراری سے اس قوم کو دیکھتی رہی۔ اس مدت میں اس روئے زمین پر جہاں اس خدائے ذوالجلالی کے نبی مکرم نے ابلیس کو شکست دے کر حق کا جھنڈا ایستادہ کیا تھا۔ اور اعلان کیا تھا: حق آیا اور باطل مٹ گیا اور بے شک باطل مٹ جانے کے لیے ہی ہے۔ اس زمین پر اللہ کی مملکت اور اس کی اتھارٹی (Authority) یعنی خلافت ڈھادی گئی تھی اور ابلیس نے روئے زمین پر اللہ کی مملکت کو ڈھا کر خلافت ابلیس قائم کر دی تھی۔ اور اب جسے اللہ نے ابلیس کی خلافت کے قیام سے ۹ ماہ قبل خلافت اللہ کی کنجی دی تھی اس نے اس کنجی کو ابلیس کے ہاتھوں میں گر دی اور اس دوران اللہ کی رضا بے چینی سے دیکھتی رہی۔ یوں تو برہمنیہ کے مسلمانوں پر اللہ کے غضب کے اتر آنے کے لیے ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو مکمل جواز پیدا ہو گیا تھا لیکن اللہ کی شان کریمی رحم پر رحم کرتی رہی۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ پاکستان

کی قسمت کا فیصلہ آج دن ہو گیا تھا جب ۹ جون ۱۹۶۷ء کو اسحاق رابن کی قیادت میں ایلینس کی فوج المسجد میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اہل دل کو پورا پورا اندازہ تھا کہ اب برصغیر کے مسلمانوں اور بالخصوص اہل پاکستان کی خیر نہیں ہے۔ اللہ کا غضب ان پر اتر کر رہے گا۔ جب اللہ کے گھر پر ایلینس کا قبضہ ہو گیا تو ان کے گھر کیوں سلامت رہیں؟ چنانچہ اللہ کے غضب کے فیصلے ۱۹۶۸ء سے نافذ ہونا شروع ہوئے۔ ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء تک ان فیصلوں نے صورت حال واضح کر دی تھی کہ اب اس خطے کو اللہ تعالیٰ عبرتناک سزا دے گا۔ چنانچہ پہلے طوفان آیا اور لاکھوں اموات ہوئیں۔ غضب بالائے غضب یہ ہوا کہ القدس کے اجڑے ہوئے مسلمانوں کو بے دردی سے کچلنے کے لیے یہودیوں کے خاندانی عمل کی مدد اس قوم نے کی جس کو اللہ نے اپنے گھر اور ساری دنیا کے مسلمانوں کے بچانے کی ذمہ داری دی تھی۔ ۱۹۷۰ء میں پاکستانی فوجوں نے معصوم فلسطینیوں کو اسی طرح قتل کیا جس طرح یہودیوں اور شاہ حسین نے چاہا تھا۔ اللہ تعالیٰ سب کچھ مبین میں درج کر رہا تھا۔ چنانچہ ابھی تین مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ۷ دسمبر ۱۹۷۰ء کو ارباب حل و عقد کو اس دروازے کے کھولنے کی طرف بڑھا دیا جس کے کھلنے کے بعد آنے والی تازہ ہوا سے یہ قطعاً نا بلند تھے۔ اور اسی ہوا میں ان کے لیے بلا تھی۔ اس سے پہلے یکم جولائی ۱۹۷۰ء کو یہ ایک اور دروازہ وا کر چکے تھے جس کے بعد ۷ دسمبر کا دروازہ انہیں وا کرنا ہی تھا۔ یحییٰ خان، بھٹو اور مجیب میں کون غلط تھا یا کون صحیح یہ بحث نہیں۔ پوری قوم کو جب سزا دی جاتی ہے تو اللہ کسی کو کسی پر مسلط کرنا ہی ہے۔ اللہ کا غضب ٹوٹا اور برصغیر کی نو سو سالہ اسلامی تاریخ میں پہلی بار عوامی سطح پر بھائی نے بھائی کا خون اس بے دردی سے بہایا کہ ساری حرمتیں پامال ہو گئیں۔ برصغیر کا کون گھر ہو گا جو خون کے آنسو نہ رو رہا ہو۔ لیکن اللہ کا فیصلہ نافذ ہو کر رہتا ہے۔ آج بھارت ہو یا بنگلہ دیش یا پاکستان — مومن ہر جگہ ذلیل و رسوا ہو رہا ہے۔ اللہ کے احکام ہر جگہ پامال ہو رہے ہیں۔ یہاں ایک کے ہاتھوں تو وہاں دوسرے کے ہاتھوں۔ آج اگر بد قسمتی سے جیسی کہ اطلاعات مل رہی ہیں (جسارت ۲۷ جون ۲۰۰۰ء)۔ حکومت پاکستان نے اسرائیل کو تسلیم کر لینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اگر پاکستان نے اسرائیل کو تسلیم کر لیا تو اس عاجز کو پورا یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ پاکستان کو تاریخ میں نشان عبرت بنادے گا۔ یا تو اس کا نام و نشان صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے گا یا اس پر ایسی ذلت اور خواری مسلط کر دی جائے گی جو تاریخ میں بے نظیر ہوگی۔ یوں بھی خود پاکستان ہی کے ذریعہ

اسرائیل کو تسلیم کر لینے کے بعد پاکستان کا عند اللہ کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ اگر ایسا ہوا تو کوئی ضروری نہیں کہ عذاب اسی عنوان سے آئے۔ عذاب اور اسکی شکل میں باطنی ربط کے باوجود ظاہر اُ فرق ہو سکتا ہے۔ بہت ممکن ہے آنے والا عذاب اب سندھ سے شروع ہو۔

ارتداد اصلی کا آغاز :

حضرت علامہ اقبال توجیہ نبی المکھرم تھے۔ اس لیے ان کے مخاطب دو اقسام کے ہو سکتے تھے۔ غالب مغرب نہاد اور غالب اسلام نہاد۔

۱۹۳۰ء میں الہ آباد سیشن میں ظاہر کیے گئے علامہ اقبال کے خیالات نے ۱۹۴۰ء میں قرار داد پاکستان کی شکل لے لی۔ لیکن جو طبقہ اس میں پیش پیش تھا وہ امت کا وہ طبقہ تھا جسے غالب مغرب نہاد کہا جاتا ہے اور اس وقت جس کی نمائندگی مسلم لیگ کر رہی تھی۔ یہ بتانا قطعاً مشکل ہے کہ یہ طبقہ فی الواقع مخلص بھی تھا یا محض عامۃ المسلمین کے جذبات کا استحصال کر رہا تھا اس لیے کہ ابھی پاکستان بنے چند روز بھی نہیں گزرے تھے کہ اس نے اس مقصد سے کفر کر دیا جس کی اس نے علم برداری کی تھی۔ اس طبقے کو پاکستان کے بن جانے کے بعد اسے مسلمانوں کا ایک قومی بت خانہ بنانے کی فکر لگ گئی اور انہوں نے اس بات سے صاف انکار کر دیا کہ وہ ملک کیوں وجود میں لایا گیا تھا۔ اس طرح بر صغیر کے ایک اور طبقے نے نہ صرف اللہ کی رضا پر لبیک کہنے میں کوتاہی کی بلکہ اس کا ز سے علانیہ مرتد ہو گئی۔

سنت اللہ کے عین مطابق اسی کے زیر سایہ اللہ تعالیٰ ایک دوسرے گروہ کی پرورش کر رہا تھا۔ جسے تحریک اسلامی کہا جاتا ہے۔ علامہ اقبال کے انتقال اور قرار داد پاکستان پاس ہوتے ہی مسلم لیگ کے بیشتر علمبرداروں کے رویے سے اللہ تعالیٰ باخبر تھا کہ یہ حق کو پامال کر دیں گے۔ شاید اسی لیے ۱۹۴۱ء میں بر صغیر میں اللہ تعالیٰ نے اسی علامہ اقبال کے متاثرین و مسترشدین کے ایک دوسرے طبقے کو آگے بڑھنے کی توفیق دی۔

واضح ہو کہ یہ ساری نشاۃیں اللہ تعالیٰ کی اس رضا کی تکمیل کے لیے ہو رہی تھیں جس کا بنیادی مقصد تھا روئے ارض پر خلافت اللہ کے گرے ہوئے علم کی پھر سے اقامت۔

۱۹۴۱ء میں قائم ہونے والی تحریک اسلامی دراصل اسی کے لیے برپا کی گئی تھی جو غالب

اسلام نہاد لوگوں پر مشتمل تھی۔

احوال و آثار بتاتے ہیں کہ اس تحریک کا نقطہ عروج ۲۳-۱۹۴۴ء تھا۔ اللہ کی رضا کے لیے برپا ہونے والے کسی فرد یا جماعت کا نقطہ عروج وہ لمحہ ہوتا ہے جب اس فرد یا اس کے پیچھے چلنے والوں کے قلوب پر عرش کی روشنی براہ راست منعکس ہو رہی ہو۔ جو اللہ چاہتا ہو وہی ان کے قلوب پر مترشح ہو رہا ہو۔ اور ان پر مرضیات الہی کی ایسی سرمستی طاری ہو کہ اگر راہ میں ہمالیہ پہاڑ بھی آجائے تو وہ اسے بھی روند ڈالنے کا عزم رکھتے ہوں۔ علامہ اقبال نے اسی کیفیت کو اس طرح ظاہر کیا ہے:

عرش معلیٰ سے کم سینہ آدم نہیں	گرچہ کف خاک کی حد ہے سپہر کبود
مرد سپاہی ہے وہ اس کی زرہ لا الہ	سایہ شمشیر میں اس کی پنہ لا الہ
تجھ سے ہوا آشکار بندہ مومن کا راز	اس کے دنوں کی تپش اس کے شبوں کا گداز
اس کا مقام بلند اس کا خیال عظیم	اس کا سرور اس کا شوق اس کا نیاز اس کا ناز
ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ	غالب و کار آفرین کار کشا کار ساز
خاکی و نوری نہاد بندہ مولا صفات	ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

یہ کیفیت مولانا مودودی علیہ الرحمۃ پر ۲۳-۱۹۴۴ء میں طاری تھی۔ ان کی تحریروں اور تقریروں کا نقطہ کمال ان کی وہ تقریر ہے جو روداد حصہ دوم میں درج ہے۔ یہ تقریر ایک حجۃ البالغہ تھی۔ یہ تقریر قول فیصل تھی۔ اور آج یہ تقریر برصغیر کے مسلمانوں کی بد بختی کی وہ دستاویز ہے جس پر ۱۹۴۷ء میں قدرت نے فیصلہ کر دیا۔

۲۶ مارچ ۱۹۴۴ء کو دارالاسلام پٹھان کوٹ کی تقریر سے پوری طرح واضح ہوتا ہے کہ مولانا اس راز کو پا چکے تھے کہ ہر چند کہ اللہ تعالیٰ کی رضا برصغیر کے مسلمانوں کی طرف مائل ہے لیکن یہاں کے مسلمان اور ان کی چلی آرہی ذہنیت اور ان میں پایا جانے والا تصور مذہب اس عظیم ذمہ داری کو اٹھانے کے قابل نہیں ہے۔ چنانچہ اس کا واضح اظہار مولانا نے ۱۹ اپریل ۱۹۴۵ء کو کر دیا:

”میں آپ حضرات کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ میری طرف سے دعوت کی ایک ہی صدا سن کر ہندوستان کے مختلف گوشوں سے موجودہ زمانے کی پرصوبت

سفر کی تالیفیں برداشت کرتے ہوئے یہاں جمع ہو گئے۔ اس طرح میری آواز پر لبیک کہہ کر آپ نے میری طاقت میں بھی اضافہ کیا اور اپنی طاقت میں بھی۔ ایسا نہ کرتے تو میں اپنی جگہ کمزور ہو جاتا اور آپ اپنی جگہ اور نتیجہ یہ ہوتا کہ ہماری یہ تحریک جو ایک بہت بڑے عزم کا اظہار ہے خود بخود ٹھنڈ کر رہ جاتی۔ آپ جب کسی شخص کو کسی مقصد عظیم کے لیے خود اپنا امیر بناتے ہیں تو اس کی اطاعت کر کے دراصل اپنی ہی طاقت کو مضبوط کرتے ہیں۔ جس قدر زیادہ آپ کے اندر اتانیت و خود پسندی ہوگی اور جتنی کم اطاعت کا اظہار آپ سے ہوگا اتنا ہی آپ کا اپنا بنایا ہوا امیر کمزور ہوگا۔ اور اسی قدر اس کی کمزوری کی وجہ سے آپ کی جماعتی طاقت ضعیف ہوگی۔ اور اس کے برعکس جس قدر زیادہ آپ کے قلب و دماغ پر اپنے مقصد کا عشق حاوی ہوگا اور اس عشق میں جتنا زیادہ آپ اپنی خودی کو فنا کریں گے اور جتنی زیادہ اپنے مقصد کی خاطر اطاعت امر کا صدور آپ سے ہوگا۔ اسی قدر زیادہ آپ کا مرکز قوی ہوگا۔ اور آپ کی جماعتی طاقت زبردست ہوگی۔ میں دیکھ کر اکثر اپنی جگہ خوش ہوتا ہوں کہ ہماری اس جماعت میں شخصیت پرستی اور ذہنی غلامی موجود نہیں ہے۔ بلکہ ہر شخص کے اندر اچھی خاصی نقادانہ نظر موجود ہے۔ اور سب سے بڑھ کر آپ کی تنقیدی نگاہیں خود میرے اوپر پڑتی ہیں لیکن یہ خیال رکھئے کہ جتنی کڑی تنقیدی نگاہ آپ مجھ پر ڈالتے ہیں اور آپ کا فرض ہے کہ ایسا کریں اتنی ہی کڑی تنقیدی نگاہ میں بھی آپ پر ڈالتا ہوں اور میرا بھی یہ فرض ہے کہ ایسا کروں۔ آپ سے امر کی اطاعت اور ضابطے کی پابندی اور رضاکارانہ خدمت کی ادائیگی میں جتنی کمزوری ظاہر ہوتی ہے اتنا ہی میں اپنے آپ کو بے بس پاتا ہوں اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ایسی بندوقوں سے کام لے رہا ہوں جو لبلبی دبانے پر بھی غار نہیں کرتیں۔ اور ظاہر ہے ایسے ہتھیاروں کو لے کر کون ایسا نادان ہوگا جو کسی بڑے اقدام کا ارادہ کر بیٹھے۔“

(روداد جماعت اسلامی حصہ سوم، ۴۵-۱۹۴۴ء صفحات ۱۰-۱۲)

کائنات میں معرکہ خیز و شر کے مرحلوں میں سے یہ اس صدی کا سب سے سنگین مرحلہ تھا۔ ٹھیک اسی وقت جب حزب اللہ بننے کے لیے منتخب کی جانے والی برصغیر کی امت مسلمہ ان داخلی کمزوریوں، بے یقینی اور بے پروائی کی صورت حال سے گزر رہی تھی روئے ارض پر حزب الشیطان بڑے بڑے فیصلے کر رہا تھا۔

یکم جنوری ۱۹۴۲ء کو ریاستہائے متحدہ امریکہ یعنی ریاست دجال کے پیش خیمہ کے صدر

فرینکلن ڈوائٹ روزولٹ (Franklin D. Roosevelt) نے اس عبوری ریاست دجال یعنی U.N.O. کا خاکہ پیش کر دیا۔ ۲۵ اپریل تا ۲۶ جون ۱۹۴۴ء کو سان فرانسسکو میں اس کا چارٹر تیار کیا گیا۔ اگست۔ اکتوبر ۱۹۴۴ء میں ڈمبرٹن اوکس (Dumbarton Oaks) میں اس پر بحث ہوئی۔ اور جون ۱۹۴۵ء کو ۵۰ ابلیسی ملکوں نے اس عبوری دجالی ریاست کے چارٹر پر دستخط کر دیئے۔ اور ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو ان ملکوں کی توثیق سے روئے ارض پر ابلیس اور یہودیوں کی ریاست دجال کی عبوری حکومت قائم ہو گئی۔^۳

اس وقت اللہ، عرش اور السموات والارض کی کیفیات کیا ہوں گی کوئی بھی شخص اس کا اندازہ کر سکتا ہے۔ اس روئے ارض سے عرش بریں تک کیسا طوفان برپا ہو گا۔ ایک طرف حزب الشیطان ابلیس کے ایک اشارے پر خلافت اسلامیہ کو گرا کر ایک عالمی دجالی ابلیسی خلافت قائم کر رہا تھا اور دوسری طرف نام نہاد حزب اللہ اللہ کی طرف سے بار بار متوجہ کرنے اور فرشتوں کی ہر ممکن مدد کے وعدے کے باوجود اٹھ کر بیٹھنے تک کے لیے تیار نہ تھا۔

۲۶ مارچ ۱۹۴۴ء کی مولانا مودودی کی تقریر صاف بتا رہی ہے کہ برصغیر کی امت مسلمہ اس عالمگیر ذمہ داری کے اٹھانے کے تعلق سے اللہ کی رضا کا ساتھ دینے کی منکر ہو گئی ہے اور ۱۹ اپریل ۱۹۴۵ء کو حزب اللہ نے اللہ کے حکم پر اٹھ کھڑا ہونے اور اس کی رضا پوری کرنے سے صاف انکار کر دیا جبکہ اس کے ٹھیک ۳۳ دن بعد حزب الشیطان ابلیس کی حکم کی تعمیل کے لیے عملی اقدامات کے عہد کی توثیق کر رہے تھے اور ٹھیک چھ ماہ بعد ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو انہوں نے ابلیس کی حکومت عملاً قائم کر دی۔

بلاشبہ برصغیر کی امت مسلمہ حضرت علامہ اقبال کے دوسرے بازو 'غالب اسلام نہاد' کی دعوت پر بھی ایک کہنے سے قاصر رہی اور اس طرح رضاء الہی کے کفر کی ایک بار پھر مرتکب ہو گئی۔ برصغیر کی امت مسلمہ نے ۱۹۱۲ء سے لے کر ۱۹۳۸ء تک اللہ کی رضا پر لبیک کہنے اور اپنی آفاقی ذمہ داریاں ادا کرنے سے جن کا اظہار علامہ اقبال نے "ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے" اور "لا کہیں سے ڈھونڈھ کر اسلاف کا قلب و جگر" سے کیا تھا — جو کفر کیا اس کی پاداش میں وہ اب تک اللہ کے عذاب میں گھری ہوئی ہے۔ اور ۱۹۴۸ء کے بعد سے آج ۲۰۰۰ء تک پورے برصغیر میں اسے اتنے عذاب کے طمانچے لگے ہیں کہ اس کی شکل پہچانی نہیں جا رہی ہے۔

اب مولانا مودودی اور ان کے ساتھ اس چھوٹی سی جمعیت کی ذمہ داریاں سوا ہو چکیں تھیں۔ تاریخ منہر کہ خیر و شر میں یہ گروہ ۱۹۴۵ء میں ایک تاریخی مقام پر پہنچ گیا تھا۔ اس کے پاس صرف دورا ہیں تھیں —

(۱) یہ گروہ اپنی جگہ کتنا ہی بے بضاعت سہی مگر اللہ کی رضا کی تکمیل کے لیے اور اللہ کی رضا کے عین مطابق نکل کر صف آرہو جاتا۔ اور اس کی تکمیل کرنے کی کوشش کرتا۔

(۲) باعلانیہ یا بالواسطہ پہلو تہی کر جاتا۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ:

(۱) بر صغیر کی امت مسلمہ اللہ کی رضا پر لبیک کہنے سے کافر ہو گئی تھی اور اب عذاب اس کا مقدر تھا۔

(۲) اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ جس گروہ نے مولانا مودودی کی پکار پر لبیک کہا تھا اس میں ایسے لوگ خاصی تعداد میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے جن کو اس کام سے کوئی گہری دلچسپی نہیں تھی۔ (ملاحظہ ہو امیر جماعت کی تقریر: رواد اجتماع دارالاسلام حصہ دوم، دوسرا پیرا)

(۳) اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اگر ان غیر یکسو یا نیم یکسو لوگوں سے یکسر الگ ہو جایا جاتا تو باقی رہنے والے مخلصین سو ڈیڑھ سو سے زیادہ نہ ہوتے۔

ان سب باتوں کے باوجود اللہ کی رضا کے ادراک اور اس کے تقاضے پورے کرنے کی ضرورت اور ایسی صورت میں اس کی نصرت کے یقین کا تقاضا تھا کہ حضرت مولانا اؤل الذکر راہ اختیار کرتے۔ لیکن اس عاجز کی ناقص رائے ہے کہ حضرت مولانا مودودی عین اس وقت ضرور ایک تذبذب کا شکار ہو گئے اور یہ تذبذب معروف فقہ کی اجتہادی غلطی نہیں تھی بلکہ معرکہ خیر و شر کی اجتہادی غلطی تھی جہاں دوسرا موقع نہیں ملتا کہ تلافی کی جائے۔ اب یا تو اللہ از خود معاف کر دے یا لوگ توبہ کریں اور اللہ قبول کر لے ورنہ عذاب آکر رہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ماکان لنبی ان یکون له اسری حتی یثخن فی الارض تریدون
عرض الدنيا واللہ یرید الآخرہ واللہ عزیز حکیم۔ لولا کتب من اللہ سبق

لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابَ عَظِيمٍ۔ (الانفال: ۶۷-۶۸)

ترجمہ:

کسی نبی کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک کہ وہ زمین میں دشمنوں کو اچھی طرح کچل نہ دے۔ تم لوگ دنیا کے فائدے چاہتے ہو، حالانکہ اللہ کے پیش نظر آخرت ہے۔ اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔ اگر اللہ کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جاتا تو جو کچھ تم لوگوں نے کیا ہے اس کی پاداش میں تم کو بڑی سزا دی جاتی۔

اس عاجز کی ناقص رائے میں حضرت مولانا کے تذبذب کا بنیادی سبب یہی تھا کہ فیصلہ کرتے وقت ان کی نظر جتنی اللہ کی رضا کے تقاضوں اور اس کی عظمت پر مرکوز تھی خود اللہ کی رضا اور اس کی نزاکت پر نہیں رہ پائی۔

ایک مثال سے اسے واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں:

ایک شائستہ اور مہذب آدمی کو اپنے بیٹے کو کسی مشہور معالج سے جو ایک بڑے ہسپتال میں ہے دکھانا ہے۔ ظاہر ہے وہ شخص معالج سے اپوائنٹمنٹ لے گا۔ معقول کپڑے پہن کر بیٹے اور فیس اور دیگر اخراجات کے لیے مناسب رقم لے کر گھر سے نکلے گا اور تب جا کر کہیں معالج کو دکھلائے گا۔ ہر معقول آدمی سے اسی کی توقع کی جاتی ہے۔

لیکن اگر اسی شائستہ اور مہذب آدمی کا بیٹا گھر پر اچانک کسی سنگین حادثے کا شکار ہو جائے اور نوبت یہ آجائے کہ اگر اسے چند منٹوں کے اندر کسی مناسب ہسپتال تک نہ لے جایا گیا تو وہ دم توڑ دے گا۔ اب اس بیٹے کو بچانے کی فکر اور معقولیت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ مہذب آدمی جس لباس میں ہے خواہ وہ تہبند اور بنیان ہی میں کیوں نہ ہو اسے لے کر جس صورت سے بھی ہو کسی قریبی ہسپتال تک پہنچ جائے۔ اب اگر اس صورت میں وہ شخص اپنی شائستگی اور رکھ رکھاؤ کا ویسا لحاظ رکھے گا جیسا وہ عام حالات میں کرتا ہے تو وہ غیر معقول اور جان بچانے کے تقاضے کے خلاف ہو گا۔ حالانکہ ایسی شائستگی بجائے خود قطعاً غیر معقول نہیں بلکہ ایک خوبی کہی جاتی ہے۔

ٹھیک یہی صورت حال ۱۹۴۴ء اور ۱۹۴۵ء میں تھی:

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی پکار کو سلطنت مغلیہ کے بادشاہوں — جہانگیر نے ٹھکرادیا اور شاہجہاں اور عالمگیر نے اس کے کماحقہ تقاضے پورے نہیں کیے چنانچہ اللہ کا عذاب اتر ا اور برصغیر کے مسلم حکمرانوں کو معزول کر دیا گیا۔ اب برصغیر کا کوئی بادشاہ خلافت اسلامیہ

قائم نہیں کر سکتا۔ بلکہ ممکن ہے یہ بھی اللہ کا فیصلہ ہو گیا ہو کہ پوری روئے ارض کا کوئی مسلم بادشاہ اب قیامت تک اس سعادت کو نہ پاسکے۔ تاریخ نے دیکھا کہ برصغیر سے صرف سلطنت مغلیہ ہی نہیں، اسلامی انتہا کا بھی صفایا ہو گیا۔ اور غلامی مقدر بن گئی۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی پکار کو برصغیر کے روایتی علماء نے ٹھکرا دیا۔ چنانچہ اللہ کا عذاب اتر اور برصغیر کے روایتی علماء معزول کر دیئے گئے۔ اب برصغیر کا کوئی روایتی عالم دین خلافت اسلامیہ قائم نہیں کر سکتا۔ بلکہ ممکن ہے یہ بھی اللہ کا فیصلہ ہو گیا ہو کہ پوری روئے ارض کا کوئی روایتی عالم دین اب قیامت تک اس سعادت کو نہ پاسکے گا۔ تاریخ نے دیکھا کہ برصغیر سے روایتی علماء کی قدر و منزلت ہی رخصت نہیں ہو گئی بلکہ اہل حکومت اور اہل ثروت اور ان کے مال حرام سے استفادہ ان کا مقدر بن گیا۔

حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی پکار کو برصغیر کے ”غالب مغرب نہاد“ طبقے نے ۱۹۴۰ء میں ٹھکرا دیا۔ چنانچہ اب اس طبقے سے اس کی کوئی امید باقی نہیں رہ گئی تھی کہ وہ اللہ کی رضا کو پورا کرتا۔ ظاہر تھا کہ اب اس غالب مغرب نہاد طبقے کا مقدر عذاب تھا۔

اور یہی وہ بات تھی جس کا ادراک حضرت مولانا مودودی کو کسی دوسرے سے زیادہ تھا جو سبب بنا تھا سیاسی کشمکش حصہ دوم کی تصنیف کا۔

چنانچہ جیسا کہ اس عاجز نے لکھا ہے کہ ۱۹۴۴ء میں مولانا مودودی علیہ الرحمۃ اور ان کے ساتھ مخلصانہ طور پر وابستہ اس چھوٹی سے جمعیت کی ذمہ داری تاریخی نقطے پر پہنچ چکی تھی۔ کائنات میں وقوع پذیر ہونے والے حوادث اور اللہ کی رضا کے ادراک کا تقاضا تھا کہ حضرت مولانا اس چھوٹی سی جمعیت کو ہی لے کر میدان میں آجاتے اور وہ سب کر جاتے جس کا تقاضا اللہ پوری امت مسلمہ سے کر رہا تھا اور جس کے تعلق سے اللہ تعالیٰ کی نظر بار بار برصغیر پر پڑ رہی تھی۔

یہاں ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ آخر حضرت مولانا مودودی علیہ الرحمۃ اللہ کی رضا کے ادراک اور اس کی تعمین میں کیسے تذبذب کا شکار ہو گئے؟ اور یہ کہ وہ کوئی نبی تو نہیں تھے کہ اللہ تعالیٰ ان پر وحی بھیج کر انہیں واضح طور پر بتا دیتا کہ یہ میری مرضی ہے۔ اب اگر اللہ کی مرضی اس طرح معلوم ہونے کے بعد وہ پہلو تہی کرتے تو بلاشبہ مورد الزام ہو سکتے تھے۔ لیکن صورت موجودہ میں وہ کیونکر مورد خطاء ہو سکتے ہیں؟

واقعہ یہ ہے کہ قرآن و احادیث میں غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ بلاشبہ انبیاء و وحی اور ارسال ملائکتہ سے سرفراز ہوتے تھے اور بعض اوقات انہیں متعین طور پر بھی بتایا جاتا تھا کہ اللہ کی رضا کیا ہے اور یہ کہ انہیں کیا کرنا چاہئے۔ لیکن ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ اکثر نہیں ہوتا تھا۔ عام طور پر انبیاء بھی آفاق و انفس پر غور کر کے اللہ کی رضا کو جاننے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے کبھی اظہار رضا اور تعمیل کے درمیان توثیق ہوتی تھی اور کبھی تعمیل کے بعد۔

یہاں اس کی گنجائش تو نہیں کہ اس پر تفصیلی روشنی ڈالی جائے۔ لہذا صرف دو مثالیں دی جاتی ہیں جن سے کئی باتیں ان شاء اللہ واضح ہو جائیں گی۔ مثلاً یہ کہ اللہ کی رضا بڑے نازک امور میں بھی کیسے ظاہر ہوتی ہے؟ وہ خفی ہوتی ہے یا جلی؟ متعین ہوتی ہے یا غیر متعین؟ بندہ یا گروہ اس کا ادراک کیسے کرتا ہے؟ یا کیونکر کرنا چاہئے؟ اس کی توثیق کیسے ہوتی ہے؟ وغیرہ۔ اس کی پہلی مثال انفرادی سطح یا سب سے پہلی اجتماعی سطح کی ہے اور دوسری اجتماعی سطح کی۔

(۱) فلما بلغ معه السعی قال یبنتی انی اری فی المنام انی اذبحک فانظر ماذا یرى۔ قال یا بت افعل ماتو مر ستجدنی ان شاء اللہ من الضبرین۔ فلما اسلما وتلا للجبین ونادینہ ان یا ابراہیم قد صدقت الرءنا انا کذلک نجزی المحسنین۔ ان هذا لہو البلوا المبین وفدینہ بذبح عظیم وترکنا علیہ فی الآخرین سلم علی ابراہیم کذلک نجزی المحسنین انه من عبادنا المؤمنین۔ (الصافات: ۱۰۲-۱۱۱)

ترجمہ:

وہ لڑکا جب اس کے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے کی عمر کو پہنچ گیا تو (ایک روز) ابراہیم نے اس سے کہا، ”بیٹا، میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں اب نو بتاتیرا کیا خیال ہے؟“ اس نے کہا، ”ابا جان، جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اسے کر لے، آپ ان شاء اللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔ آخر کو جب ان دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور ابراہیم نے بیٹے کو ماتھے کے بل کرادیا اور ہم نے ندادی کہ اے ابراہیم تو نے خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی۔ اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیے میں دے کر اس بچے کو چھڑا لیا۔ اور اس کی تعریف و توصیف ہمیشہ کے لیے بعد کی نسلوں میں چھوڑ دی۔ سلام ہے

ابراہیم پر۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً وہ ہمارے مؤمن بندوں میں سے تھا۔

(۲) کما اخرجک ربک من بیتک بالحق وان فریقاً من المؤمنین لکڑھون۔ یجادلونک فی الحق بعد ماتبین کانما یساقون الی الموت وهم ینفلرون۔ واذ یعدکم اللہ احدی الطائفین انہا لکم وتودون ان غیر ذات الشوکیۃ تھون لکم ویرید اللہ ان یحق الحق بکلمتہ ویقطع دابر الکفرین۔ لیحق الحق ویبطل الباطل ولو کرہ المجرمون اذ تستغیثون ربکم فلیستجاب لکم انی معکم بالف من الملئکۃ مردفین۔ وما جعلہ اللہ الا بشری ولتطمئن بہ قلوبکم وما النصر الا من عنداللہ ان اللہ عزیز حاکم۔ (الانفال : ۶-۱۰)

ترجمہ:

جیسے نکالا تجھ کو تیرے رب نے تیرے گھر سے حق کام کے واسطے اور ایک جماعت اہل ایمان کی راضی نہ تھی۔ وہ تجھ سے بھگڑتے تھے حق بات میں اس کے ظاہر ہو چکنے کے بعد گویا وہ ہانکے جاتے ہیں موت کی طرف آنکھوں دیکھتے اور جس وقت تم سے وعدہ کرتا تھا اللہ دو جماعتوں میں سے ایک کا کہ وہ تمہارے ہاتھ لگے اور تم چاہتے تھے کہ جس میں کائنات لگے وہ تم کو ملے اور اللہ چاہتا تھا کہ سچا کر دے سچ کو اپنے کلاموں سے اور کاٹ ڈالے جزا کافروں کی تاکہ سچا کرے سچ کو اور جھوٹا کر دے جھوٹ کو اور اگرچہ ناراض ہوں گنہگار۔ جب تم لگے فریاد کرنے اپنے رب سے تو وہ پہنچا تمہاری فریاد کو کہ میں مدد بھیجوں گا تمہاری ہزار فرشتے لگا کر آنے والے اور یہ تو دی اللہ نے خوشخبری اور تاکہ مطمئن ہو جائیں اس سے تمہارے دل اور مدد نہیں مگر اللہ کی طرف سے بے شک اللہ زور آور ہے حکمت والا۔

چنانچہ کسی وقت خاص میں اللہ کی رضا کا ادراک ضروری ہے۔ قوت، صلاحیت اور وسائل پر غور ثانوی ہیں اور جب اللہ کی رضائے خاص کا معاملہ ہو تو اس صورت میں قوت، صلاحیت اور وسائل پر غور کرنا حرام ہے بلکہ کفر ہے۔ اس لیے کہ اس میں اپنی بے بضاعتی کا تصور باقی نہیں رہتا اور اللہ کی قوت و قدرت کا معاملہ ہوتا ہے۔ اللہ کی ایسی رضا پر لبیک نہ کہنا حزم و احتیاط کے دائرے میں نہیں آتا بلکہ خواہش کرنے والے اللہ کی قوت و قدرت پر عدم اعتماد کا معاملہ بن جاتا ہے۔

یہ ہمارا ایسا ہی سمجھتا ہے کہ اگر ۱۹۴۴ء اور ۱۹۴۵ء کے مابین زمین پر اللہ کی مرضی پوری

ہو جاتی اور ایک مٹھی بھر جمعیت ایک گھاؤں میں ہی سہی اس کائناتی Paradigm کے ساتھ برپا ہو جاتی تو:

(۱) نہ جاپان کو شکست ہوتی۔

(۲) نہ روئے ارض پر امریکہ سپر پاور بنتا۔

(۳) نہ اقوام متحدہ کے نام سے عبوری حکومت دجال قائم ہوتی۔

(۴) نہ ریاست اسرائیل کا قیام ہوتا۔

(۵) نہ بعد کی دنیا اس معنی میں (Bi-Polar) ہوتی۔

(۶) نہ آج نیو ورلڈ آرڈر کا قیام ہوتا۔

یہ تو ساری دنیا جانتی ہے کہ جاپان کو عملاً شکست نہیں ہوئی۔ یہ تو محض ایک غلط فہمی کا نتیجہ تھا کہ جاپان نے مزید تباہی سے بچنے کے لیے جنگ بندی کر لی اور ہتھیار ڈال دیے۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ:

(۱) پہلا ایٹم بم Little Boy جو ۵ اگست ۱۹۴۵ء کو ہیروشیما پر B-29 کے

ذریعہ فضا سے گرایا گیا — اور جس کی Height of Burst (Ft) — 1900+50 تھی اور جو 15 کیلوٹن کی طاقت کا تھا اور

(۲) دوسرا ایٹم بم Fat Man جو ۹ اگست ۱۹۴۵ء کو ناگاساکی پر B-29 کے

ذریعہ فضا سے گرایا گیا اور جس کی Height of Burst (Ft) — 1650+33 تھی اور جو 21 کیلوٹن کی طاقت کا تھا امریکہ کے اسلحہ خانہ کے آخری ہتھیار ہیں اور اب یہ دونوں ہی ایٹم بم گرا دیئے گئے ہیں اور اس طرح اس کے پاس تیار نوکلیائی مادے کے 55 کیلوٹن مواد میں سے 36 کیلوٹن ہیروشیما اور ناگاساکی پر صرف ہو چکے ہیں اور بقیہ 19 کیلوٹن مواد۔

(۳) اس کے پہلے تجرباتی ایٹم بم Trinity میں جس کا تجربہ ۱۶ جولائی ۱۹۴۵ء کو

نیو میکسیکو کے Alamogordo نامی جگہ میں ٹاور میں کر لیا گیا ہے جس کی Height of

Burst (Ft) 100 تھی — اور جو ۱۹ کیلوٹن کا تھا — ختم ہو چکا ہے اور کم از کم کسی اگلے

ایٹم بم کو تیار کرنے میں اس کی واحد تجربہ گاہ LANL کو کم از کم چھ ماہ لگیں گے —

جب کہ اس وقت جاپان کے پاس اتنی طاقت تھی کہ وہ صرف ۲۴ گھنٹوں میں پورے

امریکہ کو خاک و خون میں غلطاں کر سکتا تھا کہ نہ LANL کا نام و نشان باقی رہتا نہ آئندہ کسی ایٹم بم کے استعمال کا موقع۔

جاپان کے ارباب حل و عقد کے دل میں اتنی سی بات ڈال دینا اللہ کے لیے کیا مشکل تھا۔ لیکن زمین پر اس کی نصرت کیوں اترتی؟ اس کے لیے روئے ارض پر کون برپا تھا جس کے لیے اس کے فرشتے اترنے کی زحمت کرتے۔

ایسا لگتا ہے کہ حضرت مولانا مودودی علیہ الرحمۃ نے اللہ کی رضا سمجھنے سے زیادہ اس کی عظمت اور اس کام کی مشکلات کا اور اپنے رفقاء کی حالت، برصغیر میں امت مسلمہ کے دیگر طبقات کے روئے اور لوگوں کے طعنوں کا زیادہ لحاظ کیا اور بہت ممکن ہے انہیں اس کا احساس ہوا ہو کہ یہ نسل شاید اس ذمہ داری کو اٹھانے سکے گی اس لیے اسے ایک تحریک کی صورت میں اگلی نسل تک لے جانا چاہئے تاکہ شاید اس اگلی نسل میں لوگ اس قابل مل جائیں۔ بہر حال جو بھی ہو اس وقت انہیں اللہ کی رضا کے سمجھنے میں التباس ہو گیا اور انہوں نے تیاری کے عنوان سے طویل راستہ اختیار کر لیا۔

آخر شب دید کے قابل تھی بسکل کی تڑپ

صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

بائیں ہمہ یہ حادثہ حضرت مولانا مودودی علیہ الرحمۃ اور ان کے ساتھ برپا مخلصین کی کوتاہیوں سے زیادہ اس قوم کی کوتاہیوں پر دلالت کرتا ہے جس میں یہ تحریک برپا ہوئی تھی۔ اس مرحلے میں واقع ہونے والے تذبذب کے بعد پھر یہ تحریک کہیں سنبھل نہ سکی۔ وقت کے مدوجزر میں برصغیر کے دیگر تمام طبقات کی طرح رجعت اس کا بھی مقدر بن گئی۔ ابتداءً روئے ارض پر اپنے آفاقی تناظر میں یہ ایک صالح جماعت کی طرح برپا ہوئی تھی۔ پھر قومی ریاست کے اندر اپنے آفاقی تناظر میں کوشاں جماعت بن گئی۔ پھر تیسرے مرحلے میں قومی ریاستی تناظر میں اسلام کے لیے کوشاں جماعت بن گئی اور چوتھے مرحلے میں قومی ریاستی دائرے میں قومی ریاستی تناظر میں معروف و مردوبہ اقدار کے اندر اسلامی توجیہ میں کام کرنے والی جماعت بن کر رہ گئی۔

ارتداد :

ایسا لگتا ہے کہ حضرت مولانا مودودی علیہ الرحمۃ کو پورا پورا اندازہ ہو گیا تھا کہ برصغیر کی

امت مسلمہ نے حضرت مجدد صاحب، حضرت شاہ صاحب اور اب حضرت علامہ اقبال کی پکار کو جھٹلادیا ہے۔ پہلے ان کے 'غالب مغرب نہاد' گروہ نے اور اب 'غالب اسلام نہاد' گروہ نے۔ اور وہ اس طرح کہ اب اس قوم کی تکذیب کی سان پر خود ان کی دعوت چڑھائی جا چکی ہے۔

دقت نافر سے مطالعہ کرنے والا انسان صاف محسوس کر لے گا کہ ۱۹۴۵ء کے بعد مولانا مودودی علیہ الرحمۃ کے تمام اقدامات کی بنیادی روح Rescue Operation تھی۔

یقیناً ان سے ۱۹۴۴ء میں اپنے چھوٹے سے گروہ کو لے کر کھڑے نہ ہونے میں ایک اجتہادی غلطی ہوئی تھی لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا اس میں جو کچھ انہوں نے کیا اس سے بہتر کسی بات کا سوچنا اور کرنا ممکن نہیں تھا۔

چنانچہ ان کی وہ تقریر برصغیر میں مسلمانوں کے اس تاریخی حادثے کی آئینہ دار ہے جو مولانا نے ۲۶ مارچ ۱۹۴۴ء کو دارالاسلام پٹھان کوٹ میں کی تھی:

”اس موقع پر میں ایک بات نہایت صفائی کے ساتھ کہہ دینا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ اس قسم کی ایک دعوت کا، جیسی کہ ہماری یہ دعوت ہے، کسی مسلمان قوم کے اندر اٹھنا اس کو ایک بڑی سخت آزمائش میں ڈال دیتا ہے۔ جب تک حق کے بعض منتشر اجزاء باطل کی آمیزش کے ساتھ سامنے آتے رہیں، ایک مسلمان قوم کے لیے ان کو قبول نہ کرنے اور ان کا ساتھ نہ دینے کا ایک معقول سبب موجود رہتا ہے اور اس کا عذر مقبول ہو تا رہتا ہے۔ مگر جب پورا حق بالکل بے نقاب ہو کر اپنی خالص صورت میں سامنے رکھ دیا جائے اور اس کی طرف اسلام کا دعویٰ رکھنے والی قوم کو دعوت دی جائے تو اس کے لیے ناگزیر ہو جاتا ہے کہ یا تو اس کا ساتھ دے اور اس خدمت کو انجام دینے کے لیے اٹھ کھڑی ہو جو امت مسلمہ کی پیدائش کی ایک ہی غرض ہے یا نہیں تو اسے رد کر کے وہی پوزیشن اختیار کر لے جو اس سے پہلے یہودی قوم اختیار کر چکی ہے۔ ایسی صورت میں ان دوراہوں کے سوا کسی تیسری راہ کی گنجائش اس قوم کے لیے باقی نہیں رہتی۔ یہ عین ممکن ہے کہ اس دو ٹوک فیصلے میں اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے مسلمانوں کو ڈھیل دے اور اس نوعیت کی یکے بعد دیگرے کئی دعوتوں کے اٹھنے تک دیکھتا رہے کہ وہ ان کے ساتھ کیا روش اختیار کرتے ہیں۔ لیکن بہر حال اس دعوت کی طرف سے منہ موڑنے کا انجام آخر کار وہی ہے جو میں نے آپ سے عرض کر دیا۔ غیر مسلم اقوام کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ لیکن مسلمان اگر حق سے منہ موڑیں اور اپنے

مقصود وجود کی طرف صریح دعوت سن کر اٹھ پاؤں پھر جائیں تو یہ وہ جرم ہے جس پر خدا نے کسی نبی کی امت کو معاف نہیں کیا ہے۔

اب چونکہ یہ دعوت ہندوستان میں اٹھ چکی ہے۔ اس لیے کم از کم ہندی مسلمانوں کے لیے آزمائش کا وہ خوفناک لمحہ آ ہی گیا ہے۔ رہے دوسرے ممالک کے مسلمان تو ہم ان تک اپنی دعوت پہنچانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اگر ہمیں اس کوشش میں کامیابی ہو گئی تو جہاں جہاں یہ پہنچے گی وہاں کے مسلمان بھی اسی آزمائش میں پڑ جائیں گے۔ میں یہ دعویٰ کرنے کے لیے تو کوئی بنیاد نہیں رکھتا کہ یہ آخری موقع ہے جو مسلمانوں کو مل رہا ہے اس کا علم صرف اللہ کو ہے۔ ممکن ہے ابھی کچھ اور مواقع مسلمانوں کے لیے مقدر ہوں۔ لیکن قرآن کی بنیاد پر میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ مسلمانوں کے لیے یہ وقت ہے ایک نازک وقت۔ ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے اس وقت، دو قسم کی دعوتیں ہیں۔ ایک طرف ہماری یہ دعوت ہے جو مسلمانوں کو ٹھیک اس کام کے لیے بلا رہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے مسلم جماعت کی تاسیس و تشکیل کی واحد غرض قرار دیا ہے اور دوسری طرف وہ دعوتیں ہیں جن کے پیش نظر مسلمانوں کے دنیوی مفاد کی خدمت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ان دو متقابل پیکاروں میں سے دوسری پیکار کی طرف مسلمانوں کا فوج ورفوج لپکنا اور پہلی پیکار کو امت کی عظیم اکثریت کا بہرے کانوں سے سننا اکابر امت اور علماء و مشائخ کا اس سے بے اعتنائی برتنایا اس کی کھلی یا چھپی مخالفت پر اتر آنا اور ایک گروہ قلیل کا اس کی طرف بڑھنا بھی تو رکھتے اور سمجھتے اور پس و پیش کرتے ہوئے بڑھنا، میرے نزدیک ایک نہایت بری علامت ہے اور ایک عظیم خطرہ ہے جس میں یہ مسلمان قوم اپنے آپ کو ڈال رہی ہے۔ خوب جان لیجئے کہ اگر اس وقت اس قوم میں سے کچھ آدمی بھی ایسے نہ نکلے جو امہ وسط اور شہداء اللہ بننے کے قابل ہوں اور وہ خدمت انجام دے سکیں جس کے لیے اللہ تعالیٰ اپنی زمین پر ایک صالح اور صلح گردہ کو کمر بستہ دیکھنا چاہتا ہے تو پھر:

فسوف یأتی اللہ بقوم یحبہم ویحبونہ اذلة علی المومنین
اعزة علی الکافرین یجاہدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لومة لائم
ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ واسع علیم۔

ترجمہ: بعید نہیں کہ اللہ کسی دوسری ایسی قوم کو لے آئے جو اللہ کو محبوب ہو اور اللہ اسے محبوب ہو، جو اہل ایمان پر نرم اور کفار پر سخت ہو جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کرے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرے یہ اللہ کا فضل ہے جسے اللہ

عطا کرتا ہے جس کو چاہتا ہے، اللہ بڑی وسعت رکھنے والا اور علیم ہے۔

آپ حضرات یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ آپ دراصل لعلۃ وسط بننے کے امیدوار ہیں۔ آپ کا مقصود یہ ہے کہ اس مقام بلند کو حاصل کریں۔ اتنے بڑے منصب کی امید داری کے لیے اٹھ کھڑا ہونا اور پھر نہ اس کی عظمت کو محسوس کرنا نہ اس کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا، ایک عظیم الشان بے خبری ہے اور اس سے بڑھ کر بے خبری یہ ہے کہ ایک طرف تو آپ ان کم سے کم صفات سے بھی ابھی تک متعفن نہ ہوئے ہوں جو اس کار عظیم کے لیے ضروری ہیں اور دوسری طرف آپ تقاضا کریں کہ فوراً ہی کوئی بڑا قدم اٹھادیا جائے۔ کیا آپ اتنا نہیں سمجھتے اور اس سے ڈرتے نہیں کہ اگر آپ نے کوئی ایسا قدم اٹھایا جس کے لیے ضروری استعداد آپ نے اپنے اندر پیدا نہیں کی ہے تو آپ منہ کی کھا کر پسا ہوں گے۔ اور اس راہ میں پیچھے ہٹنا فرار من الزحف ہے جو خدا کی شریعت میں بہت بڑا گناہ ہے؟ (روداد جماعت اسلامی: روداد اجتماع دار الاسلام: حصہ دوم صفحات: ۱۷-۲۰)

اس طرح برصغیر کی امت مسلمہ نے پچھلی تین صدیوں کی ہر دعوت کو جھٹلادیا۔ چنانچہ اس پورے خطے پر اللہ کا عذاب اترنا شروع ہو گیا جن کی بے شمار صورتیں تھیں۔ لیکن ان تمام صورتوں میں سے سب سے خطرناک عذاب تھا از اغت قلب کا۔ اور جب یہ عذاب اجتماعی صورت لے کر نازل ہوتا ہے تو پھر قوم کی تباہی کے علاوہ کچھ بھی برآمد نہیں ہوتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يُقَوْمٌ لَمْ تُوْذِنُونِي وَقَدْ تَعْلَمُونَ أَنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ۔
(القن: ۵)

ترجمہ: اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو اے قوم میری کیوں ستاتے ہو مجھ کو اور تم کو معلوم ہے کہ میں اللہ کا بھیجا آیا ہوں تمہارے پاس پھر جب وہ پھر گئے تو پھر دیئے، اللہ نے ان کے دل اور اللہ راہ نہیں دیتا فرمان لوگوں کو۔

چنانچہ برصغیر میں امت مسلمہ کے دلوں کا پھیر دیا جانا پہلے فرار من الزحف اور بعد میں ارتداد کی صورت میں سامنے آیا۔

چونکہ اللہ کی سنت یہ بھی رہی ہے کہ سب سے آخری مامور قوم کے احوال پر اس کے احکام مرتب ہوتے ہیں اس لیے برصغیر کی امت مسلمہ پر ۱۹۴۵ء کے بعد جو بھی احکام مرتب

ہوئے وہ تحریک اسلامی یعنی ”غالب اسلام نہاد“ طبقے کے احوال پر مرتب ہوئے۔ اس سے پہلے برصغیر کی امت، مسلمہ پر ۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۰ء جو احکام مرتب ہوئے تھے وہ ”غالب مغرب نہاد“ طبقے کے احوال پر مرتب ہوئے تھے۔ اور اس سے بھی پہلے ۱۷۶۳ تا ۱۹۲۴ء کے مابین برصغیر کی امت مسلمہ پر جو احکام مرتب ہوئے تھے وہ ’روایتی علماء‘ کے احوال پر مرتب ہوئے تھے۔ جن میں بالاکوٹ، ثورۃ الہندیہ ۱۸۵۷ء، تباہی خانوادہ صادقیہ اور ناکامی ریشمی رومال تحریک کے حادثات فاجعہ ہیں۔^۶

اپنے اپنے زمانے میں ہر مامور طبقے کے احوال پر اللہ کے احکام مرتب ہوئے اور بقیہ قوم تبعاً اس میں شمار کی گئی:

فرار من الزحف :

فرار من الزحف سے مراد ہے دل کے ایسے داعیات پر عملی اقدام کرنا جن سے کسی کی تحریکی اور اسلامی ذمہ داریاں ثانوی حیثیت اختیار کر لیں حتیٰ کہ وہ ذہنا ہی نہیں بلکہ جسمانی طور پر بھی تحریکی محاذ سے ہٹ جائے۔

تحریک اسلامی کے اندر فرار من الزحف کا آغاز کلی سطح (Macro level) پر ۱۹۴۸ء میں اور جزوی سطح (Micro Level) پر ۱۹۶۰ء کے بعد شروع ہوا اور ۱۹۷۰ء آتے آتے اس نے طوفان کی صورت اختیار کر لی۔ لیکن اس کا آغاز عملاً ۱۹۴۸ء سے ہو گیا تھا۔

تحریک اسلامی میں داخل جس طبقے نے اسے سند جواز عطا کرنے میں پیش قدمی کی وہ ایک چھوٹا سا طبقہ تھا جس نے سب سے پہلے ۱۹۵۰ء کی دہائی میں ’اسلامی معاشیات‘ نام کی بدعت ایجاد کی۔ اور اس کے سہارے پہلے مرحلے میں تحریک اسلامی کی اصل رو کو اپنی خدمات سے محروم کر کے یونیورسٹیوں اور دانشورانہ ماحول میں رہنے کا جواز ثابت کیا اور پھر اسی خدمت کے لیے بعض نے مشرق وسطیٰ اور بعض نے براہ راست یورپ اور امریکہ کا رخ کر لیا۔ اسی دوران مشرق وسطیٰ میں پیٹر وڈالر کی چمک نے سارے بزرگوں کو دے دیا۔ عالم عرب میں کیا ہو رہا تھا اور خود ان پر اللہ نے کیا ذمہ داریاں ڈالی تھیں ان سے بے پرواہ ہو کر یہ لوگ مشرق وسطیٰ جانے لگے اور اس مقام کے محلہ کو چھوڑ کر جہاں فی زمانہ تحریک برپا ہوئی تھی دیگر مقامات پر بخیاں خویش اسلام کی خدمت کرنے لگے۔

فرار من الرحف کی دو بنیادی روئیں اٹھیں:

(۱) پہلی رو بر صغیر سے براہ راست یورپ اور امریکہ کو جاتی تھی۔

(۲) دوسری رو بر صغیر سے براہ مشرق وسطیٰ یورپ اور امریکہ جاتی تھی۔

یوں تو پوری دنیا میں کہیں بھی بے شعوری طور پر نوکری، تجارت اور سیاحت کے لیے جانا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اور اس میں امت کا ہر طبقہ ہمیشہ کم یا بیش رہا ہے۔ لیکن باشعور طبقے کی بڑے پیمانے پر اور سند جواز کے ساتھ محاذ سے ہٹنے کا آغاز تحریک اسلامی میں ۱۹۶۰ء میں ہوا۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ تحریک کے بعض نمایاں اہل علم کا تحریکی ذمہ داریوں کو چھوڑنا اور مشرق وسطیٰ یا یورپ اور امریکہ چلا جانا خلاف اولیٰ نہیں نہرا تو پھر دوسروں نے بھی اپنی اپنی 'ضروریات' کے تحت فیصلے لینے شروع کر دیے۔ جب ملت نے دیکھا کہ یہ بات ایسے طبقے میں شروع ہو گئی ہے، جو 'دار' کی بحثوں میں علماء سے بھی شدید تھے تو پھر بے چارے عام لوگ اور ان کے بعد علماء کرام بھی پیچھے کیوں رہتے خاص طور پر اس صورت میں کہ ان حضرات کی مشرق وسطیٰ اور یورپ کے قیام نے ملک میں ان کی مالی اور معاشرتی حیثیت کو واضح طور پر نمایاں کرنا شروع کر دیا تھا۔

چنانچہ ۱۹۶۰ء کے بعد تحریک اسلامی کے افراد کا، ۱۹۷۰ء کے بعد ردایتی علماء کرام کا اور۔ ۱۹۸۰ء کے بعد عامۃ الناس کا فوج در فوج مشرق وسطیٰ اور یورپ و امریکہ جانا اور وہاں بسنا شروع ہو گیا۔

تحریک اسلامی کے افراد ہوں یا بعد میں علماء کرام ان میں سے ہر ایک کا جانا کسی بھی شرعی دلیل کے بغیر تھا۔ ممکن ہے ان میں سے بعض بڑی مضبوط دلیلیں پیش کریں جو بادی النظر میں معقول بھی معلوم ہوں لیکن حقیقتاً ان میں کوئی وزن نہیں ہے۔

مشرق وسطیٰ جانے والے بیشتر لوگوں کے پاس صرف ایک ہی دلیل تھی اور ہے کہ وہ وہاں پیسہ اور پھر اس سے دنیا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

لیکن یورپ اور امریکہ جانے والوں کا مرض تو اس سے بھی زیادہ پیچیدہ تھا۔ عام طور پر ان کی تہہ میں چار ہی جذبے کار فرما تھے۔ جو ممکن ہے نیک اور خیر کے خوشنما جزو انوں میں پلیٹ کر رکھے گئے ہوں۔ یہ چار جذبے تھے:

(۱) دنیا کماتا

(۲) ہونے کا اتباع کرنا

(۳) میدان عمل سے فرار اختیار کرنا

(۴) مغربی تہذیب کی لطافتوں سے فیضیاب ہونا اور اپنا اور اپنے بال بچوں کا 'مستقبل'

سنوارنا۔

واضح ہو کہ یہاں بحث صرف تحریک اسلامی کے افراد اور پھر ان کے بعد جانے والے علماء کرام کے تعلق سے ہو رہی ہے۔ ان سے پہلے، ان کے ساتھ، اور ان کے بعد جانے والے امت مسلمہ کے عام لوگ جو خواہ از خود گئے ہوں یا ان کی تتبع میں گئے ہوں وہ اس بحث میں شامل نہیں۔ اسی طرح اس بحث میں وہ بھی شامل نہیں جو کچھلی صدیوں میں یورپ گئے اور وہاں بس گئے یا جو یورپی یا امریکی نژاد مسلمان ہیں اور ان کا تعلق وہیں کی نسلوں سے ہے۔

مشرق وسطیٰ یا یورپ جانے والے یہ افراد خواہ کتنی ہی بڑی ڈگریاں رکھتے ہوں یا اپنی جگہ شیخ التفسیر، شیخ الحدیث یا شیخ الفقہ ہوں لیکن انہوں نے کبھی بھی قرآن اور سنت سے استفتاء نہیں کیا۔ جو لوگ ہوئی کے گھوڑے پر چڑھ کر استفتاء کرتے ہیں انہیں نہ قرآن منہ لگاتا ہے نہ آنحضرت ﷺ کی سنت۔ بالہ جو بھی حکمت اس گھوڑے پر چڑھنے سے پہلے پائی جاتی تھی وہ بھی چڑھتے ہی چھین لی جاتی ہے۔

اگر انہوں نے مخلصانہ طور پر جاننا چاہا ہوتا:

(۱) کہ جب نبی آخر الزماں ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے

(الف) انا ارسلنا بالحق بشیرا ونذیرا۔ (البقرہ: ۱۱۹)

(ب) تبارک الذی نزل القرآن علی عبده لیکون للعالمین

نذیرا۔ (الفرقان: ۱)

(ج) وما ارسلناک الا مبشرا ونذیرا۔ (الفرقان: ۵۶)

(د) یا ایہا النبی انا ارسلناک شاهدا ومبشرا ونذیرا۔ (احزاب: ۴۵)

(ه) وما ارسلناک الا کافۃ للناس بشیرا ونذیرا۔ (سبا: ۲۸)

(و) وما ارسلناک الا رحمة للعالمین۔ (الانبیاء: ۱۰۷)

(ز) ان هو الا ذکر للعالمین۔ (ص: ۸۷)

(ح) وما هو الا ذکر للعالمین۔ (التکم: ۵۲)

کہا تو پھر:

(۱) اے میں آپ اور آپ کے ساتھ ساتھ آپ کے اصحاب اس وقت تک اہل مکہ کی اذیتیں کیوں سہتے رہے جب تک وہاں سے نکل جانے کی اجازت نہیں مل گئی؟
 (۲) عرب کے کسی اور گاؤں، شہر علاقہ یا عرب سے باہر کسی اور ملک کی جانب آپ کیوں نہیں چلے گئے تاکہ وہاں تبلیغ دین فرماتے؟ کیا انہیں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ وہ سارے جہاں کے لیے بشر اور نذیر ابنا کر بھیجے گئے ہیں؟ اور یہ کہ ان کے پاس جو ذکر یعنی قرآن ہے وہ ساری روئے زمین کے ایک ایک فرد کے لیے ہے؟ کیا انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ روئے ارض کی ساری زمین اللہ کی ہے؟ اور وہ ساری روئے زمین کے لیے ہی نہیں بلکہ آخری نبی بھی ہیں؟ کیا انہیں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ اللہ کا یہ دین سارے جہان کے لوگوں کے لیے ہے اور ان پر واجب ہے کہ وہ لوگوں کو اس طرف دعوت دیں؟

آپ ﷺ اور آپ کے اصحاب نے ایسا کیوں نہیں کیا کہ جب مکہ والے سننے کے بجائے اذیتیں دینے لگے تو انہوں نے فیصلہ کیا ہو کہ ٹھیک ہے مکہ والے نہیں سنتے ہیں نہ سنیں — یہ دین تو سارے جہان کے لیے بھیجا گیا ہے چلتے ہیں کسی اور شہر اور ملک آخر یہ ان کے لیے بھی تو ہے۔
 آخر انہوں نے ایسا کیوں نہیں کیا؟

(۳) جب مکے میں ظلم بڑھ گیا تو صرف کمزور اور زیادہ مضطر لوگوں کو ہی کیوں اجازت ملی۔ سمجھوں کہ حتیٰ کہ آنحضور ﷺ کو بھی اجازت کیوں نہیں ملی؟

(۴) اس وقت کی (Geo-Political) صورت حال میں یہ اجازت عام کیوں نہ تھی؟ اجازت عام سے مراد یہ بات کہ جن کمزور یا زیادہ مضطر لوگوں کو اجازت دی گئی انہیں آزادانہ اجازت کیوں نہیں دی گئی کہ وہ جہاں چاہیں چلے جائیں۔ شرق میں کسریٰ کی مملکت میں، شمال میں رومی سلطنت میں، جنوب کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں، مصر میں، چین میں، ہندوستان میں حتیٰ کہ نجران میں۔ انہیں اجازت بھی ملی تو صرف حبشہ کے لیے۔ آخر ایسا کیوں؟

(۵) جن کمزور اور مضطر لوگوں کو اجازت ملی ان کو بھی یہ اجازت کیوں نہ ملی کہ ٹھیک ہے حبشہ جاتے ہو تو جاؤ، وہاں جا کر بس جاؤ، کوئی کام یا تجارت کرنا، لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا، اپنا بہترین کردار پیش کرنا، ان کے ساتھ اچھے مراسم پیدا کرنا اور اس طرح تبلیغ دین کرنا، آخر وہ

بھی تو اس نبی آخر الزماں کی امت ہیں اور کیا ہی بہتر ہو کہ تم لوگ وہاں زیادہ سے زیادہ کسب کرنا تاکہ اس سے یہاں مکے کی تحریک اور افراد کی مدد ہو سکے۔ بلکہ نہایت متعین الفاظ میں انہیں ہدایت دی گئی:

لوخرجتم إلى ارض الحبشة فان بها ملكا لا يظلم عنده احد

وہی ارض صدق حتی يجعل الله لكم فرجا مما انتم فيه۔

ترجمہ: (۱) اگر تم لوگ نکل جانے پر ہی مجبور ہو تو زمین حبش کی طرف نکل جاؤ۔

(۲) (زمین حبش کی طرف نکلنے کی تمہیں اس لیے اجازت ہے) کہ وہاں کا

بادشاہ جو لوگ ان کے ہاں ہیں ان کے ساتھ عدل کرتا ہے اور وہاں اس کی بادشاہت ایسی ہے کہ ظلم ہونے نہیں دیتا۔

(۳) اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ ارض صدق ہے۔

(۴) (اور تم لوگ وہاں اس وقت تک ٹھہرے رہو) جب تک کہ اللہ

تمہارے لیے یہاں مکے (لوٹ آنے اور رہنے کی) راہ نہ بنادے تاکہ تم اس صورت حال سے نکل آؤ جو تمہیں درپیش ہے۔

آخر انہیں کیوں پابند کیا گیا کہ وہ اگر جانے پر مجبور ہوں تو صرف حبشہ جائیں۔ وہاں عارضی طور پر رہیں۔ اس وقت تک ہی رہیں کہ جب تک کہ مکے میں واپس آجانے کی صورت نہ پیدا ہو جائے۔ 'حتی' میں یہاں ایک اور نزاکت ہے اور اس طرح 'حتی' اپنا مفہوم بیان کرنے کے ساتھ ساتھ 'لا' کے مفہوم کو بھی متعین کرتا ہے۔ یعنی آنحضور ﷺ کی خواہش اور ترجیح تو یہی تھی کہ وہ لوگ کہیں نہ جاتے اور مکے کے مظالم کو انگیز کرتے۔ لیکن چونکہ آپ ﷺ مومنوں کے لیے رؤف و رحیم تھے اور آپ ان کی تکلیفوں پر بے حد رنجیدہ ہوتے تھے اس لیے بادل ناخواستہ ہی سہی آپ نے اجازت دے دی۔ اور اس لیے 'لو' فرمایا۔ دوسری بات یہ کہ حتی کا مطلب یہ نہیں کہ جب ہم مکے کے حالات کے بارے میں خبر دیں اور باضابطہ اطلاع ملے اور تمہیں اس کی تصدیق ہو جائے کہ ہاں اب مکہ لوٹ آنے میں کوئی حرج نہیں تو مکہ لوٹ آنا بلکہ صورت یہ تھی کہ تم سے یہاں کی تکلیف برداشت نہیں ہوتی تو ٹھیک ہے جاؤ ہم اجازت دیتے ہیں اب جیسے ہی تم سمجھو کہ تمہیں لوٹ آنا چاہئے لوٹ آؤ۔ چونکہ یہ سبھی لوگ مخلصین تھے۔ اور اللہ کے رسول ﷺ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ان کے مکہ سے نکل جانے میں ایک شہمہ برابر بھی کمزوری کو دخل نہیں بلکہ

فی الواقع مظالم ان کی برداشت سے باہر ہو چکے ہیں اس لیے آپ نے اجازت دی۔ یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی ایک ایسی اطلاع ملی (جو اگرچہ بعد میں غلط ثابت ہو گئی) یہ مخلصین واپس چلے آئے۔ اور آکر اس سے زیادہ اذیت میں گرفتار ہوئے۔

ان تمام سوالوں کے جواب میں کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایسا اس لیے تھا کہ آنحضور ﷺ کی ذات گرامی مکہ میں تھی اس لیے ان کا مکہ لوٹ آنا ضروری تھا۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ خود آنحضور ﷺ ہی مکہ میں کیوں تشریف رکھتے تھے؟ وہ خود تمام مومنین کے ساتھ مکہ سے باہر حتیٰ کہ عرب سے باہر کیوں نہیں تشریف لے گئے؟

ممکن ہے، کوئی شخص یہ کہے کہ آنحضور ﷺ اس وقت تک صرف ام القریٰ کے لیے مبعوث کئے گئے تھے اور نبی العالمین بعد میں بنائے گئے۔ ہر چند کہ یہ سوال منصب رسالت سے نا آشنا شخص ہی کر سکتا ہے تو اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اس کا قول درست ہے تو کیا وہ اس سوال کا جواب دے سکتا ہے کہ جب وہ ام القریٰ کے لیے نبی ہو کر تشریف لائے تو انہوں نے ام القریٰ کے لوگوں پر دعوت و اقامت کی حجت پوری کر دی۔ تو جب اس کے قول کے مطابق آنحضور ﷺ پورے جہان کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجے گئے تو انہوں نے سارے جہاں والوں پر وہ حجت کب پوری کی؟ کیا وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ انہوں نے حجت پوری نہیں کی۔ اگر نہیں کی تو اللہ تعالیٰ نے کیسے سند دے دی کہ

(۱) انا اعطینک الکوثر۔

(۲) الیوم یئس الذین کفروا من دینکم فلا تخشوہم واخشون۔

(۳) الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔

اور اس سے پہلے فرمایا گیا :

(۱) ان فتحنا لک فتحا مبینا۔

اور اس کے بعد فرمایا گیا:

اذا جاء نصر الله والفتح ورايت الناس يدخلون في دين الله افواجا

فسبح بحمد ربك واستغفره انه كان توابا۔

یہ تو ہو سکتا ہے کہ اللہ کی برکات اور رحمتیں نبی کے عہد میں نازل ہونا شروع ہوں اور

نبی کی وفات کے بعد بھی سینکڑوں بلکہ ہزاروں سالوں تک جاری رہیں لیکن نبی اپنا فرض منصبی نہ ادھورا چھوڑ کر جاتا ہے نہ کسی دوسرے کے ذمے لگا کر جاتا ہے۔ وہ پورا کر کے ہی جاتا ہے۔ اور آنحضور ﷺ بھی اپنا فرض منصبی احسن طریقے سے پورا فرما کر ہی تشریف لے گئے۔ اور اس کی اللہ نے انہیں سند بھی دی ہے۔

ظاہر ہے یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آسکتی جو یہ نہیں جانتا کہ قرآن نے ارض کا کیا مفہوم لیا ہے۔ ورنہ یہ کہ دین اللہ اور اسکی حکمت عملی کو ارض سے کیا نسبت ہے اور ارض کیا ہے؟ اور اسکے حدود اور مراتب کیا ہیں اور اس کی ترکیز اور توسیع کسے کہتے ہیں؟

ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ کہے کہ ٹھیک ہے یہ تو عہد نبوی کی بات ہو سکتا ہے۔ لیکن اقامت دین ہو جائے اور اسلامی مملکت ہو تو کوئی شخص کہیں بھی جاسکتا ہے اور کہیں بھی رہ سکتا ہے۔

جی ہاں اول تو اگر اسلامی مملکت ہو تب۔ دوم یہ کہ یہ تو درست ہے کہ اسلامی مملکت ہو تو کوئی شخص اس کے اندر کہیں بھی جاسکتا ہے اور کہیں بھی رہ سکتا ہے۔ لیکن ایسا کہنے والے کو قرآن و سنت کی یہ گہرائی بھی جانی چاہئے کہ ہر شخص جہاں چاہے نہ جاسکتا ہے اور نہ جہاں چاہے رہ سکتا ہے۔ اور قرآن اور کائنات کے تعلق سے یہ فہم اللہ کا وہ خصوصی فضل ہے جسے وہ چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔

چنانچہ عہد صدیقی ہو یا عہد فاروقی کئی مناظر سامنے آتے ہیں:

(۱) حکم بن ابی العاص کو آنحضور ﷺ نے حکم دیا کہ وہ مدینہ چھوڑ دے اور طائف

چلا جائے اور وہاں رہے۔

ابن عبد البر نے الاستیعاب میں جو اسباب بیان فرمائے ہیں وہ محض قیاس ہیں۔ ممکن ہے کہ ایسے واقعات بھی ہوئے ہوں۔ لیکن آنحضور ﷺ نے اسے تعزیراً طائف نہیں بھیجا تھا۔ بات تعزیر سے زیادہ گہری تھی۔ اس لیے یہ کہنا حق بجانب ہے کہ ابن عبد البر نے جو وجوہ بیان فرمائے ہیں وہ محض قیاس ہیں۔ تعزیر کی ایک حد ہوتی ہے۔ جب عہد صدیقی میں یہ معاملہ دوبار سامنے لایا گیا تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے واپسی کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اس حکم کو برقرار رکھا۔ حکم نے یا اس کے کسی رشتے دار نے یہ تو کہا کہ اسے مدینہ واپس

آنے کی اجازت دے دی جائے۔ لیکن کسی نے یہ نہیں کہا کہ اسے بغیر سبب بتائے کیوں مدینہ سے باہر رکھا جا رہا ہے یہ قانون اسلامی کے خلاف ہے اور یہ کہ اگر کوئی مقدمہ خود خلیفہ کے خلاف بھی پیش کیا جائے تو قانون اسلامی اس کا Cognizance لیتا ہے اور حضرت ابو بکر و عمر تو اس معاملے میں سب سے زیادہ فائق تھے۔

(۲) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تمام بڑے صحابہ کو مدینے میں اور وہ بھی اپنے پاس رکھا۔ دوسرے اور تیسرے درجے کے افراد کو عمال کی حیثیت سے متعین کرتے رہے۔ بہت ناگزیر مواقع پر اور وہ بھی دین اللہ کی نزاکتوں کا لحاظ کرتے ہوئے ہی کبھی اس ضابطے میں تبدیلی کی۔ چنانچہ غالباً واحد استثناء وہ واقعہ ہے جب آپ نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو مدینہ سے کوفہ بھیجا۔ چنانچہ آپ نے غیر معمولی الفاظ اس کی وجہ بیان فرمائی۔ آپ نے فرمایا:

اے اہل کوفہ! تم جُمُجُفَةُ الْعَرَبِ ہو۔ اور میرا وہ تیر ہو جس کو میں افتاد پڑنے پر ادھر ادھر پھینکتا ہوں۔ میں نے تمہارے پاس عبد اللہ بن مسعود کو بھیج کر اپنے نفس پر تم کو ترجیح دی ہے۔ (ابن سعد: الطبقات الکبریٰ، جلد ۶، صفحہ ۷۷)

یہ اکابر صحابہ نہ ہر جگہ اپنی مرضی سے جاسکتے تھے اور نہ جا کر بس سکتے تھے۔ جو بات حیرت کی اور سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی نے حضرت عمر سے یہ شکایت نہیں کی کہ آپ کو دارالاسلام میں کہیں بھی جانے اور جا کر بس جانے سے روکنے کا کیا حق ہے؟ اور یہ کہ ہم نہیں مانیں گے یا یہ کہ آپ زیادتی کر رہے ہیں۔ کم از کم اس عاجز کو کسی ایک اہل صحابی کی طرف سے ایسی کسی بات کا علم نہیں۔

(۳) اکابر قریش کو حضرت عمر نے پابند کیا تھا کہ وہ مدینے میں رہیں اور یہ کہ وہ مدینہ سے باہر بغیر اجازت سکونت پذیر نہیں ہو سکتے۔ طبری نے لکھا ہے کہ جب بعض لوگوں نے اس پابندی کے خلاف شکایت کی تو آپ نے خطبہ دیا اور فرمایا: ”لوگو! اسلام بھی اپنی عمر کے منازل و مدارج طے کر کے اب نشوونما اور ترقی کی آخری منزل کو پہنچ چکا ہے یعنی بازل ہو گیا ہے۔ پھر آپ نے فرمایا:

”ہاں مجھے معلوم ہے کہ قریش اب یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے دوسرے بندوں کو نظر انداز کر کے اموال پر قبضہ کر لیں۔ خبردار! جب تک میں زندہ ہوں ہر گز ایسا ہونے نہیں دوں گا۔“

طبری نے مزید لکھا ہے کہ حضرت عمر کو اس امر میں اتنا اصرار تھا کہ ان اکابر قریش کی بات تو جانے دیجئے اکابر مہاجرین میں سے اگر کوئی غزوہ میں شریک ہونا چاہتا تھا تو حضرت عمر اس کی بھی اجازت نہیں دیتے تھے۔ (طبری، ج: ۴، ص: ۳۹۶-۳۹۷)

اسی لیے اس عاجز نے کہا کہ یہ قرآن اور آفاق و انفس کی وہ معرفت ہے اللہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔

ان اکابر صحابہ نے کبھی شکایت نہیں کی کہ حضرت عمر کسی شخص کا ذاتی حق کیسے سلب کر سکتے ہیں کہ وہ اسلام میں جہاں چاہے رہے اور جہاں چاہے جائے۔

نہیں یہ سب وہ عباقرہ تھے جن کو اس کا بخوبی علم تھا کہ دین اللہ کیا ہے؟ آفاق و انفس کی گہرائیاں کیا ہیں؟ قرآن کی معرفتیں کیا ہیں؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ شخص جو روک رہا ہے یہ کون ہے؟ اور یہ جو کچھ کر رہا ہے وہ کیا ہے؟ آج کے وہ لوگ جن کے بارے میں ختمی مرتبت سرور کائنات حضرت محمد ﷺ نے خبر دی تھی:

وہ قرآن پڑھیں گے لیکن ان کے حلقوم کے نیچے وہ نہیں اترے گا۔ (اوکما قال)

ان کا یہ کہنا کہ مشرق وسطیٰ، یورپ اور امریکہ جا کر اسلام، دین اللہ اور مسلمانوں کو فلاں فلاں فائدے ہوئے ہیں درست نہیں۔ ممکن ہے بظاہر یہ فائدے ہوئے ہوں۔ لیکن کیا ضروری ہے کہ وہ فائدے عند اللہ بھی فائدے ہوں۔

چنانچہ اس فرار من الزحف کے کم از کم درج ذیل نقصانات برآمد ہوئے:

(۱) تحریک اسلامی میں صلاحیتوں کا بحران پیدا ہو گیا۔

(۲) برصغیر میں تحریکات اسلامی ویسی معاشرتی کشمکش پیدا کرنے کی حالت میں باقی نہیں رہی جیسی ہونی چاہئے تھی اور اسکی کوششیں ٹھنہ کر رہ گئیں۔

(۳) جو لوگ یورپ یا امریکہ گئے تو انہوں نے اس کا Craze پیدا کر دیا کہ صلاحیتیں پیدا ہو کر تحریک کو ملنے کے بجائے یورپ اور امریکہ منتقل ہو جائیں اور کسی معترض کو ساکت کرنے کے لیے خدمت اسلام، بہترین جواب قرار پایا۔

(۴) اس Craze نے ایسے نوجوانوں کو جو معاشرے میں خالصتاً Careerist طبیعت کے مالک تھے تحریک اسلامی کی طرف مائل کر دیا اس لیے کہ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ

یورپ اور امریکہ۔ بآسانی جانے کے زینوں میں سے ایک زینہ اب تحریکات اسلامی بھی ہے اور دیگر زینوں کے مقابلے میں ہم خرمادہم ثواب کے مصداق بھی۔ لہذا اس نے تحریکوں کو سڑے ہوئے افراد سے بھر دیا ہے۔ جو اپنا مفاد پورا ہوتے ہی اس طرح تحریک کے لیے اجنبی ہو گئے گویا کبھی اس سے دید شنید ہی نہ ہو۔ ان Careerists کی موجودگی نے تحریک میں دیگر مفاسد پیدا کئے سو الگ۔

- (۵) بطور خاص پیٹرو ڈالر نے تحریک اسلامی کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ چنانچہ ۱۹۷۵ء آتے آتے درج ذیل امور میں تحریکات اسلامی شدید بحر ان کا شکار ہو گئی۔
- (۱) نصب العین تحلیل ہونا شروع ہو گیا۔
 - (۲) قیادت کی صفات تحلیل ہونا شروع ہو گئیں۔
 - (۳) کلمہ جامعہ تحلیل ہونا شروع ہو گیا۔
 - (۴) تحریکات مرئی نصب العین سے غیر مرئی نصب العین کی طرف جانے لگیں۔
 - (۵) باطلانہ معاشرے سے کشمکش اور تصادم کے بجائے مفاہمت اور بقائے باہم کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔

(۶) تحریکات کی ترجیحات بدل گئیں۔

(۷) منہج اور طریقہ کار میں سنت سے کھلا انحراف کیا جانے لگا۔

(۸) حتیٰ کہ قرآن و سنت کے الفاظ ان کی معنویت اور تعبیرات میں تبدیلی کی جانے لگی۔

(۹) چنانچہ ان سب کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ تحریکات اسلامی کے بعض افراد اور بعض

حلقوں کے ذریعہ ایک ایسا اسلام پیش کیا جانے لگا جو اسلامی اور مسلم معاشرے کا ملغوبہ تھا اور وہ بھی اس مسلم معاشرے کا جو مغربی معاشرے کا کاشتہ وہ پر داختہ تھا۔

لیکن ظاہر ہے کہ العروۃ الوثقیٰ کے ہاتھ سے چھوٹے ہی ایک ایسا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو سیدھے تباہی کی طرف جاتا ہے۔ مگر ابھی کوئی اضافی شے نہیں کہ کوئی کہے کہ میں زید سے کم گمراہ ہوں اس لیے کہ مثلاً زید اور میں ایک رستی کو تھامے ہوئے دو پہاڑوں کے بیچ کی گہری وادی کو پار کر رہے تھے چنانچہ زید نے رستی چھوڑ دی اور وہ رستی سے دو سو فٹ دور وادی کی طرف گر رہا ہے اور میں نے بھی رستی چھوڑ دی لیکن میں زید سے بہتر ہوں اس لیے کہ میں رستی سے صرف دس

فٹ دور ہی گیا ہوں۔

چنانچہ جن داعیات و ضرورات نے تحریک اسلامی کو مجبور کیا کہ وہ برصغیر میں معاشرہ اور نظاموں کے ساتھ مفاہمت کر لے وہ اس پر قانع کیسے رہ سکتی تھیں۔ اس کی اگلی منزل مشرق وسطیٰ اور یورپ اور امریکہ کے معاشرے، نظام اور تہذیبیں تھیں۔ چنانچہ جلد ہی یعنی ۱۹۷۵ء سے واضح طور پر محسوس ہونے لگا کہ اب ان کی داعیات و ضرورات کا مرکز اسلام اور تحریکات اسلام کو مغرب اور اہل مغرب کی پسند کے مطابق تراش تراش کر قابل قبول بنانا تھا۔ یہ سب کچھ اسلام اور دین اللہ کی خاطر نہیں ہو رہا تھا بلکہ صرف اس لیے ہو رہا تھا کہ مغرب کی فضاؤں کی طرف جانے اور وہاں اس طرح رہنے کے لیے جواز فراہم ہو سکے کہ یہ ایک داعیانہ اقدام ہے اور عین مقاصد شریعت کے مطابق ہے بلکہ اولیٰ ہے۔ جب کہ پوری تاریخ انسانی اس کی گواہ ہے کہ کوئی مرعوب قوم نہ بھی داعی ہوئی ہے نہ دعوت اس کا کام ہے۔ اور نہ کبھی تاریخ میں فکری طور پر غالب کسی قوم نے کسی مرعوب قوم کی دعوت قبول کی ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ ۱۹۴۵ء کے بعد پورے برصغیر پر اللہ کے جواہکامات صادر ہوئے اور جو اثرات مرتب ہوئے وہ سب تحریک اسلامی کے احوال پر ہوئے۔ اس لیے کہ بقیہ طبقات تو پہلے ہی عند اللہ معزول ہو چکے تھے۔

چنانچہ برصغیر میں تحریک اسلامی کے اس فرار من الزحف کا پہلا شعوری اثر روایتی علماء نے قبول کیا اور ۱۹۹۰ء کے بعد وہ بھی جوق در جوق یورپ اور امریکہ جانا شروع ہو گئے۔ وہاں کی چمک نے انہیں بھی مسحور کر دیا۔ وہ پہلے ہی کس کام کے رہ گئے تھے کہ اب اسلام کے لیے دنیا پر اور وہ بھی مغرب کی دنیا پر لات مار دیتے۔ چنانچہ برصغیر کو انہوں نے خیر باد کہنا شروع کر دیا اور انہیں جو ہنر آتا تھا وہ اس میں یورپ و امریکہ جا کر مشغول ہو گئے۔ اور دیکھتے دیکھتے مناظرے ہونے لگے اور مسجدوں میں تالے ڈالے جانے لگے۔ چونکہ یہ سب بد اعمالیاں نہیں تھیں کہ اس کے لیے تحریکات اسلامی کے افراد اور علماء کو مطعون کیا جائے۔

وقت نظر سے دیکھا جائے تو بد اعمالیوں کی دو قسمیں تاریخ انسانی میں پائی جاتی رہی ہیں۔ پہلی قسم مجرد بد اعمالی ہوتی ہے اور دوسری درحقیقت ان بد اعمالیوں پر آئے ہوئے عذاب کی ایک شکل ہوتی ہے۔

چنانچہ سورہ اعراف نے ان دونوں کو یکجا بیان کر کے خوب واضح کر دیا ہے۔ قرآن کا ارشاد

ہے:

فلما عتوا عن مانہوا عنہ قلنا لہم کونوا قردۃ خاسئین۔

(الاعراف: ۱۶۶)

ترجمہ: پھر جب بڑھنے لگے اس کام میں جس سے وہ روکے گئے تھے تو ہم نے

حکم کیا کہ ہو جاؤ بندر ذلیل۔

چنانچہ پہلا عمل از قسم بد اعمالی ہے اور بعد میں قردۃ خاسئین ہو کر کیے گئے اعمال عذاب کا نتیجہ۔ اس لیے اہل نظر جانتے ہیں کہ ۱۹۷۵ء کے بعد یورپ اور امریکہ میں تحریکات اسلامی اور علماء جو کچھ کرنے لگے تھے وہ بد اعمالی نہیں بلکہ ان پر آئے ہوئے عذاب کا نتیجہ تھا۔ ممکن ہے کوئی کہے کہ وہاں موجود تمام لوگ اور تمام کام برے نہیں بلکہ مخلصانہ بھی ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ بات اپنی جگہ درست بھی ہو لیکن میں فقہی احکام اور فقہی مقاصد شریعت کی بحث نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو دینی، قرآنی، نبوی اور اسلامی مقاصد شریعت کی بحث کر رہا ہوں۔ چنانچہ قرآن اور انبیاء کرام علیہم السلام کی سیرت اس پر گواہ ہے کہ جب انبیاء بنی اسرائیل نے لوگوں کو دعوت دی تو ان کے اسی دینی، قرآنی، نبوی اور اسلامی مقاصد شریعت کے جواب میں علماء بنی اسرائیل اور صدیقیوں نے فقہی احکام اور فقہی مقاصد شریعت کے دلائل پیش کیے تھے۔ جن کا ظاہر ہے عند اللہ کوئی وزن نہیں پایا گیا اور ان علماء بنی اسرائیل کے دلائل کو اللہ اور اس کے رسولوں نے ان کے منہ پر مار دیا۔

چنانچہ ۱۹۸۰ء کے بعد اس فرار من الزحف نے مکمل ارتداد کی شکل لے لی۔ اور اس کا ظہور سب سے پہلے تحریکات اسلامی کے اس طائفے میں ہوا جو اسلامی معاشیات کی بدعت پہلے ہی ایجاد کر چکا تھا۔ تاریخ اسلامی کے ان چودہ سو سالوں میں چار عظیم ارتداد و وقوع پذیر ہوئے ہیں۔ ان ارتدادات میں ہو چکا تھا ارتداد معاشی ہے جو اس صدی کی آٹھویں دہائی میں پوری طرح راسخ ہو چکا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ امت محمدیہ میں پیدا ہونے والا آخری اور سب سے بڑا ارتداد ہے جو اس کی اکثریت کو دجال کے قید خانے میں جھونک کر ہی دم لے گا۔ عربوں کی بے حد و حساب دولت کی آمدنی، آخرت، اپنے فرض منصبی اور اپنی موجودہ ذلت و خواری سے بے پروا ہو کر عیش کوشی کی ہوس اور یورپی اور امریکی بینکوں کے عربوں کے سود نے اس ارتداد میں مہمیز کا کام کیا۔ اسلامی معاشیات سے شغل فرمانے والے طبقے نے اس ارتداد کو برپا کیا اور بطور خاص عربوں کو ہم خرما

وہم ثواب کا سبق دیا۔ اور انہوں نے بھی اپنے بے قابو ہوس کے لیے اس نسخہ حلالہ کو نعمت غیر مترقبہ سمجھا۔ اور پھر اس طرح پوری تاریخ اسلامی میں پہلی بار ابلیس نے ہر گھر ہر مسجد ہر مدرسہ کو سود کے فضلے سے بھر دیا۔ سود کا اس عمومی طریقے سے امت کے رگ و پے میں جانے کی دیر تھی کہ دعائیں بے اثر ہو گئیں، عبادات بے جان ہو گئیں، طبیعت میں بے حیائی آگئی اور دلوں پر شیطان کا قبضہ ہو گیا۔ حق سے تنفر بڑھ گیا۔ فحش از خود گوارا لگنے لگا۔

جب دلوں کو اللہ کے حوالے کیا گیا تھا تو اسلامی معاشرے میں مسجدوں کے استنجا خانے بھی مال حرام سے، بکراہیت ہی بنائے جاتے تھے اور ساری زندگی مال حرام کھانے والے بھی پیری میں کسی نیک کام میں حصہ لینے کے لیے حلال آمدنی کسب کر کے یا حلال دولت سے خدمت کیا کرتے تھے۔ اور اب جب دلوں پر ابلیس کا قبضہ ہو گیا تو مسلم معاشروں میں گھروں کے ذاتی استنجا خانے تو حلال اور محنت کی کمائی سے بنائے جاتے ہیں اور مال حرام مسجدوں اور مدرسوں کو بخش دیا جاتا ہے تاکہ اللہ کا گھر بقعہ نور ہو جائے اور اللہ کا کلمہ بلند ہو۔ عرب اپنی کمائی یا تو مغربی بینکوں کے حوالے کرتے ہیں یا مونسے کار لو لے جاتے ہیں تاکہ زمینی آقا خوش رہیں اور سود کی کمائی اللہ کے گھر اور اللہ کی راہ میں دیتے ہیں تاکہ آسمانی آقا بھی ناراض نہ ہو۔

چونکہ تحریک اسلامی کے ماہرین معاشیات زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکتے تھے وہ ان امور کی علمی تنقیح اور توضیح تھی۔ لیکن ان کی تنقیح اور توضیح کو مذہبی اتھارٹی حاصل نہیں تھی۔ ٹھیک یہی وقت تھا جب علماء نے پایا کہ وہ ثواب بھی بڑے کام کے ہیں۔ ان کے پاس حرام کو حلال کرنے کی خداد مشین موجود ہے۔ چنانچہ انہوں نے بھی عالم عرب اور عالم مغرب کو اپنی امیدواری پیش کر دی۔ ابلیس نے اس موقع کو غنیمت جانا اور سارے عالم اسلام میں علمی اور فقہی اکیڈمیوں کا جال پھیلا دیا گیا۔ دوسری طرف مغرب میں ایسے بینک قائم کیے جانے لگے جن کی سودی عمارت میں ایک کمرہ غیر سودی مال کا بھی تھا۔ اور اس کے لیے سارے برصغیر سے بالخصوص ایسے علماء اور ماہرین اسلامی معاشیات بھرتی کیے جانے لگے جو اسے چلا سکیں۔ تیسری طرف بڑے منافعوں کے بلند بانگ دعوؤں کے ساتھ سارے مسلم معاشروں میں سودی کاروبار کو غیر سودی کاروبار کے نام پر پھیلا یا جانے لگا۔ چوتھی طرف ان تمام کوششوں سے پورے عالم اسلام کو مغربی سودی مالی نظام کا زیادہ سے زیادہ حصہ بنانے کی مہم شروع کی گئی۔

متعدی ارتداد:

یہ وہی گھڑی تھی (۱۹۹۱ء) جب ایک طرف مغرب اور اس کے آقا یہودی اس نتیجے تک پہنچ چکے تھے کہ اب یہ اسلام جو رسول اللہ سے امت کو ملا ہے اور جو قرآن اور سنت میں پایا جاتا ہے اور ہم (یعنی یہودی اور مغرب) ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے اور یہ کہ ہماری بقا کے لیے اسلام کو مرنا ہو گا۔ وہی گھڑی مشرق وسطیٰ، یورپ اور امریکہ جانے والے تحریکات اسلامی کے افراد اور علماء کے لیے بھی فیصلہ کن تھی۔ وہ پوری طرح آگاہ ہو چکے تھے کہ ٹینی سن (Tennyson) کے لوٹس ایٹر (Lotus Eater) کی طرح وہ بھی اب اس مغربی جنت سے جانا بھی چاہیں تو نہیں جاسکتے اور اگر یہاں رہنا ہے تو رسول اللہ ﷺ کے اسلام کے ساتھ رہنا مشکل ہے لہذا یہاں رہنے کے لیے اسلام کو چھوڑنا ہو گا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ اسلام کا چھوڑنا بھی اس نسل کے لیے جو مشرق سے مغرب گئی تھی ممکن نہیں تھا لہذا بات یہی ٹھہری کہ ٹھیک ہے اسلام کو ہی بدل دیا جائے۔ اور اسکی ایک ایسی تعبیر کی جائے کہ وہ اسلام بھی کہلائے اور مغرب کو قابل قبول بھی ہو۔ لیکن مغرب کو ان مسلمانوں کی خواہش سے کیا مطلب۔ وہ بھی جانتے تھے کہ یہ لوگ صرف مغرب سے فیضیاب ہونے کے لیے ایسا کر رہے ہیں۔ لہذا ان کو اس سے کیا فائدہ ہوتا؟ ان کا تو فائدہ جب تھا کہ یہ سارے عالم اسلام کو مغرب کا Backyard اور کارخانہ بنانے میں مددگار ہوتے۔ جو اس وقت تک ممکن نہیں تھا جب تک عالم اسلام میں بسنے والی، اسلام اور دین اللہ سے مجنونانہ طور پر چمٹی رہنے والی، رسول اللہ کی ذات کو اپنی جان سے زیادہ چاہنے والی قوم کو رام نہیں کیا جاتا اور اسے مغربی سانچے میں نہ ڈھال دیا جاتا جن کو مغربی استعمار اپنی زنجیروں سے ڈیڑھ سو سال تک اور ان کے بعد ان کے عمل بادشاہ، آمر اور حکام، ملوکیت، آمریت، جمہوریت اور سیکولرزم کی تلواروں سے اب تک رام نہ کر سکے تھے نہ انہیں ان سانچوں میں ڈھال سکے تھے۔

چنانچہ انہوں نے مغرب میں رہنے والے ان تحریکات اسلامی کے افراد اور علماء سے کہا کہ اگر مغرب میں رہنا ہے اور یہاں کی لطافتوں سے لطف اندوز ہونا ہے تو عالم اسلام کی ان تاریک و گندی بستیوں میں رہنے والی ”پاگل“ قوم کو مسلمان مغرب بنانا ہو گا۔ جس طرح اسمیک کا عادی

اسمیک فراہم کرنے والے کی ہر شرط قبول کر لیتا ہے اسی طرح ان لوگوں نے بھی اس شرط کو قبول کر لیا۔ اور ہمہ جہت کارروائی شروع ہو گئی۔

صرف سو سال قبل مغرب کے ایک مبلغ نے دعویٰ کیا تھا:

"East is East and West is West, the twain
Shall never meet."

آج وہی مغرب عالم اسلام کو سمجھا رہا ہے کہ نہیں دونوں مل سکتے ہیں۔

چنانچہ یہودیوں کے ایک 'ہو' نے مغرب میں جانے والے ان تحریکات اسلامی کے افراد اور علماء کو پاگل بنادیا۔ مغرب میں بس جانے والا برصغیر کا ہر تحریکی اور ہر عالم دین اس ایک ہوسے چشم زدن میں مفکر اور ہادی بن گیا۔ انہیں محسوس ہوا کہ وہ صرف مغرب آتے ہی اس قابل ہو گئے ہیں کہ برصغیر میں جو لوگ دینی کوششیں کر رہے ہیں خواہ تحریکی ہوں یا علمی ان کو اب وہی رہنمائی فراہم کر سکتے ہیں۔ دوسری طرف برصغیر کے مسلمانوں پر ان کی تاریخی کوتاہیوں کے سبب آئے ہوئے عذاب نے ان کا یہ حال بنادیا کہ صرف قرآن ہی اسے بیان کر سکتا ہے:

وَضَرَبْتَ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةَ وَالْمَسْكَنَةَ وَبَلَغْتَ مِنْهُمْ
(البقرہ: ۶۱)

ترجمہ: اور ذالی گئی ان پر ذلت اور محتاجی اور پھرے اللہ کا غصہ لے کر۔

چنانچہ حال یہ ہو گیا کہ مغرب کی سیر کا ایک ٹکٹ برصغیر کے بڑے سے بڑے قومی، ملی اور دینی زعم کو خواہ وہ شیخ الحدیث ہوں یا شیخ التفسیر، شیخ شریعت ہوں یا شیخ طریقت پاگل بنادینے کے لیے کافی بن گیا۔

چنانچہ جہاں ایک طرف عالم مغرب میں رہنے والے مفکرین برصغیر کے مسلمانوں کو علم و دانش سکھانے کے لیے، فکری دورے کرنے لگے وہیں دوسری طرف برصغیر کے زعماء سترشدین تربیت کے لیے یورپ اور امریکہ بلائے جانے لگے تاکہ وہاں سے فیضیاب ہو کر زیادہ اچھی طرح برصغیر میں خدمت دین کر سکیں۔

متاع دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی

یہ کس کافر ادا کا غمزہ خوں ریز ہے ساقی

(۱) چنانچہ سوال پیدا ہوا: کیا یہی وہ وقت ہے جس کی خبر آنحضرت ﷺ نے اس طرح

دی تھی کہ:

قال اخبرني أبوذر قال كنت امشي مع رسول الله ﷺ فقال
لغير الدجال أخوفني على امتي قالها ثلاثاً قلت يا رسول الله ما هذا
الذي يخبر الدجال أخوفك على امتك قال آئمة المضلين.
(رواه أبوذر الغفاري، مسند احمد جلد: ۵، صفحہ: ۱۳۴)

ترجمہ: روایت کی حضرت ابوذر غفاری نے: فرمایا کہ میں رسول اللہ ﷺ
کے ساتھ جا رہا تھا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اپنی امت کے اوپر میں دجال کے علاوہ ایک
اور چیز سے ڈرتا ہوں۔ آپ ﷺ نے یہ بات تین بار دہرائی۔ میں نے پوچھا یا رسول
اللہ! دجال کے علاوہ وہ کون سی چیز ہے جس کے تعلق سے اپنی امت کے بارے میں
آپ ڈرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:
گمراہ کرنے والے قائدین۔

کیا یہی وہ وقت ہے کہ امت مسلمہ پر ائمۃ المضلین کا غلبہ ہو گیا ہے؟

عبار اتنا شتی وحسنک (?) واحد

کل إلی ذاک الجمال (?) یشیر

بہر رنگی کہ خواہی جامہ می پوش

من انداز قدت را می شناسم

یہ ہیں وہ اسباب جو اس کے متقاضی ہوئے کہ ایک تجزیہ فوری طور پر امت کے سامنے لایا

جائے تاکہ امت اپنی صورت حال کا جائزہ لے سکے اور اپنی ترجیحات مقرر کر سکے۔



باب دوم

ستارہ و صلیب

قیامت سے قبل وقوع پذیر ہونے والے ان واقعات میں جو بات عجیب لگتی ہے وہ یہ ہے کہ اس معاملے میں تینوں فریق — یہودی — عیسائی اور مسلمان — ایک ہی مسئلے کو اپنا محور قرار دیتے ہیں یعنی — (۱) آمد مسیح (۲) ظہور دجال اور (۳) حکومت عدل کا قیام۔ ان تینوں کے دعوے بظاہر یکساں لگتے ہیں لیکن کیا وہ فی الواقع یکساں ہیں؟ ایسا نہیں ہے اور قطعاً نہیں ہے۔ اس باب میں ان تینوں امور کے تعلق سے نصرانیت اور یہودیت کے نظریات اور عقائد کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر چونکہ کتاب کا اصل موضوع ہے اس لیے اس کا تذکرہ بعد میں اور کسی قدر تفصیلی ہو گا۔ یہودیت اور نصرانیت کے مباحث مختصر ہوں گے۔ (اس تعلق سے علمی اور تفصیلی بحث ان شاء اللہ عالم اسلام کی منصبی و مقصدی صورت حال میں ہوگی) یہاں صرف بقدر ضرورت بحث کی جائے گی۔

اس مسئلے کے تعلق سے یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے تین بنیادی عقائد ہیں۔ مسئلے کو یکسانیت دینے کے لیے میں نے انہیں تین الگ الگ نام دیئے ہیں تاکہ ان ہی تین عنوانات کے تحت یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے عقائد زیر بحث آ سکیں۔ یہ تین عقاید ہیں:

(۱) حضرت مسیح علیہ السلام کی آمد

(۲) دجال کا ظہور

(۳) حضرت مسیح علیہ السلام کے ذریعہ دجال کا خاتمہ اور روئے ارض پر نظام عدل کا

قیام۔

مذکورہ ان تین عنوانات کی تین الگ الگ شکلیں اور پہلو یہودیت، عیسائیت اور اسلام میں پائے جاتے ہیں۔ ان شاء اللہ ان تین گروہوں کے ذیل میں ان کے الگ الگ پہلو اور شکلیں زیر بحث آئیں گی۔

حصہ اوّل : یہودیت

جہاں تک یہودیت کی بات ہے تو ان تینوں مسئلوں پر ان کے عقائد، ان کے صحائف میں درج تفصیلات اور ان پر ان کا رد عمل بے حد پیچیدگی کے حامل ہیں۔ لہذا ہم ان شاء اللہ مختصر لیکن الگ الگ ان پر بحث کریں گے۔

(۱) حضرت مسیح کی آمد: یہ مسئلہ یہودی تاریخ میں تین الگ الگ ادوار میں تین الگ الگ معنوں میں لیا گیا ہے۔ یہ تین ادوار ہیں:

(۱) حضرت داؤد علیہ السلام سے حضرت یرمیاہ علیہ السلام تک

(۲) حضرت یرمیاہ علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام تک

(۳) حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام سے اب تک

پہلا مرحلہ: اللہ تعالیٰ کی جانب سے مسیح کے بھیجے جانے کا معاملہ دراصل اس وقت شروع ہوتا ہے جب پہلی بار بنو اسرائیل اجتماعی طور پر اللہ کے انکار اور ابلیس سے کلی تحالف کی طرف مائل ہوئے اور انہوں نے انبیاء کی نافرمانی کا آغاز کیا۔ ظاہر ہے یہ وہ مرحلہ تھا جب ہر چند کہ بنو اسرائیل نے بحیثیت قوم اللہ کی علانیہ بغاوت کر دی تھی لیکن ان میں کچھ لوگ حق پر قائم اور حق کے لیے کوشش تھے۔ ان میں اللہ کے وہ انبیاء بھی تھے جو اس وقت موجود تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کی پاداش میں انہیں تنبیہا عذاب اور مصائب سے گزارنا شروع کیا۔ یہ واقعہ اغلباً ۹۳۱ قبل مسیح کا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں بشارت بھی دی کہ اگر انہوں نے گناہوں سے اپنے کو الگ کر لیا، توبہ واستغفار کی روش اختیار کی تو اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو معاف کر دے گا، ان کی مصیبتوں کے خاتمے کے لیے ان کی مدد کرے گا اور ان کی بحالی کے لیے ایسے انبیاء بھیجے گا جو مسیح ہوں گے جن کا اتباع کر کے وہ مصیبتوں سے نکل جائیں گے۔ چنانچہ یہ دور کسی ایک مسیح کی آمد کے تصور کا نہیں بلکہ ایک سے زائد مسیح کے آنے کے تصور کا ہے۔ چنانچہ یہی ہے وہ تصور مسیح جو اس عہد کے صحیفوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جس میں ہر چند کہ قوم گناہ عظیم میں آلودہ ہو چکی تھی لیکن ان سے خیر کی امید ابھی باقی تھی۔ چنانچہ اس کی مدت ۵۸۶ قبل مسیح تک ہے جب اس تعلق سے حضرت یرمیاہ نے انہیں آخری بار سمجھایا۔

دوسرا مرحلہ: دوسرا مرحلہ اور دوسرے تصور مسیح کا آغاز حضرت یرمیاہ کے بعد اور بیت المقدس کی تباہی کے نتیجے میں ہوا۔ اہل حق کم ہوتے گئے، پوری بنی اسرائیلی قوم پورے تہجد کے ساتھ اللہ کی بغاوت پر کمر بستہ ہو گئی اور ظاہر ہے غایت بے شرمی کے ساتھ انبیاء کو قتل کرنے لگی۔ توریت اور زبور کو کلیتہً محرف کر دیا گیا اور تمام مشرکانہ اور فاسدانہ خیالات کو دین کا حصہ بنالیا گیا۔ گویا وہ تمام فاسدانہ خیالات جو گزشتہ ۴۰۰ سالوں سے ابھرتے رہے تھے لیکن جو حقیقی دین کے متوازی تھے اب ان کی سرکاری اور دینی حیثیت ہو گئی۔ حقیقی اور انبیائی دین فاسد، باطل اور غیر قانونی قرار پایا اور جعلی اور ابلیسی دین خالص، حق اور قانونی قرار دے دیا گیا۔ یہی وہ دور ہے جب مسیح کے حقیقی تصور کی کتابیں جعلی قرار پائیں مثلاً اسد راس کی کتابیں (Books of Esdras)، انوخ (Enoch)، بارہ انبیاء کے وصایا Testament of Twelve Patriarchs وغیرہ۔ چنانچہ اب اس رائج جعلی دین نے اس تصور مسیح کو اختیار کر لیا جس کی درج ذیل بنیادیں تھیں:

- (۱) اللہ تعالیٰ یہودیوں کی مصیبتوں کے خاتمے اور ان کی سر بلندی کے لیے مسیح بھیجے گا۔
- (۲) یہ مسیح ان کے موجودہ دین کی توثیق کرے گا۔
- (۳) جو اس موجودہ (فاسد، باطلانہ اور مشرکانہ) دین کی توثیق نہ کرے اور حقیقی دین کی طرف بلائے وہ جھوٹا مسیح (دجال) ہے اور قابل گردن زدنی ہے۔
- چنانچہ یہ تصور مسیح دراصل دجالوں کی پاسداری کرنے اور انبیاء کے انکار کرنے اور ان کو قتل کرنے کا باعث ہوا۔ یہ تصور اس وقت پورے بنو اسرائیل میں یہجانی کیفیت برپا کرنے کا سبب ہوا اور جس کے نتیجے میں بنو اسرائیل اہل حق کے خلاف بے انتہا بے شرمی اور شقاوت قلبی پر اتر آئے جب انہیں انبیاء و صلحاء کے ذریعہ یہ تنبیہ کی گئی:

دیکھو! میں تمہارے مابین ایلیاہ نبی کو بھیجوں گا جو خدا کے سخت اور خوفناک
ان سے قبل آئے گا۔ وہ آبا کے دل کو اولاد کی جانب اور اولاد کے دل کو آبا کی جانب
موزے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں آؤں اور زمین پر قہر توڑ دوں۔“ (ملاکی ۳: ۲۳)
(یہودی صحائف کے شمار کے مطابق رنصاری کے مطابق ہے ملاکی ۳: ۲۳-۶)

چنانچہ اس عہد میں دو تصور مسیح پائے جاتے رہے: (۱) پہلا سرکاری یہودیت کا تصور

مسیح۔ یعنی اصلی مسیح جھوٹا اور یہودیت کا دشمن ہے اور اس کا خاتمہ یہودیت کی آبیاری ہو گا اور (۲) غیر سرکاری اہل حق اور اس وقت آنے والے انبیاء کا تصور مسیح۔ جس میں اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آنے کی خبر دی گئی تھی اور جس کی تکذیب پر سخت وعید کی دھمکی دی گئی تھی۔

تیسرا مرحلہ: تیسرا تصور مسیح وہ ہے جس کا آغاز حضرت عیسیٰ کی آمد، یہودی علماء و ربانین کے ذریعہ ان کی تکذیب اور پھر اپنے علم کی حد تک ان کو صلیب دیئے جانے کے بعد ہوتا ہے جو اب تک جاری ہے۔ جب عام اور سرکاری یہودیت نے توحید اور رسالت۔ اور ظاہر ہے ان کے نتیجے میں۔ آخرت سے اپنا ہر رشتہ منقطع کر لیا تب کہیں جا کر روئے زمین پر وہ ہولناک حادثہ رونما ہوا جسے ان کے علم کی حد تک حضرت عیسیٰ ابن مریم مسیح علیہ السلام کو صلیب دیا جانا کہا جاتا ہے۔ یہ تکذیب اور صلیب دیا جانا صرف عیسیٰ ابن مریم کا نہیں تھا بلکہ عیسیٰ مسیح اور عیسیٰ روح القدس کی تکذیب اور ان کو صلیب دیا جانا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد اب یہودیوں کا رشتہ اپنے تمام انبیاء اور ان کی کتابوں سے آخری بار ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ اللہ کے یہاں، ملائکہ کے یہاں، آسمانوں اور زمین میں ان کے لیے اب کوئی گنجائش نہیں۔ یہی وہ بات ہے جسے قرآن نے البقرہ ۹۸ میں بیان کیا ہے۔ وہ اب پورے کے پورے صرف اور صرف ابلیس کے لیے ہو گئے ہیں اور ابلیس ان کے لیے ہے۔ یہ مرحلہ سابقہ انبیاء کی بشارتوں اور صحیفوں میں درج آمد مسیح کے تصور اور انتظار سے کلی مایوسی کا مرحلہ ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اب نہ ان کے لیے کوئی مسیح آئے گا نہ کوئی مسیح بھیجا جائے گا اور جو آئے گا وہ ان کے لیے قہر بن کر آئے گا۔ اس لیے کہ ایک طرف تو انہوں نے مسیح بن کر آنے والے تمام انبیاء کا قتل کیا یہاں تک کہ اس مسیح کی بھی تکذیب کی اور اسے اپنے علم کی حد تک صلیب دے چکے جو مسیح بن کر آیا تھا اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کا بھی انکار کر دیا جسے یوحنا کی انجیل میں ”وہ نبی“ کہا گیا ہے۔ یوحنا میں آیا ہے:

”یوحنا کی گواہی یہ ہے، کہ جب یہودیوں نے یرد شلم سے پجاریوں اور لویوں

کو اس (یوحنا یعنی حضرت یحییٰ) سے یہ پوچھنے کے لیے بھیجا کہ تو کون ہے؟ تو اس نے یہ

مان لیا، اور انکار نہیں کیا لیکن مان لیا کہ میں مسیح نہیں ہوں۔ تب انہوں نے اس سے

پوچھا تو پھر کہ ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے؟ اس نے کہا میں نہیں ہوں۔ تو کیا تو وہ نبی ہے؟

اس نے جواب دیا کہ نہیں۔ تب انہوں نے اس سے پوچھا پھر تو کون ہے؟ تاکہ ہم اپنے

بیٹے والوں کو جواب دیں۔ تو اپنے بارے میں کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا: میں جیسا یسعیاہ

نبی نے کہا ہے ”جنگ میں ایک پکارنے والے کی آواز ہوں تاکہ تم خدا کی راہ کو درست کرو۔“ یہ فریسیوں کے جانب سے بھیجے گئے تھے۔“ (یوحنا ۱۹:۱-۲۴)

لہذا اب کائنات میں ان کے لیے کوئی راہ نہیں رہ گئی تھی چنانچہ ان کا موجودہ تصور مسیح درج ذیل نکات پر قائم ہے:

(۱) وہ عیسیٰ ابن مریم جو مسیح بن کر آیا تھا اور جسے انہوں نے صلیب دے دیا تھا اور اب جس کے بارے میں عیسائی اور اہل اسلام کہتے ہیں کہ وہ دوبارہ آئے گا وہ ان یہودیوں کا دشمن ہوگا اس لیے وہ مسیح نہیں دجال ہے۔

(۲) اب چونکہ عرش سے زمین تک یہودیوں کے لیے کوئی معین و مددگار نہیں اس لیے اب ان تمام بشارتوں کے حصول کے لیے واحد امید وہ دجال ہے جسے ابلیس نے تیار کر رکھا ہے۔ جو مسیح بن کر آئے گا لہذا وہ سب سے بڑا دجال ہی ان کا مسیح ہے۔

(۳) چونکہ اب اللہ کے فرشتے ان کی مدد نہیں کریں گے اس لیے انہیں ابلیس اور اس کے دجالوں کی مدد سے اور بطور خاص اس دجال اکبر کی مدد سے انہیں خود وہ سب کچھ حاصل کرنا ہے جس کے وہ مستحق ہیں۔

(۴) لہذا اب ان کے قدیم صحیفوں میں مذکور بلائیں، ستاناس، دابلولوس، پینچما ا ایریون ہی ان کے لیے مسیح ہے۔ اسی کی حکومت مسیح کی حکومت ہے۔ اسی کی حکومت کا دن خدا کا دن ہے۔ وہی اسرائیل کی نجات کا دن ہے۔ اسی روز یسکھل کی تعمیر ہوگی اور صیہون آباد ہوگا۔

چنانچہ یہی وہ بنیادی تصور ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صلیب دیئے جانے (30AD) سے شروع ہوتا ہے اور جسے ربی یوحنا بن زکائی نے (68AD) میں باضابطہ شکل دے دی۔ یسکھس نے (70AD) میں یروشلم کو تباہ اور ہزاروں یہودیوں کو تہ تیغ اور ہزاروں کو ہمیشہ کے لیے در بدر کر دیا۔ لیکن وہ تصور مسیح جو (68AD) میں منضبط ہو گیا اب پوری یہودیت کا تصور مسیح تھا۔ اس تصور مسیح میں۔ اللہ اور اللہ کے ملائکہ سے مایوسی، ساری دنیا سے غصہ اور نفرت اور اپنی طاقت اور ابلیس اور اسکے دجالوں کی مدد سے کھوئی ہوئی چیزوں اور آئندہ کی بشارتوں کو حاصل کرنے کی کوشش۔ اہم اجزاء ہیں۔ چنانچہ یہی وہ تصور ہے جسے چند ہی سالوں میں یہودیت اور اس کے احبار و روحانیین نے پردان چڑھایا۔ اور اس کے مطابق اقدامات کرنا شروع

کر دیئے۔

یہودیوں کے مطابق سب سے پہلے چار یہودی روحانیتین نے اپنی روحانی طاقت کا استعمال کرتے ہوئے اور ابلیس اور دیگر شیطین کی مدد لے کر اور اللہ کے فرشتوں کو دھوکا دے کر یا انہیں زیر کر کے روحانی طور پر فردوس (جنت) میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ ان چاروں میں سے ان کے مطابق پہلا ربا عقبہ (Rabbi Akiva (50-135AD) اس میں کامیاب ہو گیا۔ دوسرا۔ بن زوما (Ben Zoma 2nd Century AD) ناکام ہوا (یا فرشتوں نے اسے ناکام بنادیا) اور مارا گیا۔ تیسرا بن عزائی (Ben Azzai) ناکام ہوا (یا فرشتوں نے ناکام بنادیا) اور پاگل ہو گیا۔ چوتھا ایلیشا بن ابویہ (Elisha Ben Abuyah) ناکام ہوا (یا فرشتوں نے ناکام بنادیا) اور وہ مرتد ہو گیا۔

۳۰ کے بعد ربی یوحنا بن زکائی کے ذریعہ منضبط کیا گیا یہ وہ تصور مسیح ہے جو اس دن سے دور استوں سے آگے بڑھ رہا ہے تاکہ اس روئے زمین پر وہ دنیا قائم کر دے جو خدا کا مسیح آکر کر تا جواب یہودیوں کے لیے نہیں آئے گا۔ یہ دور استے ہیں:

(۱) غیر مادہ یا مادہ پر یہودی روحانیت کا استعمال کر کے اور ابلیس اور اسکے شیطین کی مدد لے کر ویسی دنیا بنانا جیسی مسیح ان کے لیے بناتا۔

(۲) مادہ پر یہودی روحانیت کا استعمال کر کے اور ابلیس اور اس کے شیطین کی مدد لے کر ویسی دنیا بنانا جیسی مسیح ان کے لیے بناتا۔

چنانچہ یہ پوری مغربی تہذیب اور اس کے مظاہر، مغربی سائنس کی ترقی اور اسکی ترجیحات، صیہون کی واپسی کے لیے ساری دنیا پر عسکری اور معاشی عمل داری قائم کرنا، صیہون کا قیام، جنگ عظیم اول، خلافت کا خاتمہ، لیگ آف نیشنز کا قیام، دوسری جنگ عظیم کا انعقاد، اقوام متحدہ کا قیام، اسرائیل کا قیام اور اب مسجد اقصیٰ کو ڈھانے، ہیکل سلیمانی کی تعمیر کی کوشش اور عظیم ریاست اسرائیل کا قیام اسی دجالی مسیح کے کاموں کو انجام دینے اور اس کی سلطنت کو قائم کرنے یا بالفاظ دیگر یہودیوں سے واپس لے لی گئی بشارتوں کو اللہ اس کے فرشتوں اور مومنین کے برخلاف زبردستی حاصل کر لینا ہے۔ یہی وہ بات ہے جسے قیام اسرائیل کے بعد مقرر کیے جانے والے پہلے ربی اعظم اور اپنے وقت کے سب سے بڑے یہودی عالم، روحانی اور مفکر ربی ابراہام اساق کک (Rabbi

(Abraham Isaac Kook) نے بیان کرتے ہوئے لکھا:

"To regard Eretz Yisrael as merely a tool for establishing our national unity or even for sustaining our religion in the Diaspora by preserving its proper character and its faith, piety and observances --- is a sterile notion; it is unworthy of the holiness of Eretz Yisrael. A valid strengthening of Judaism in the Diaspora can come only from a deepened attachment to Eretz Yisrael. The hope for the return to the Holy Land is the continuing source of the distinctive nature of Judaism. The hope for the Redemption is the force that sustain Judaism in the Diaspora; the Judaism of Eretz Yisrael is the very Redemption." ۱

ترجمہ:

ارض اسرائیل کے تصور کو محض اپنی قومی وحدت کو قائم کرنے کا ایک ذریعہ سمجھنا حتیٰ کہ انتشار کی حالت میں مذہب کی مخصوص صورت اور ایمان، تقویٰ اور اس پر عمل کو محفوظ رکھ کر مذہب کو باقی رکھنے کا ذریعہ سمجھنا ایک بانجھ خیال ہے۔ یہ خیالات اس قابل نہیں کہ انہیں ارض اسرائیل کے تقدس سے نسبت دی جائے۔ انتشار میں یہودیت کی قابل لحاظ تقویت اسی میں مضمر ہے کہ ارض اسرائیل کے تصور سے گہری وابستگی ہو۔ ارض مقدس کو واپس ہونے کی امید یہودیت کی وہ بلا فصل ماخذ و منبع ہے جس سے اس کی انفرادیت برقرار ہے۔ نجات کی امید وہ طاقت ہے جو یہودیت کو انتظار میں باقی رکھتی ہے۔ ارض اسرائیل کی یہودیت ہی دراصل حقیقی نجات ہے۔

چنانچہ ساری دنیا کے یہودی اب جس مسیح کی آمد کا انتظار اور جس کے لیے راہیں ہموار کر رہے ہیں وہ دراصل دجال اکبر یعنی المسیح الدجال ہے۔ اور وہ جس مسیح سے خائف اور جس کا مقابلہ کرنے اور جسے ختم کر دینے کے لیے تیار ہو رہے ہیں وہ دراصل حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام ہیں۔

(۲) دجال کا ظہور: یہودیت میں دجال کا معاملہ بہت عجیب ہے۔ دجال کے تعلق سے یہودیت کے تصورات مسیح کے تعلق سے تصورات کے بالکل علی الرغم ہیں یعنی متناسب

(Proportional) -

یہودیت کے موجودہ صحیفوں میں صرف دانیال ہی وہ کتاب ہے جس میں دوائیے تذکرے ملتے ہیں جن سے دجال اکبر کی کسی قدر نشاندہی ہوتی ہے۔ چنانچہ دانیال باب ۲ آیت ۴۰ میں لکھا ہے۔

”اور چوتھی مملکت لوہے کی طرح مضبوط ہوگی۔ لوہے سے تو ساری چیزیں چور چور ہو جاتی اور پس جاتی ہیں۔ لہذا جس طرح لوہے سے وہ سب کچل جاتی ہیں اسی طرح اس چوتھی مملکت سے سب کچھ چور چور ہو کر پس جائے گا۔“

اس سورۃ کے باب ۱ آیت ۷ میں ہے:

پھر اس کے بعد میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک چوتھا جانور ہے جو خوفناک اور ڈراؤنا اور بہت طاقتور ہے۔ اور اس کے بڑے بڑے لوہے کے دانت ہیں۔ وہ سب کچھ کھا ڈالتا ہے اور چور چور کر دیتا ہے اور جو باقی رہتا ہے اسے پیروں سے روند ڈالتا ہے۔ اور وہ تمام پہلے جانوروں سے مختلف ہے۔ اور اس کے دس سینگ ہیں۔ میں ان سینگوں کو دھیان سے دیکھ رہا تھا تو کیا دیکھا کہ اس کے درمیان ایک اور چھوٹا سا سینگ نکلا اور اس کی طاقت سے ان پہلے کی سینگوں میں سے تین اکھاڑے گئے۔ پھر میں نے دیکھا سینگ میں انہوں کی جیسی آنکھیں اور بڑا بول بولنے والا منہ بھی ہے۔ میں نے دیکھتے دیکھتے آخر میں کیا دیکھا کہ تخت رکھے گئے اور کوئی نہایت قدیم متمکن ہوا۔ اس کا لباس برف کی طرح سفید اور سر کے بال نرم اون کی طرح تھے۔ اس کا تخت آتشیں اور اس کے پہلے دھکتی ہوئی آگ جیسے نکلتے تھے۔ اس قدیم کے منہ سے آگ کی موج نکل کر بہہ رہی تھی۔ پھر ہزاروں ہزار لوگ اس کی خدمت کر رہے تھے اور لاکھوں لوگ اس کے سامنے حاضر تھے۔ پھر عدل کرنے والے بیٹھ گئے اور دفاتر کھولے گئے۔ اس وقت اس سینگ کا بڑا بول سن کر میں دیکھتا رہا اور دیکھتے دیکھتے آخر میں دیکھا کہ وہ جانور مار ڈالا گیا۔ اور اس کا جسم دھکتی ہوئی آگ میں راکھ ہو گیا۔“

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر نبی نے اپنی قوم کو اور بنو اسرائیل کے انبیاء نے بنی اسرائیل کو دجال اور بطور خاص دجال اکبر سے ضرور آگاہ کیا ہوگا۔ لیکن جب یہودیوں نے علانیہ طور پر ابلیس سے تحالف کر لیا اور خدا، رسول اور آخرت کے علانیہ باغی ہو گئے تو انہوں نے اس پوری خبر کو چھپا لیا یا ضائع کر دیا۔ چنانچہ اب اس تعلق سے دو قسم کی معلومات دستیاب ہیں۔

(۱) پہلی قسم کی معلومات وہ ہیں جو دانیال میں درج ہیں۔ اور چونکہ وہ یہودیوں کے مطابق۔ تک (TaNaK) کے تیسرے حصے کو تبیم کا حصہ ہے اس لیے اس کی حیثیت ویسے بھی ان جیسی نہیں جو حیثیت نمیم اور اس سے زیادہ تورہ کی ہے۔ یعنی ایسا لگتا ہے کہ دجال کے تعلق سے ہر معلومات جو تورہ یا نمیم میں تھی اسے ختم کر دیا گیا۔ اور دانیال میں شاید اس لیے درج ہے یا درج رہنے دیا گیا کہ یہاں اسکی صورت ایک نبی یا صالح کے رویاء کی ہے۔ لیکن اس پر بھی بس نہیں کیا گیا بلکہ اس کی تاویل کی گئی اور اسے فارس کی ایک ظالم مملکت اور ظالم بادشاہ سے جوڑ دیا گیا۔

(۲) دوسری قسم کی معلومات وہ ہیں جو ان کتابوں میں موجود ہیں جنہیں یہودی پیشین گوئی ادب (Jewish Apocalyptic Literature) کہا جاتا ہے اور جس میں بیشتر وہ مواد ہیں جو یہودیوں میں ممنوع اور ناجائز (Apocrypha) قرار دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً:

(1) Testament of the Twelve Patriarchs

ظاہر ہے یہ کتابیں چونکہ ممنوع اور ناجائز ہیں اس لیے ان کے عقائد میں ان سے استدلال نہیں کیا جاسکتا۔

یہودیوں کے مطابق تمام جائز لٹریچر کا مطالعہ کرنے سے کئی باتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں: پہلی بات یہ کہ ان کی موجودہ کتابیں اور ذخیرہ علوم مسیح کے ذکر سے۔ جسے وہ کبھی مسیح (Messiah) کبھی (Son of God) اور کبھی (Son of Man) کہتے ہیں۔ سے بھرے ہوئے ہیں اور ہر قدم پر ان کا ذکر کیا جاتا ہے اور ان سے امیدیں وابستہ کی جاتی ہیں اور ان کے لیے دعا کی جاتی ہے۔

دوسری بات یہ کہ جہاں مسیح کا زیادہ سے زیادہ ذکر کیا جاتا ہے وہیں دجال کا ذکر بالکل غائب کر دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی سرسری طور پر پورے یہودی دینی ادب کو یہاں سے وہاں تک پڑھ جائے تو کسی دجال کے ذکر سے یکسر نا بلند رہے گا۔ لیکن تحقیق اور یہودی علوم کی پر تیں اکھاڑنے کے بعد محقق اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ وہاں دجال کا ذکر بڑی چابک دستی سے چھپایا جا رہا ہے بطور خاص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد۔

اس انخفاء کے تین راستے ہیں:

(۱) بعض تذکروں کی تاویل کی جاتی ہے کہ وہ سابق میں ان بادشاہوں سے متعلق ہیں

جنہوں نے یہودیوں کو ستایا یا اذیتیں دیں۔

(۲) بعض تذکروں کی تاویل یہ کی جاتی ہے کہ وہ آئندہ ان قوتوں سے متعلق ہیں جو یہودیوں کو ستائیں گی یا ان کی دشمن ہوں گی۔

(۳) بعض تذکروں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ باتیں اصلاً دین موسیٰ کی نہیں بلکہ دیگر قوموں سے قربت کی وجہ سے دین موسیٰ کی کتابوں میں در آئی ہیں۔ اس تعلق سے بطور خاص زردشتیوں کا نام لیا جاتا ہے۔

لیکن ان تمام کوششوں کا ماحصل دراصل دجال کے تذکرے کو بے اصل قرار دینا ہے۔ دجال کا تذکرہ ان ساری کوششوں کے باوجود اس طرح آ جاتا ہے کہ وہاں مسیح کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔ مسیح کا ذکر ہو اور دجال کا ذکر نہ ہو جب بھی دجال محذوفاً موجود ہوتا ہے۔ اسی طرح دجال کا ذکر کیا جائے اور مسیح سے اخفاء جب بھی مسیح محذوفاً موجود ہوتا ہے۔ لہذا دجال کے اخفاء کے باوجود دجال محذوفاً ہی سمی موجود رہتا ہے۔

لیکن دجال کے تذکرے کو جو چیز سب سے زیادہ چھپانے والی ہے وہ ایک عجیب و غریب بات ہے اور وہ یہ ہے کہ یہودیوں نے مسیح کے سارے تذکرے کو بحال رکھا ہے اور اسے بیان کرتے ہیں لیکن اس سے ان کی مراد دجال اکبر ہوتی ہے۔ (اس پر کچھ مزید بحث ان شاء اللہ بعد میں ہوگی) اور جب وہ اصلی مسیح کا ذکر کرتے ہیں تو دراصل اسے دجال اکبر میں مشخص کرتے ہیں۔ اس تعلق سے دو الفاظ نہایت اہمیت کے حامل ہیں:

(۱) ھلمہ (ha almah) اور (۲) بلی ایل (Belial)۔

پہلے کا تعلق حضرت مسیح اور ان کی پیدائش سے ہے اور دوسرے کا دجال سے۔ (ان پر تفصیلی بحث ان شاء اللہ احادیث کے ذیل میں ہوگی۔

(۳) حضرت مسیح علیہ السلام کے ذریعہ دجال کا خاتمہ

اور روئے ارض پر نظام عدل کا قیام۔

یہ مسئلہ سابقہ دو مسئلوں سے کم الجھا ہوا اور پیچیدہ نہیں۔ اس تعلق سے نظام عدل کی جسے ’ہایوم‘ کہا جاتا ہے کم از کم ۹ الگ اور ایک دوسرے سے بالکل جدا تاویلات پائی جاتی ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک کی ذیلی قسمیں اور تاویلات ہیں۔ جسے یہودی حسب منشا استعمال کرتے ہیں۔ لیکن

ہم یہاں ان میں سے صرف ایک تک اپنی بحث کو محدود رکھیں گے تاکہ یہ صورت حال زیادہ واضح ہو سکے۔ بلکہ اس بحث کو زیادہ محدود کرنے کے لیے ہم اسے صرف ”ہایوم ہا مسیح“ یعنی ”مسیح کا دن“ تک محدود رکھتے ہیں۔

چنانچہ ”مسیح کا دن“ ہی دراصل وہ اصطلاح ہے جس میں حضرت مسیح کی آمد اور نظام عدل کا قیام متصور ہے۔

سبعین (Septuaginta) تو خیر کیا۔۔۔ بلکہ خمین (Pentateuch) تک کی موجودہ محرف حالت — سے ہر چند کہ اس بات کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ دجال اکبر اور حضرت مسیح علیہ السلام کی آمد اور دجال کے خاتمے کے تعلق سے حضرت اسحاق کے بعد بنو اسرائیل کے انبیاء نے کیا خبریں دی تھیں اس لیے کہ حضرت یرمیاہ سے قبل اور حضرت عزیر کے بعد ہی بنو اسرائیل نے ایک سے زائد بار تمام صحائف آسمانی اور انبیاء کی احادیث اور علماء کے آثار کو محرف کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ خمین (Pentateuch) کلیئاً قوم ہدیٰ کے بجائے ایک نسلی قوم کا تصور پیش کرتا ہے۔ چنانچہ اس میں جو تصور مسیح حضرت موسیٰ علیہ السلام سے قبل پایا جاتا ہے وہ بنی اسرائیل کی اسیری اور اس سے نجات کے تصور میں مضمر ہے۔ (یہاں اس بات سے مراد یہ نہیں کہ اس وقت بنو اسرائیل میں یہ تصور پایا جاتا تھا بلکہ اس سے یہ بات مراد ہے کہ اس وقت موجود خمین میں موجود اس وقت مسیح کے بارے میں تصور یہ پایا جاتا ہے جو یقیناً محرف ہے۔) چنانچہ اس جلوت (Galuth) یعنی اسیری کے بارے میں تورات کے باب پیدائش کے باب ۱۵ کی آیت ۱۳ یہ کہتی ہے کہ: ”ابراہیم کی نسل میں مصیبت کے دن ۴۰۰ ہیں۔“ اس طرح منصفین باب: ۱۱ (Judges 11²⁶) آیت ۲۶ میں ہے کہ خروج اور افتاح کے درمیان مدت ۳۰۰ سال ہے۔ اور ٹھیک اسی طرح پہلے بادشاہ باب ۶ آیت ۱ میں درج ہے:

”خروج اور بیکل کی تعمیر کی درمیانی مدت ۴۸۰ سال ہے“

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ ”مسیح کا دن“ کے تعلق سے یہودیوں کے تصورات اور عقائد کو تین بڑے حصوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) پہلا تصور: اس تصور میں ’مسیح کا دن‘ کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ جب بھی بنو اسرائیل اپنی شامت اعمال سے اور اللہ تعالیٰ سے علانیہ بغاوت کی پاداش میں مبتلائے مصیبت کیے گئے انہوں

نے سابق سے چلے آنے والے تصور کو اس طرح نئی شکل دی جس سے یہ بات ابھر گئی کہ یہ مصیبت کے دن چند روزہ ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی آزادی کے لیے ایک مسیح ارسال کرے گا جو انہیں اس ابتلا سے نجات دلادے گا اور ان کے دن پھر جائیں گے۔ یعنی آمد مسیح کا یہ وہ تصور ہے جو مستقبل بعید کے تصور یا دنیا کے ختم ہونے کے تصور سے مربوط نہیں تھا۔ بلکہ مستقبل قریب میں مصیبتوں سے نجات پانے اور خوشحالی کے بحال ہونے کے تصور سے مربوط تھا۔ اول بابلی اسیری سے قبل، انبیاء کے جو تذکرے سبعین (Septuaginta) میں ملتے ہیں ان سے یہی مترشح ہوتا ہے۔ ہر چند کہ یہودی علماء کا اس بات پر اصرار ہے کہ بخت نصر کی بابل اسیری کے بعد پہلی بار اس تصور مسیح کے واضح ثبوت ملنے لگے جو مستقبل بعید اور آخری نجات کا تصور ہے۔ لیکن میری ناقص رائے میں یہ بات درست نہیں حضرت عزیر سے لے کر حضرت یرمیاہ تک تو یہ بات قطعاً درست نہیں ہے۔ اور اگر اس تعلق سے دلیل کے بطور حضرت یسعیاہ کا حوالہ دیا جاتا ہے تو وہ درست نہیں ہے۔ ان شاء اللہ حضرت یسعیاہ کی عبارت پر اسی باب میں بعد میں بحث ہوگی۔ اس طرح میری رائے۔ جس کا اظہار میں کر چکا ہوں۔ کہ یہودیت کی دو متوازی صورت حال کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ جب یہودیت کی بات کی جاتی ہے تو اس سے مراد وہ انحراف دین موسوی ہے جو حضرت یرمیاہ کے وقت سے ہی باضابطہ سرکاری حیثیت اختیار کر گیا تھا اور جس کے بعد ہی تمام انبیاء بنی اسرائیل، ان پر کی جانے والی وحی اور ان کے اقوال یہودیوں کے ذریعہ غیر قانونی (Outlaw) قرار پائے اور جن کی پاداش میں یکے بعد دیگرے انہیں قتل کر دیا گیا۔ یہ وہی زمانہ ہے جب سبعین (Septuaginta) کی تدوین کو آخری شکل دے دی گئی اور اس کے بعد آنے والے انبیاء بنو اسرائیل میں غیر قانونی اور ان پر اتری وحی اور ان کے اقوال گمراہی قرار دے دیئے گئے۔ سبعین (Septuaginta) یعنی یہودیت کی موجودہ اصطلاح میں تک (TaNaK) دبری ہیمیم پر ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر ترتیب وقت اور انبیاء کا لحاظ کیا جائے تو سب سے آخری اندراج ملائگی ہے جو عیسائیت کی آخری سورت ہے اور ملائگی کا زمانہ ۳۳۳ قبل مسیح کا ہے۔ اس طرح حضرت نحمیاہ اور ملائگی کا ایک ہی زمانہ ہے۔ گویا اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ۴۰۰ قبل مسیح کے بعد ہرنی بنی اسرائیل کے ذریعہ غیر قانونی گمراہ اور قابل گردن زدنی مان لیا گیا اور پورے ۴۰۰ سالوں تک یہودیوں نے اپنے انبیاء کا بے دریغ خون بہایا۔

فی الواقع اس تصور کا زمانہ حضرت عزیر تک نہیں بلکہ حضرت یرمیاہ تک دراز ہے۔
 (۲) دوسرا تصور: ”مسیح کا دن“ کا دوسرا تصور بہت پیچیدہ ہے۔ اس میں تین اقوال مل کر ایک عجیب ملغوبہ بناتے ہیں۔ ان تین اقوال اور ان کی باضابطہ گمراہ یہودی تاویل کی صورت درج ذیل ہیں:

(۱) یہودیوں کی بغاوت اپنے عروج کی طرف جارہی تھی اور ان میں اہل حق اور بالخصوص انبیاء انہیں ایک طرف گناہوں پر سخت سے سخت تنبیہ کر رہے تھے۔ اور بڑی بڑی مصیبتوں کی وعیدیں دے رہے تھے دوسری جانب رجوع کرنے والوں کو بڑی بڑی بشارتیں دے رہے تھے اور تیسری طرف دجال اکبر کے آنے اور حضرت مسیح کے آنے کی خبر دے رہے تھے۔

(۲) ان انبیاء کے برخلاف اب باضابطہ گمراہ اور باغی یہودیت بغاوت پر مصر اور حق سے شدت کے ساتھ گریزاں تھی۔ وہ آنے والے دجال کی خواہش مند تھی اور مسیح کو اپنا دشمن تصور کر رہی تھی اور انبیاء نے مسیح کی آمد سے جن بشارتوں کو جوڑا تھا اسے دجال اکبر سے اور دجال اکبر پر جن ابتلاء و آزمائش کو جوڑا تھا ان کو مسیح پر منطبق کرنے لگی تھی۔

لہذا اس Dovetailing کا نتیجہ درج ذیل برآمد ہوا:

(۱) گمراہ اور خدا کا باغی یہودی معاشرہ جس میں احبار و رہبانین سبھی شامل تھے مسیح کے منتظر رہے اور دجال اکبر سے خائف۔

(۲) ان کا مسیح منتظر دجال رہا اور اس طرح ہر نبی کا وہ قتل کرتے رہے تاکہ کہیں ان میں سے کوئی وہ دجال اکبر نہ ہو یعنی خدا کا حقیقی مسیح۔

(۳) اپنے مزعومہ مسیح یعنی دجال اکبر کے تعلق سے امیدوار رہے کہ وہ آئے گا اور انہیں تمام ابتلاء سے نجات دلائے گا اور ان پر جنت نما خوشحالی کے دن لے آئے گا۔

یہاں یہ بات بر محل لگتی ہے کہ حضرت یسعیاہ کی بشارتوں کا ذکر کر دیا جائے۔

ہرچند کہ اس کا نصف حصہ متصل تیسرے تصور میں آئے گا۔ حضرت یسعیاہ نے فرمایا:

”آموس کے بیٹے یسعیاہ کا قول جو اس نے یہود اور یروشلم کے بارے میں

مشہد میں پایا:

آخر کے دنوں میں ایسا ہوگا کہ یہو کی عمارت کا پہلا.....

..... نہ لوگ مستقبل میں جنگ کا فن سیکھیں گے۔“

(ملاحظہ فرمائیں اس کتاب کا صفحہ: ۷۵)

اس اقتباس میں صرف ایک ہی عبارت ہے جس کی تاویل کی جاتی ہے اور جسے قیامت سے قبل حضرت مسیح سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ اور وہ عبارت ہے: ”آخر کے دنوں میں۔“

حالانکہ غور کیا جائے تو یہ دراصل اس آخر کے دنوں کا تصور ہے جو اس سلسلہ ابتلاء سے متعلق تھا۔ یعنی جب یہودیت دو مملکتوں میں بٹ چکی تھی اور دونوں ہی گمراہی کی راہ پر بگڑ رہے تھے اور دونوں جگہ اللہ کے انبیاء انہیں اس روش سے باز رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور اس بات کے خواہاں تھے کہ دنیوی مفادات کی یہ تقسیم ختم ہو جائے اور بنو اسرائیل اپنے فرض منصبی کو سمجھیں اور اللہ سے رجوع کر کے اپنے کاموں کی طرف لوٹ جائیں۔ ۴۱۳ قبل مسیح آتے آتے یہودیوں کے سنبھلنے کی ہر صورت بظاہر ختم ہو چکی تھی۔ ان کی اکثریت ابلیس کی گرویدہ اور خدا کی دشمن ہو چکی تھی۔ ان کے صلحاء یقیناً حضرت مسیح علیہ السلام کی آمد اور ان کی بشارتوں کے منتظر تھے اور دجال اکبر سے خائف اور اس سے گریزاں۔ اور یہی وہ تذکرہ ہے جو یہودی پیشین گوئیوں Jewish Apocalyptic Literature میں پایا جاتا ہے جسے ربیانی یہودیت (Rabbinical Judaism) جعلی اور گمراہی قرار دیتی ہے۔ لیکن میری اس عبارت کا یہ مطلب نہیں کہ ان Apocrypha میں درج ہر بات درست اور صحیح ہے۔

(۳) تیسرا تصور: جیسا کہ تصور مسیح کے ذکر میں واضح کیا گیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی آمد کے بعد اور ان کے ساتھ یہودیوں کے بد بختانہ رد عمل کے بعد اب یہودیوں کو خدا سے، اس کی بشارتوں سے اور حضرت مسیح سے کوئی امید باقی نہیں رہ گئی۔ انہیں نہ یہ امید رہی کہ حضرت مسیح اب ان کے لیے آئیں گے۔ نہ یہ امید رہی کہ اللہ کے فرشتے ان کی مدد کریں گے۔ نہ یہ امید رہی کہ اب کبھی ان کے لیے خدا کی رحمتوں سے ”مسیح کا دن“ آئے گا۔ لہذا اب انہوں نے اس پورے تصور کو تین نئی شکلوں میں منجم کیا جو درج ذیل ہے:

- (۱) اب ’مسیح کے دن‘ کو دراصل ’دجال اکبر کے دن‘ سے غسلک کر دیا جائے۔
- (۲) چونکہ اب کسی ربانی مدد کا کوئی سوال ہی نہیں اور نہ اس کا کہ ان کا مزعومہ مسیح آکر ان کے لیے سلطنت قائم کرے گا اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر کرے گا اس لیے انہیں اسکی آمد سے قبل

خود اپنی طاقت اور جدوجہد سے اسی صورت کی جس کا ذکر اصلی مسیح کے ذیل میں آیا ہے اپنی سلطنت قائم کرنی اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر کرنی چاہئے۔

(۳) اس کام کے لیے اپنی صلاحیتوں اور اللہ کی دشمن قوتوں — ابلیس، شیاطین انس و جن اور اس دجال اکبر سے مدد لینی چاہئے۔ یہی تصور اور اس پر عمل درآمد درج ذیل صورتوں میں ظاہر ہوا۔

- | | |
|--|--------------------------|
| (۱) ۴۴ قبل مسیح میں تھیوداس (Theudas) | |
| (۲) وہ مصری یہودی جو فیلکس (Felix) کے عہد میں ہوا۔ | |
| (۳) برکوخہ (132-135 AD) | Bar Kochba |
| (۴) سباتائی زیوی (1666 AD) | Sabbatai Zevi |
| (۵) تھیوڈور ہرزل (1860-1904) | Theodore Hertzl |
| (۶) ربی ابراہام اساق کک (1865-1935) | Rabbi Abraham Issac Kook |
| (۷) ربی یوسف سوننفلڈ | Rabbi Joseph Sonnenfeld |
| (۸) ربی یہودا لیب میمون (فش مین) (Fishman) | Rabbi Judah Leib Maimon |
| (۹) راویزیوی یہودا کک (1979) | Rav Zvi Yehuda Kook |
| (۱۰) راویسرائیل ابو حضرہ (پیدائش 1890) | Rav Israel Abu-Hatzera |
| (۱۱) مناحم شینرسون (پیدائش 1902) | (Menachem Schneerson) |
| (۱۲) ربی شلومو گورین (اسرائیل کے 1970 سے ربی اعظم) | Rabbi Shlomo Goren |
- یہ وہ چند اشخاص ہیں جو عملی مادی اور روحانی قوتوں سے یہودیوں کو آزاد کرانے، عظیم ریاست اسرائیل قائم کرنے اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر کرنے کے لیے کوشاں رہے۔
- اس کے ساتھ ساتھ فکری تشکیل کو دو صورت دی گئی جن کی بنیادیں یہودیت کے قدیم محرف صحائف میں تلاش کی گئیں۔ یہ دو شکلیں درج ذیل ہیں:

(۱) پہلی فکری تشکیل:

(۱) صورت اول: اس تشکیل میں اس حاصل کردہ آزادی، قیام اسرائیل اور دجالی تہذیب کو یسعیاہ نبی کے قول سے جوڑ دیا گیا ہے۔ اور اب یہ کہا جانے لگا ہے کہ ایک عالمی دجالی حکومت کا قیام دراصل اسی بشارت کی تعمیل ہے۔

(۲) صورت ثانی: قائم ہونے والی اس دجالی حکومت کے اندرونی خدوخال پر ان علامات کو منڈھ دیا گیا جو اب تک یہودیت میں غیر قانونی قرار دیئے گئے تھے۔ لیکن اب انہیں علامات اور بیانات کو سامنے رکھ کر اور موجودہ سبعین (Septuaginta) کے الگ الگ ٹکڑوں کو باہم مربوط کر کے وہی حقیقت دوسرے قالب میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہی وہ ترتیب ہے جس کا ذکر UNO کے ذیل میں صفحہ ۱۴ میں آیا ہے۔

(۳) اندیم صحائف میں جو کچھ دجال سے متعلق درج ہے اور اس عہد میں اللہ کی جانب سے علامات قیامت ظاہر ہونے کی جو خبر دی گئی ہے اسے اس عہد میں مسیح سے جوڑ دیا گیا ہے جو ان یہودیوں کی نظر میں دجال اکبر ہے۔

حصہ دوم: عیسائیت

جہاں تک عیسائیت کی بات ہے تو اس تعلق سے ان کے نظریات سادہ اور سہل ہیں۔ کم از کم جہاں تک آر تھوڈکس اور کیتھولک عیسائیوں کی بات ہے۔ جو کچھ پیچیدگی وہاں پائی جاتی ہے وہ یا تو کیتھولک عیسائیت کی فلسفیانہ تعبیرات کے سبب ہیں یا پھر صرف اور صرف پروٹسٹنٹوں کی یہودیائی ہوئی عیسائیت (Judaised Christianity) کے سبب۔

عیسائیت

(۱) مسیح کی آمد: جب رومن کیتھولک عیسائیت میں مسیح کی آمد کا ذکر ہوتا ہے تو اس سے مراد صرف حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کی دوبارہ آمد ہوتی ہے۔ جسے عام طور پر حضرت عیسیٰ کی دوبارہ آمد (Second Coming of Jesus) یا آمد و موجودگی (Parousia) کہا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ درج ذیل صحیفوں سے استدلال کرتے ہیں۔

(۱) متی 24:36 جس میں کہا گیا:

”اُس دن اور اُس گھڑی کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔۔۔ نہ فرشتے نہ بیٹا

— بلکہ صرف باپ۔“

(۲) متی 24:44 جس میں کہا گیا:

”اس لیے تم بھی تیار رہو کیونکہ جس گھڑی کے بارے میں تم سوچتے بھی نہیں ہو اسی گھڑی انسان کا بیٹا آجائے گا۔“

(۳) متی 25:31 جس میں کیا گیا:

جب ”انسان کا بیٹا“ اپنی شان میں آئے گا اور سارے فرشتے اس کے ساتھ آئیں گے تو وہ اپنی شان کے تخت پر جلوہ افروز ہو گا۔“

(۴) 1 تھیس لونی کیوں 5:2 جس میں کہا گیا:

”کیونکہ تم آپ ٹھیک جانتے ہو کہ جیسے رات کو چور آتا ہے ویسے ہی خدا کا دن آنے والا ہے۔“

(۵) 2 تھیس لونی کیوں 2:2 جس میں کہا گیا:

”کہ کسی روح یا کلام یا خط کے ذریعہ جو کہ گویا ہماری جانب سے ہو، یہ سمجھ کر کہ خدا کا دن آپہنچا ہے۔ تمہارا دل اچانک ساکن نہ ہو جائے اور نہ تم گھبرا جاؤ۔“

جیسا کہ ان عبارات سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ بنیادی طور پر ”خدا کے دن“ یا ”خدا کے فیصلے کے دن“ سے متعلق ہے۔ جسے ”Day of the Lord“ کہا جاتا ہے۔

یہاں عیسائی عقائد — یعنی Parousia اور دوبارہ آمد مسیح Second Coming of Jesus میں — دو تعبیرات کے مدغم ہو جانے کا اندازہ ہوتا ہے۔

(۱) پہلی تعبیر یہ ہے کہ بالآخر وہ دن قائم ہو گا جو قیامت کے بعد آنے والا ہے جب حساب کیا جائے گا — یہ گویا یوم الحساب اور یوم الدین ہے۔

(۲) دوسری تعبیر یہ ہے کہ بالآخر وہ دن قائم ہو گا جب قیامت سے پہلے حضرت عیسیٰ دوبارہ تشریف لائیں گے، دجال کو قتل کر دیں گے اور اس کے بعد زمین پر نظام عدل قائم ہو گا۔

مذکورہ تمام عبارتوں سے اس کا اندازہ نہیں ہوتا کہ وہاں ’خدا کا دن‘ سے کیا مراد ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ عیسائی عقائد میں بات — حضرت عیسیٰ کی دوبارہ آمد اور قتل دجال اور نظام عدل کے قیام سے زیادہ یوم الحساب کے تصور Parousia کی شکل اختیار کر گئی۔

جہاں تک حضرت عیسیٰ کی دوبارہ آمد سے متعلق کسی عبارت کا تعلق ہے تو وہ گویا صرف

ایک جگہ واضح طور پر ملتی ہے۔ یعنی پیشین گوئی۔ وہاں 21-19:11 میں عبارت اس طرح ہے:

”پھر میں نے آسمان کو کھلا ہوا دیکھا اور دیکھتا ہوں کہ ایک سفید گھوڑا ہے، اور اس پر ایک سوار ہے، جو ”امین“ اور ”صادق“ کہلاتا ہے اور وہ دین کے ساتھ عدل اور جہاد کرتا ہے، اس کی آنکھیں آگ کے شعلے ہیں، اور اس کے سر پر بہت سے تاج ہیں، اور اس کا ایک نام لکھا ہے جسے اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا، اور وہ خون آلودہ لباس پہنے ہوئے ہے اور اس کا نام ”کلمۃ اللہ“ ہے۔ اور آسمان کی فوج سفید گھوڑوں پر سوار اور سفید اور خالص مہل پہنے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے ہے۔ اور قوموں کے مارنے کے لیے اس کے منہ سے ایک تیز تلوار نکلتی ہے اور وہ لوہے کا عصا شامی لیے ہوئے ان پر حکومت کرتا ہے، اور وہ خدائے قادر مطلق کی ہیبت ناک اور غصے کی شراب پونز کرنے والے اوزار کی طرح روند ڈالتا ہے، اور اس کے لباس اور اس کی جانگھ پر یہ نام لکھا ہے:

شاہوں کا شاہ

مالکوں کا مالک

پھر میں نے ایک فرشتے کو سورج پر کھڑے دیکھا اور اس نے اونچی آواز میں آسمان میں اڑنے والے تمام پرندوں کو پکارا: آجاؤ: عظیم خدا کے کھانے کے لیے جمع ہو جاؤ! تاکہ تم بادشاہوں کا گوشت، سرداروں کا گوشت، طاقتور لوگوں کا گوشت، اور گھوڑوں کا، اور ان کے سواروں کا گوشت اور کیا آزاد کیا غلام، کیا چھوٹے کیا بڑے سب لوگوں کا گوشت کھاؤ۔

پھر میں نے اس جانور اور زمین کے بادشاہوں اور ان کی فوجوں کو اس شہسوار اور اس کی فوج سے لڑنے کے لیے اکٹھے دیکھا۔ اور وہ ’جانور‘ اور اس کے ساتھ وہ کذاب نبی ’پکڑا گیا۔ جس نے اس کے سامنے ایسی نشانیاں دکھائی تھیں جن کے ذریعہ اس نے ان کو فریب دیا، جنہوں نے اس جانور کی نشانی کو حاصل کیا تھا اور جو اسکے بت کی پرستش کرتے تھے۔ یہ دونوں زندہ اس آگ کی جھیل میں جو گندھک سے جلتی ہے ڈالے گئے۔ اور بقیہ لوگ اس شہسوار کی تلوار سے جو اس کے منہ سے نکلتی تھی مار ڈالے گئے اور سب پرندے اس کے گوشت سے سیر ہو گئے۔“

اپنی اندرونی پیچیدگیوں کے باوجود یہ وہ اقتباس ہے جسے کسی قدر ’حضرت مسیح کی دوبارہ آمد‘ کے تعلق سے پیش کیا جاسکتا ہے۔ (اس اقتباس میں تصنیف (Redaction) کا ایک مسئلہ ہے جس کی وجہ سے اس کی اور بھی تعبیریں ہو سکتی ہیں اور جن سے ہم انشاء اللہ حصہ احادیث میں

بحث کریں گے۔ یہاں ہم اس تعبیر کو من و عن قبول کرتے ہیں جو عیسائیت قبول کرتی ہے اور جس کے مطابق یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دوبارہ آمد کی پیشین گوئی ہے۔ اور ظاہر ہے یہ عبارت قیامت سے قبل حضرت عیسیٰ کی آمد کی طرف واضح رجحان رکھتی ہے اور اس طرح یہ Parousia سے زیادہ Second Coming کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

اب اس اقتباس کے ساتھ تین اور اقتباسات کو شامل کیا جاسکتا ہے:

(۱) متی 24:27-31

(۲) مرقس 13:24-27 اور

(۳) لوقا 21:25-28

یہ اقتباسات سارے کے سارے متناہی اناجیل (Synoptic Gospels) کے ہیں اور اپنے آپ میں غیر متعین اور گھٹک ہیں بطور خاص اس لیے کہ ان میں مذکورہ علامات کو اگر لغوی طور پر لیا جائے تو یہ ناممکن معلوم ہوتے ہیں اور اگر تمثیلاً لیا جائے تو کسی درجے میں دوبارہ آمد مسیح پر دلالت کرتے ہیں۔

نہایت عجیب اور حیرت ناک بات یہ ہے کہ یہ تینوں بیانات جو حضرت مسیح کی دوبارہ آمد سے متعلق ہیں صرف متی، مرقس اور لوقا میں مذکور ہیں اور ان میں شاید ہی کوئی فرق ہو۔ یہ تینوں اناجیل اسی لیے مناسب انجیل Synoptic کہلاتی ہیں۔ حضرت مسیح کی دوبارہ آمد کے تعلق سے کوئی بات جو تھی انجیل یعنی یوحنا کی انجیل (Gospel According to John) میں نہیں۔ دوسری طرف یوحنا کی انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اپنی زبان سے ان کے بعد آنے والے عظیم الشان نبی کی آمد کی بشارت دیتی ہے۔ اس نبی کی آمد کی بشارت سے متناہی اناجیل یکسر خالی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ دراصل Redaction کے مرحلے کی تحریفات ہیں جن پر یہاں بحث غیر موزوں ہوگی۔ اگر ان دونوں قسموں کے اناجیل کو باہم مدغم کر دیا جائے تو ”یوحنا کی پیشین گوئی“ (Revelation) کے اس طویل اقتباس کا اصلی مطلب باسانی سمجھا جاسکتا ہے۔

اب جہاں تک متناہی اناجیل Synoptic Gospel میں مذکور اس دن کا معاملہ ہے تو

اس تعلق سے چند علامات کا ذکر کیا جاتا ہے جو تین جگہ مذکور ہیں:

(۱) متی 24:3-26

(۲) مرقس 13:5-23

(۳) لوقا 21:5-24

ان بیانات میں آفات سماوی وارضی، جنگ، بد امنی، خلفشار، بد اخلاقی اور ساری دنیا میں عیسائیت کے پھیل جانے کا تذکرہ ہے۔ یہاں قابل ذکر بات اور سوال یہ ہے کہ ان علامات میں جب تمام نشانیاں منفی طور پر مذکور ہیں ان میں عیسائیت کے پھیلنے کو مثبت طور پر لیے جانے کا کیا جواز ہوگا؟ اور اگر اسے بھی منفی علامت تصور کیا جائے تو اس سے مراد دین عیسیٰ نہیں بلکہ حضرت عیسیٰ کے بعد محرف شدہ دین عیسیٰ ہونا ہی ممکن ہے۔

ان علامتوں کے علاوہ اور متناسب اناجیل سے الگ یوحنا کی پیشین گوئی اور دیگر عیسائی صحیفوں میں چند اور علامات کا ذکر ہے جو درج ذیل ہیں:

(۱) آنتائی کرائست (Anti-Christ) کا ظہور۔

اس کا ذکر 2 تھسلونی کیوں 2:3 میں کیا گیا ہے۔ لیکن جہاں تک اس نام یعنی آنتائی کرائست کے اعتبار سے ذکر کا معاملہ ہے تو یہ صرف دو جگہ مذکور ہے یعنی

(۱) 1 یوحنا 4:3 میں اور

(۲) 2 یوحنا 7 میں

لیکن ہم آنتائی کرائست پر بحث ظہور دجال کے ذیل میں انشاء اللہ کریں گے۔

اس طرح حضرت مسیح کی آمد کے تعلق سے جو تفصیلات ملتی ہیں وہ دو خطوط پر ہیں جن کا خلاصہ درج ذیل ہے:

(۱) پوری عیسائیت اور بطور خاص رومن کیتھولک چرچ عقیدے کے اعتبار سے اس کی قائل ہے کہ حضرت مسیح دوبارہ تشریف لائیں گے۔ یہاں اس تفصیل سے چنداں بحث کی ضرورت نہیں کہ اس آمد کی صورتیں کیا کیا ہوں گی اور اس باب میں ان کے یہاں کیا مختلف آرا پائی جاتی ہیں۔

(۲) عیسائیت کی عام رائے یہی ہے کہ آپ علیہ السلام کی آمد Parousia ہے جو دراصل (Redemption) 'نجات' کے لیے ہوگی۔

(۳) نجات کے تعلق سے عیسائیت کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ نجات تمام لوگوں کے لیے

بالعموم اور عیسائیوں اور بنی اسرائیل کے لیے بالخصوص نجات ثابت ہوگی۔ عقیدہ نجات (Redemption) عیسائیت کا بنیادی عقیدہ ہے۔ یہ جدا بات ہے کہ نجات کے معنی میں متعدد آراء ہیں۔

(۴) نجات تین کیفیتوں سے مربوط مگر منفرد ہے۔

(۱) Atonement یعنی At-one-ment — یعنی متحد کرنا۔ خدا اور

بندوں کو جوڑنا۔ — اس کا اصطلاحی مفہوم ہے باہم جدا ہو جانے والے فریقوں کو یکجا کرنا۔

(۲) Reconciliation یعنی تعلقات بحال کرنا۔ یعنی ایسے دو فریقوں کو جو

آپس میں اجنبی ہو کر الگ الگ ہو گئے تھے انہیں یکجا کرنا۔

(۳) Salvation یعنی زخم بھرنا یا اچھا کرنا۔ یعنی صحت یاب کرنا۔

ان تینوں مفاہیم میں جو کیفیت مشترک ہے وہ ہے: ایک حالت سے دوسری حالت کو منتقلی

— چنانچہ Redemption کا مفہوم ہے ایک حالت سے آزاد ہو کر دوسری حالت میں منتقل

ہونا۔ — اس طرح عیسائیت میں Redemption کو درج ذیل دو باتوں میں ٹنص کیا جاسکتا ہے۔

(۱) کائنات میں دو حالتیں پائی جاتی ہیں۔

(۱) انسان — گناہ، موت، قانون، جسم (طبعی)، شیطان، ظلم، دنیا کی طاقتیں

اور تاریکی کا غلام ہے۔ یہ ایک حالت ہے۔

(۲) مغفرت، ابدی حیات، آزادی، قلب ماہیت، ربانی ولدیت، خلاصی،

پیدائش جدید، زندگی اور روشنی کا حصول — یہ دوسری حالت ہے۔

اس طرح حضرت عیسیٰ کی آمد دراصل اسی نجات (Redemption) کے لیے ہوگی

جو مغفرت، ابدی حیات، آزادی، قلب ماہیت، ربانی ولدیت، خلاصی، پیدائش جدید اور روشنی سے

عبارت ہے۔ ہر چند کہ نجات (Redemption) موجودہ عیسائیت کا بنیادی عقیدہ ہے لیکن جیسا

کہ ہم لوگوں نے دیکھا کہ متناہی اناجیل (Synoptic Gospel) جب آمد مسیح کا ذکر کرتی ہیں

تو وہ مبہم اور غیر واضح ہوتی ہے۔ اور اس میں سب سے بڑا خلا آمد کے مقصد کا پایا جاتا ہے۔ جسے

Redemption کے عقیدے سے پر کیا گیا ہے۔ دوسری طرف یوحنا کی انجیل حضرت عیسیٰ

کی زبان سے اپنے بعد آنے والے شخص کا ذکر کرتی ہے۔ اور حضرت عیسیٰ کے دوبارہ آنے کا بظاہر کوئی ذکر نہیں کرتی۔ تیسری طرف پیشین گوئی (Revelation) کا اقتباس — اگر اس کا انطباق حضرت عیسیٰ پر کیا جائے — تو وہ حضرت عیسیٰ کی اس دوبارہ آمد کا ذکر کرتی ہے جو Second Coming سے زیادہ قریب ہے جو Anti Christ کے خاتمے کے لیے ہوگی۔ چنانچہ درج ذیل باتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں:

(۱) عیسائیت حضرت عیسیٰ کی دوبارہ آمد پر یقین رکھتی ہے اور اس کا مقصد نجات (Redemption) قرار دیتی ہے۔

(۲) متناہی اناجیل واضح طور پر حضرت عیسیٰ کی دوبارہ آمد کے بجائے Son of man کی آمد کا ذکر کرتی ہیں مگر نجات (Redemption) کا واضح ذکر نہیں کرتیں۔

(۳) چوتھی انجیل یعنی یوحنا کی انجیل حضرت عیسیٰ کی دوبارہ آمد کا ذکر نہیں کرتی بلکہ حضرت عیسیٰ کی زبان سے اپنے جانے تاکہ دوسرا آئے کا ذکر کرتی ہے اور کسی نجات (Redemption) کا ذکر نہیں کرتی۔

(۴) پیشین گوئی (Revelation) حضرت عیسیٰ کی دوبارہ آمد کا ذکر کچھ ابہام کے ساتھ کرتی ہے مگر اس کا مقصد نجات (Redemption) کے بجائے آنتائی کرائست کا خاتمہ بتاتی ہے۔

(۵) بلاشبہ یہی پیشین گوئی (Revelation) اس کا بھی اظہار کرتی ہے کہ حضرت عیسیٰ آنتائی کرائست کا خاتمہ کر کے زمین پر مثالی نظام عدل قائم فرمائیں گے۔

(۲) دجال کا ظہور: دجال کے تعلق سے کئی باتیں عیسائیت میں حیرت ناک ہیں جن کی تلخیص درج ذیل ہے:

(۱) کسی ایسے ایک یا ایک سے زائد اشخاص کے بارے میں تینوں متناہی اناجیل — یعنی متی، مرقس اور لوقا — بالکل خاموش ہیں۔ جب کہ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہی وہ اناجیل ہیں جو عیسائیوں کے بقول حضرت عیسیٰ کے دوبارہ آنے کی بات کہتی ہیں۔

(۲) اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ یوحنا کی انجیل — جو چوتھی انجیل کہلاتی ہے — کسی ایسے تذکرے سے خالی ہے جس کا انطباق دجال پر ہو سکتا ہو۔

(۳) دجال کا تذکرہ متعین طور آنتائی کرائسٹ (Anti-Christ) کے اعتبار سے ان دو مراسلوں میں ملتا ہے جسے یوحنا نے لکھا تھا اور جو یوحنا کا پہلا مراسلہ (First Epistle of John) اور یوحنا کا دوسرا مراسلہ (Second Epistle of John) کہلاتے ہیں۔

چنانچہ یوحنا کے پہلے مراسلہ کے حصہ دوم کی 18 تا 22 سطر میں ہے:

”بچو! یہ آخری وقت ہے اور جیسا تم نے سنا ہے کہ ’آنتائی کرائسٹ‘ آنے والا ہے۔ اس کے مطابق اب بھی بہت سے ’آنتائی کرائسٹ‘ اٹھے ہیں۔ اس سے ہم جانتے ہیں کہ یہ آخری وقت ہے۔ وہ نکلے بھی تو ہم ہی میں سے لیکن ہم سے تھے نہیں۔ اس لیے کہ اگر ہم میں سے ہوتے تو ہمارے ساتھ رہتے۔ لیکن نکل اس لیے گئے کہ یہ ظاہر ہو کہ وہ ہم سے نہیں ہیں۔ اور تمہارا تو اس مقدس سے مسح ہوا ہے اور تم سب کچھ جانتے ہو۔ میں نے تمہیں اس لیے نہیں لکھا کہ تم صدق کو نہیں جانتے بلکہ اس لیے کہ اسے جانتے ہو۔ اور اس لیے کہ کوئی جھوٹ سچائی کی طرف سے نہیں۔ کذاب کون ہے؟ صرف وہ جو عیسیٰ کے مسیح ہونے کا انکار کرتا ہے۔ اور ’آنتائی کرائسٹ‘ وہی ہے جو باپ اور بیٹے کا انکار کرتا ہے۔“

اسی طرح یوحنا کے دوسرے مراسلے کی سطر ۷ میں لکھا ہے:

”کیونکہ بہت سے ایسے فریب دینے والے دنیا میں نکل آئے ہیں جو یہ نہیں اقرار کرتے کہ عیسیٰ مسیح مجسم آنے والے ہیں۔ یہی فریب دینے والا ہے۔ یہی آنتائی کرائسٹ ہے۔“

(۴) ایک اور تذکرہ ملتا ہے جہاں کسی ایسے آنے والے کو ”لادینیت کا آدمی“ (Man of

Lawlessness) اور ”بتاہی کا بیٹا“ (The Son of Perdition) کہا گیا ہے۔ چنانچہ تھسل لونی کیوں حصہ دوم کی سطر ۱۰ تا ۱۰ میں لکھا ہے:

”بھائیو! ہم اپنے آقا عیسیٰ مسیح کے آنے اور اس کے پاس اپنے اکٹھے ہونے کے بارے میں تم سے عرض کرتے ہیں۔ کہ کسی فرد (نفس) یا کلام یا خط کے ذریعہ جو گویا ہماری طرف سے ہو یہ سمجھ کر کہ خدا کا دن آگیا ہے تمہارا دل اچانک متزلزل نہ ہو جائے اور نہ تم گھبراؤ۔ کسی طریقے سے کسی کے فریب میں نہ آنا کیونکہ وہ دن نہیں آئے گا جب تک دین کا ترک نہ ہو لے، اور وہ ”لادینیت کا آدمی“ یا ”بتاہی کا بیٹا“ ظاہر نہ ہو جائے۔ جو مخالفت کرتا ہے اور ہر ایک سے جو خدا یا معبود ہے اپنے آپ کو بڑا ٹھہراتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ بیت اللہ میں متمکن ہوتا ہے ایسے جیسے وہ خدا ہو۔ کیا تمہیں یاد نہیں

کہ جب میں تمہارے یہاں تھا تو تم سے یہ باتیں کہا کرتا تھا۔ اور اب تم اس شے کو جانتے ہو جو اسے روک رہی ہے کہ وہ اپنے ہی وقت میں ظاہر ہو۔ کیونکہ لادینیت کا راز برسرِ کار ہے لیکن ابھی ایک روکنے والا ہے اور جب تک وہ دور نہ ہو جائے وہ روکے رہے گا۔ تب وہ ”لادین“ ظاہر ہو گا جسے آقا عیسیٰ اپنے منہ کی پھونک سے مار ڈالے گا اور اپنی آمد کے نور سے تباہ کر دے گا۔ اس ”لادین“ کا آنا شیطان کے عمل کے مطابق ہے۔ پوری طاقت، فشانوں اور کرشموں کے ساتھ۔ اور فانی (لوگوں) کے لیے تمام ناجائز فریبوں کے ساتھ اس لیے کہ انہوں نے سچائی کی محبت کو اخذ نہیں کیا جس سے وہ محفوظ رکھے جاسکتے تھے۔

(۵) ایک اور تذکرہ ہے جو دو جانوروں سے متعلق ہے اور پیشین گوئی (Revelation)

میں 13:1-18، 17:7-18 اور 19:17-21 میں پایا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک جانور ”زمینی“ ہے اور دوسرا ”بحری“۔ یہ دونوں دجال کی طرح پیش کیے گئے ہیں جو انسانوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔

چنانچہ ان دونوں جانوروں میں سے پہلے جانور کا تذکرہ جو ”بحری جانور“ ہے پیشین گوئی کے حصہ سیزدہم سطر ۱ تا ۱۰ میں اس طرح ہے:

”اور میں نے ایک جانور کو سمندر سے نکلتے ہوئے دیکھا، جس کی دس سینگیں اور سات سر تھے۔ اور اس کی سینگوں پر دس تاج تھے اور اس کے سروں پر اہانت کے نام لکھے تھے۔ اور جو جانور میں نے دیکھا وہ چیتے کی طرح تھا اور اس کے پاؤں بھالو کی طرح اور منہ شیر کا تھا اور اثر دھانے اسے اپنی طاقت، اپنا تخت اور عظیم اقتدار دے رکھا تھا۔ اور میں نے اس کے سروں میں سے ایک پر ایسا بھاری زخم لگا دیکھا گویا وہ مرنے والا ہو، پھر اس کا مہلک زخم اچھا ہو گیا اور ساری زمین کے لوگ اس جانور کے پیچھے پیچھے حیرت کرتے ہوئے چلنے لگے۔ اور وہ اثر دھانے کی پرستش کرنے لگے کہ اس جانور کی طرح کون ہے؟ کون اس سے لڑ سکتا ہے؟ اور اسے بڑے بول بولنے اور اہانت کرنے والا ایک منہ دیا گیا۔ اور اسے بیالیس مہینے کام کرنے کا اختیار دیا گیا۔ اور اس نے خدا کی اہانت کرنے کے لیے منہ کھولا تاکہ اس کے نام اور اس کے خیمے اور جو آسمانوں میں رہتے ہیں کی اہانت کرے۔ اور اسے یہ اختیار دیا گیا کہ مقدس لوگوں سے لڑے اور ان پر فتح پائے، اور اسے ہر ایک قبیلے، زبان اور قوم پر اختیار دیا گیا اور زمین کے وہ سب رہنے والے جن کے نام مہینے کا۔ جو دنیا کی بنیاد (ابتداء) سے قتل کر دیا گیا۔ زندگی کی کتاب میں لکھے

نہیں گئے اس جانور کی پرستش کریں گے۔ جس کے کان ہوں وہ سنے! جو قید کی طرف پیش قدمی کرتا ہے تو قید میں پڑے گا، جو تلواریں سے مارتا ہے ضرور تلوار سے قتل کیا جائے گا۔ پاک لوگوں کا صبر اور ایمان اسی میں ہے۔“

دوسرے جانور کا تذکرہ جو ”زمینی جانور“ ہے اس کے بعد اس طرح ہے:

”پھر میں نے ایک اور جانور کو زمین سے نکلتے دیکھا، اس کے سینے کے سے دو سینک بٹھے، اور وہ اڑدھا کی طرح بولتا تھا۔ اور یہ اس پہلے جانور کا سارا اختیار اس کے سامنے استعمال کرتا تھا، اور زمین اور اسکے رہنے والوں سے اس پہلے جانور کی جس کا مہلک زخم اچھا ہو گیا تھا پرستش کرتا تھا، اور وہ بڑی بڑی نشانیاں دکھلاتا تھا، یہاں تک کہ انسانوں کے سامنے آسمان سے زمین پر آگ برساتا تھا اور ان نشانیوں کے سبب جنہیں اس جانور کے سامنے دکھلانے کا اسے اختیار دیا گیا تھا وہ زمین کے رہنے والوں کو اس طرح فریب دیتا تھا کہ زمین کے رہنے والوں سے کہتا تھا کہ جس جانور کو تلوار لگی تھی وہ زندہ ہو گیا۔ ہے اس کا بت بناؤ اور اسے اس جانور کے بت میں جان ڈالنے کا اختیار دیا گیا کہ جانور کا بت بولنے لگے اور جتنے لوگ اس جانور کے بت کی پرستش نہ کریں انہیں مردا ڈالے۔ اور اس نے چھوٹے، بڑے، امیر، مفلس، آزاد، غلام سب کے داہنے ہاتھ یا ان کی پیشانی پر ایک ایک نشان لگوا دیئے تاکہ وہ لوگ جن کے وہ نشان ہے یا ان پر اس جانور کا نام لکھا ہے یا اس کے نام کے عدد ہیں کوئی دوسرا خرید و فروخت نہ کر سکے۔ یہیں حکمت ہے۔ جس کے پاس فہم ہے وہ حساب کر لے، جانور کے عدد کا اس لیے کہ یہ ایک آدمی کا عدد ہے۔ اس کا عدد ہے 666۔“

جہاں تک آنتائی کرائسٹ (Anti-Christ) کی بات ہے تو یہ ایک یونانی اصطلاح ہے جس میں Anti کا مفہوم ہے۔ ”کسی کی مخالفت میں“ (Over against) یا ”بجائے“ (Instead of)۔ چنانچہ یوحنا کی مراسلت میں اس فرد کا تذکرہ جس تناظر میں ہوا ہے وہ یہ ہے کہ وہ شخص حضرت عیسیٰ کی مخالفت میں بھیجا گیا ہے یا بھیجا جائے گا یا ان کی بجائے۔ یہ مفہوم بہت واضح اور احادیث نبویہ ﷺ سے بالکل ملتا جلتا ہے۔ جہاں ”المسیح الدجال“ کہا گیا ہے۔

۱۔ تحصیل لونی کیوں میں جو تذکرہ پایا جاتا ہے، اس میں اس ”فرد“ کی — جو حضرت عیسیٰ کا مخالف اور ان کے بجائے آئے گا — کئی صفات ابھری ہوئی ملتی ہیں۔ مثلاً (۱) جھوٹا (۲) فریبی (۳) خدائی کا دعویدار (۴) حیرت ناک کرشموں اور نشانیوں کو دکھلانے والا (۵) طاقت ور

(۶) دین مخالف (۷) بتائی لانے والا (۸) خدا کا مخالف اور (۹) ناجائز طریقوں کا استعمال کرنے والا وغیرہ۔

یہاں شیطان اور اس کی بندش سے متعلق ایک خاص بات ہے جو پیشین گوئی (Revelation) میں ملتی ہے۔ پیشین گوئی کے حصہ بستم میں درج ہے:

”پھر میں نے ایک فرشتے کو آسمان سے اترتے دیکھا جس کے پاس اتھاہ گڑھے کی کنجی اور ایک بڑی زنجیر تھی۔ اور اس نے اس اژدھا یعنی قدیم سانپ کو جو کہ دائی بولوس اور شیطان ہے پکڑا اور ایک ہزار سال کے لیے باندھ دیا۔ اور اسے اتھاہ گڑھے میں پھینک دیا اور اس (گڑھے) کو بند کر دیا اور اس پر ایک مہر لگا دی تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ قوموں کو ایک ہزار سال پورا ہونے سے پہلے فریب دے دے، لیکن اس کے بعد وہ ضرور تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ دیا جائے گا۔“

یہاں ایک بات کا ذکر افادیت سے خالی نہیں ہو گا کہ یوحنا اپنی انجیل میں آنتائی کرائست کے وفاداروں اور پیروؤں کی نشاندہی کرتا ہے۔ یوحنا کی انجیل حصہ ۵ سطر ۴۳ میں مذکور ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہودیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ”میں اپنے باپ کے نام سے آیا ہوں اور تم مجھے قبول نہیں کرتے، اگر کوئی اپنے ہی نام سے آئے تو اسے قبول کر لو گے۔“

یہ تمام بیانات دجال سے متعلق ان بیانات سے ملتے جلتے ہیں جو احادیث میں درج ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ عیسائیت نے تاریخ میں اپنے تمام مخالفین کو — حتیٰ کہ خود اپنے اندر کے فرقوں کو جن میں باہم اختلاف تھا آنتائی کرائست کا لقب دیا۔ تاہم جہاں تک عقائد کے اظہار اور تصور آخرت (Eschatology) کا تعلق ہے تو آنتائی کرائست کا مسئلہ عیسائیت میں نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ چنانچہ عیسائیت کی معتبر مجسم Lexikon Für Theologie und Kirche میں K. Rahner نے لکھا ہے:

”This teaching gives Christians a permanent right not merely to wage war upon anti-Christian powers and ideas in the abstract, but to recognize and to flee from men and powers in the concrete: as its representatives.“

(K. Rahner: Lexikon für Theologie und Kirche (LTK) 1957-67 as quoted by Rudolf Pesche in

Sacramentum Mundi: Herder & Herder, New York.)

ترجمہ:

”(آنتائی کرائست سے متعلق) یہ تعلیم عیسائیوں کو نہ صرف عیسائی مخالف قوتوں اور خیالات کے خلاف معروضی طور پر جنگ کرنے کا مستقل اور دائمی حق دیتی ہے بلکہ اس بات کا بھی کہ ایسے افراد اور قوتوں کی جو متعین طور پر اس کی نمائندگی کرتی ہیں تہمین کی جائے اور ان سے دور بھاگ جایا جائے۔“ ۵

اس سے آگے بڑھ کر مشہور عیسائی مفکر اور عالم فرور (Frör) کہتے ہیں:

”Among the traditions concerning the last days, the doctrine of Anti-Christ has a special pastoral function to fulfil. It serves to arm the believing community to do battle with the compact forces of darkness, in the form in which they encounter them in their own age.”

(K.Frör: Biblische Hermeneutik (2nd ed 1964) as quoted by Rudolf Pesche in Sacramentum Mundi, Herder & Herder, New York.)

ترجمہ: ”آخری ایام سے متعلق روایات میں عقیدہ آنتائی کرائست ایک مخصوص راعیانہ مشن ہے جس کی تکمیل ہوتی ہے۔ یہ عبارت ہے اہل ایمان کو مسلح کرنے سے تاکہ وہ ظلمات کی منظم قوتوں سے جنگ کرے۔ اسی طرح جس طرح (پہلے وہ عہد مسیح میں کرتے۔)“ ۶

عیسائی علماء کو یہ تسلیم ہے کہ ہر چند کہ آنتائی کرائست کا آنا یقینی ہے لیکن اس کی آمد کی علامات مبہم ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ ایک ضروری امر ہے۔ تاہم ان کے مطابق یہ بات یقینی ہے کہ حضرت مسیح کی آمد سے قبل آنتائی کرائست کا آنا لازمی ہے جو تباہی، بددینی، فریب، جھوٹ، جنگ اور غار نگری لے کر آئے گا۔

(۳) حضرت مسیح کے ذریعہ دجال کا خاتمہ اور

روئے زمین پر نظام عدل کا قیام:

عیسائیت میں حضرت مسیح کے ذریعہ دجال کے خاتمے اور روئے زمین پر نظام عدل کے

استعمال کیا گیا ہے۔ (ملاحظہ فرمائیں یوحنا ۳: ۳-۵)

اب جہاں تک خود اس بات پر غور کیا جاتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے عہد بعثت سے ان کے ذریعہ بیان کردہ ”حکومت الہیہ“ کی کیا تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے تو اس کا جائزہ لینے سے تین امور سامنے آتے ہیں:

(۱) ”حکومت الہیہ“ بطور تجربہ ”مغفرت“:

چنانچہ متناہی اناجیل میں جا بجا اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت مغفرت کا ایک غیر معمولی تجربہ تھی۔ مثلاً

(۱) بنی اسرائیل کو توبہ کی دعوت دی گئی — اس لیے کہ حکومت الہیہ قریب آرہی ہے

(مرقس: ۱۴-۱۵)

(۲) حکومت الہیہ غریبوں کے لیے خوشخبری ہوگی۔ (متی ۱۱: ۵ لوقا ۴: ۱۸)

(۳) ہر روحوں سے شفا اور نجات حکومت الہیہ کی آمد ہے۔ (متی ۲۸: ۱۲ لوقا ۱۱: ۲۰)

(۲) حکومت الہیہ بطور اخروی واقعہ:

حکومت الہیہ کی آمد کا ”وقت“ شاید وہ سب سے الجھا ہوا مسئلہ ہے جو عالم عیسائیت میں ہمیشہ موضوع بحث رہا ہے اور جس نے بڑا ہیجان برپا کیا ہے۔

چنانچہ ابتدائی عیسائیت میں ”حکومت الہیہ“ کو حضرت مسیح علیہ السلام میں مرکوز کیا گیا اور اس تناظر میں اسے دو اعتبار سے دیکھا گیا:

(۱) حضرت مسیح یعنی ذات مسیح — اور

(۲) حضرت مسیح یعنی مقصد بعثت، رحم (Passion)، موت، نشاۃ ثانیہ

(Ressurrection)، ارتقاع (Exaltation) اور رجعت (Return)۔

دونوں ہی صورتوں میں اس سے مراد اخروی امر ہے۔ لیکن اس اخروی امر سے مراد یہ

ہے کہ حضرت مسیح کی قربانی ہی دراصل حکومت الہیہ کا تجربہ ہے۔ مابعد فسخ عقیدے (Post

Pascal Faith) کے تحت حضرت عیسیٰ کا رحم (Passion) اور ان کی موت (Death)

حکومت الہیہ کا غفرانی واقعہ ہے جس کا اعلان حضرت مسیح نے کیا۔

۱۸۹۲ء میں یوحانیس ویس (Johannes Weiss) کی کتاب نے ایک بار پھر اس بحث میں تلاطم پیدا کر دیا کہ حضرت مسیح کی آمد کا وقت کون سا ہے۔ چونکہ مرقس میں کہا گیا: ”جب یوحنا کو قید میں ڈال دیا گیا تو عیسیٰ گلیلی آیا اور حکومت الہیہ کی خدائی خبر کی تلقین کرتے ہوئے کہا: وقت پورا ہو چکا ہے اور حکومت الہیہ قریب ہے۔ توبہ کرو اور خدائی خبر پر ایمان لاؤ (مرقس ۱: ۱۴-۱۵)۔ چنانچہ حواریوں کو تلقین کی گئی: ”اور اس نے ان سے کہا: بلاشبہ میں تم سے کہتا ہوں یہاں جو لوگ کھڑے ہیں ان میں سے بعض موت کا ذائقہ نہیں چکھیں گے مگر یہ کہ اس سے قبل حکومت الہیہ کو مقتدر موجود دیکھ لیں۔“ (مرقس ۱: ۹)

ان باتوں سے ویس (Weiss) شوائر (Schweitzer) اور دوسروں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ خود حضرت عیسیٰ کو وقتِ آخر یعنی قیامت کے برپا ہونے کی امید تھی۔^۹ لیکن چونکہ بعض دوسری جگہوں پر وہ قربت ان کی موجودگی کو ثابت کر رہی ہے مثلاً: ”لیکن اگر میں شیاطین کو روح القدس سے باہر نکال دوں تو سمجھ لو واقعی حکومت الہیہ تم پر وارد ہو چکی ہے۔“ (متی ۱۲: ۲۸)

بعض دیگر علماء نصاریٰ مثلاً سی۔ ایچ ڈوڈ (C.H. Dodd) نے نتیجہ اخذ کیا کہ خود حضرت مسیح کی اِحتِ اول ہی حکومت الہیہ کا قیام تھی۔ اس نظریے کو ”اخذ کردہ نظریہ آخرت“ (Realized Eschatology) کہا جاتا ہے۔^{۱۰} (۳) حکومت الہیہ بطور الہیاتی انکشاف:

حکومت الہیہ کی سابق دو توجیہات کے ساتھ ساتھ ایک اور توجیہ بھی کی جا رہی ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ ایک تنبیہ ہے جو اسرائیل کی اس آرزو کا اظہار کرتی ہے جس میں وہ خدا کا تجربہ کرنا چاہتے ہیں۔ بنو اسرائیل سمجھتے ہیں کہ اپنی پوری تاریخ میں وہ ناکام اور مایوس ہوئے اور انہیں امن کی شدید ضرورت ہے جسے وہ آنے والے خدا کے بیٹے کی لائی گئی مغفرت میں متصور کرتے ہیں۔ اس سے مراد ہے تمام کائنات اور مخلوقات بشمول انسان پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کا قیام۔ اس اعتبار سے متنبی اناجیل میں جس آمد کا ذکر ہے اس کی تعبیر سامنے آنے کے بعد دوسرے سوال کا فیصلہ اسی مقام پر ہو جاتا ہے کہ وہ ایک استخراجی مسئلہ ہے۔ یعنی "Parousia"

یا حضرت مسیح کی لوگوں کی مغفرت کے لیے آمد اور ان کی موجودگی۔

حضرت مسیح کے ذریعہ آنتائی کرائست کا خاتمہ:

اب جہاں تک ”حضرت مسیح کے ذریعہ آنتائی کرائست کے خاتمے“ اور اس کے بعد کے سکتے یعنی ”آنتائی کرائست کے خاتمے کے بعد روئے زمین پر نظام عدل کا قیام“ کی بات ہے تو ان دونوں کا تعلق فی الواقع متاخری اناجیل (Synoptic Gospel) سے نہیں ہے۔ ان کا تعلق تمام کا تمام یا تو یوحنا کی انجیل، یوحنا کے لکھے مراسلے، یوحنا کی پیشین گوئی یا پھر تھسل لونی کیوں کے مراسلے سے ہے۔ اور ان میں بھی بطور خاص یوحنا کی پیشین گوئی (Revelation) سے۔

متاخری اناجیل اور یوحنا کے ذریعہ مرتب کردہ انجیل اور پیشین گوئی میں ظاہری تضاد دراصل اس بڑے تضاد کا پتہ دیتا ہے جو مخفی ہے۔ یعنی حضرت مسیح اگر آنتائی کرائست کے خاتمے کے لیے آرہے ہیں تو وہ جو نظام عدل قائم فرمائیں گے۔ اس کا تعلق نہ اخروی دنیا سے ہو گا نہ مغفرت سے۔ اور اگر اس اخروی دنیا کے قیام اور مغفرت کے لیے تشریف لارہے ہیں تو آنتائی کرائست کا خاتمہ کون کرے گا اور وہ نظام جس کا ذکر مبہم ہی سہی پیشین گوئی کے آخر میں ہے اس کو کون حقیقت کی شکل دے گا۔ اور جب کہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کی تیسری آمد کا ذکر نہیں ہے۔

ظاہر ہے حضرت مسیح علیہ السلام کی دوسری آمد صرف اور صرف دو باتوں کے لیے ہی ہو سکتی ہے یعنی

(۱) آنتائی کرائست کا خاتمہ اور اس کے بعد

(۲) نظام عدل کی بحالی

اور یہ دونوں امور دراصل Second Coming اور Parousia میں فرق کرتے ہیں اور فی الواقع Parousia کی تردید کرتے ہیں — کم از کم ان معنوں میں جن میں وہ عام طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

اس تعلق سے رومن کیتھولک چرچ کا عام عقیدہ درج ذیل ہے:

(۱) یوحنا کا ساتواں مشہد بنیادی طور پر مغفرت (Salvation) سے تعلق رکھتا ہے۔

(۲) یہاں بنیادی قطع تسلسل (Radical Discontinuity) پایا جاتا ہے۔ یعنی یہ زمین اور یہ آسمان کلیتہً بدل جائیں گے۔ اور نیا آسمان اور نئی زمین واقع ہوئیں جہاں سمندر نہیں ہوں گے۔

(۳) سمندر کا غائب ہو جانا دراصل ہمیشہ کے لیے سانپ (Dragon) اور انتائی کراست (beast) کے ختم ہو جانے کے مترادف ہے۔ یہ لا قانونیت اور لادینیت کے کلی خاتمے کا بھی مظہر ہے۔ یہاں تک کہ موت کے خاتمے کا بھی۔ یعنی سمندر کے خاتمے سے ایک ابدی زندگی متصور کی جاتی ہے۔

(۴) نیا یروشلیم دراصل ایک اخروی تصوراتی اظہار ہے۔ اس میں کسی تاریخی یروشلیم کی بحالی کی بات تصور نہیں کی گئی ہے۔

(۵) اس میں کسی بیکل کا تصور نہیں اس لیے کہ یوحنا نے کہا:

”میں نے اس شہر میں بیکل نہیں دیکھا، اس لیے قادر مطلق رب اس کا خود

بیکل ہے اور مینہ۔“ (پیشین گوئی ۲۱ : ۲۲)

حضرت مسیح کے ذریعہ نظام عدل کا قیام:

اب صرف دو باتوں کی وضاحت باقی رہتی ہے۔ اور اس میں پہلی بات اس حکومت الہیہ

(Kingdom of God) کی بات ہے جسے یوحنا نے اُو۔ را۔ نُون۔ کائے۔ نُون۔ کائے۔

گین۔ کائنیں یعنی۔ نیا آسمان اور نئی زمین — کہا ہے اور دوسری بات اس شہر قدس کی ہے جسے یوحنا نے اُو۔ شلیم۔ کائے۔ مین (نیا یروشلیم) کہا ہے۔

نیا آسمان اور نئی زمین :

یوحنا نے، پیشین گوئی میں لکھا:

”پھر میں نے نئے آسمان اور نئی زمین کو دیکھا، کیوں کہ پہلا آسمان اور پہلی

زمین جاتی رہی تھی اور سمندر بھی نہ رہا۔ (پیشین گوئی ۲۱ : ۱)

یہاں دو سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا۔ نیا سے کیا مراد ہے؟ اور دوسرا سطر ۴ میں موت

سے کیا مراد ہے؟

اگر نیا سے مراد تبدیل شدہ اور تبدیل شدہ سے مراد اخروی ہے اور اخروی سے مراد اس

زمین کے سوا کوئی اور زمین ہے تو اس کا کوئی قرینہ موجود نہیں۔ اگر نیا سے مراد تبدیل شدہ اور تبدیل شدہ سے مراد اسی روئے زمین پر نئی صورت حال ہے تو اس سے مراد ایک ایسی دنیا تو ہو سکتی ہے جہاں پہلی روئے زمین کی آلائش اور برے لوازمات نہ ہوں لیکن ہو وہ یہی روئے زمین اور وہ بھی آخرت اور آخرت کی مغفرت سے پہلے کی زمین اور زمین اور آخرت کے مابین قیامت ہو۔

چنانچہ انجیلی یونانی کے پچھلی صدی کے سب سے بڑے ماہر Swete نے لکھا ہے کہ اس سطر (پیشین گوئی (۱: ۲۱) میں۔ کائے۔ نوں۔ جو ضد ہے پالائیوس کا۔۔۔ صرف "Fresh life rising from the decay and wreck of the old world."

کی نشاندہی کرتا ہے۔"

چنانچہ اس 'نیا نئی' کا صرف ایک ہی مطلب لیا جاسکتا ہے یعنی اسی روئے زمین اور اس کے آسمان کو آلائشوں سے پاک کر کے نئی زمین اور نیا آسمان دریافت کرنا۔ (اس تعلق سے بحث ان شاء اللہ احادیث کے حصے میں ہوگی) اور یہ بات ان بیانات سے بالکل یکسانیت رکھتی ہے جن کا ذکر احادیث مبارکہ میں کیا گیا ہے۔

دوسرا سوال ہے: سطر ۴ میں 'موت' کا ذکر کیا اس سے مراد ابدی حیات ہے جیسا کہ عیسائیت کا بڑا حصہ مراد لینا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے اس کی تردید خود اسی سطر کے اندر پائی جاتی ہے۔ یعنی یہ کہنا:

"اور خدا ان کی آنکھوں سے ہر آنسو پونچھ ڈالے گا۔"

یہ عبارت بتاتی ہے کہ یہ کوئی نئی تخلیق نہیں ہوگی۔ نئی تخلیق کے آنسو پونچھنے سے کیا مراد ہو سکتی ہے۔ آنسو اس مجمعے کے ہو سکتے ہیں جو کرب، تکلیف جیسے کہ جنگ، بیماری یا اذیت سے گزرا ہو۔ لہذا یہاں موت سے مراد وہ غیر معمولی موت ہے جو جنگ، بیماری اور اذیتوں کا نتیجہ ہوتی ہے نہ کہ خلق میں عادتاً پائی جانے والی موت۔

تیسرا سوال ہے کہ شہر قدس اور نیاروشلم سے کیا مراد ہے؟

پورے عیسائی علمی ورثے میں یہ تصور تین صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے:

(۱) اس دنیا سے ماوراء کوئی شہر قدس جسے نیاروشلم کہا گیا ہے جو اخروی اور ابدی ہو۔

(۲) اس دنیا میں واقع کسی بہت اونچے پہاڑ پر واقع اس شہر مقدس کا قیام جو روئے ارض پر Temple (بیت معمور) کی تمثیل ہو۔

(۳) فلسطین میں واقع یروشلیم اور وہاں صیہون کا پہاڑ۔

(ہر چند کہ یہ بحث فی الواقع عالم اسلام کی منصبی و مقصدی صورت حال میں ان شاء اللہ تفصیل سے ہوگی) اس مسئلے کے تعلق سے اس مقام پر چند تنقیحات کا سامنے آجانا ضروری ہے تاکہ اس بات کی تعیین ہو جائے کہ یہاں نیا یروشلیم سے کیا مراد ہے۔

(۱) یہودیت میں یروشلیم، اس کے تقدس اور اس میں قائم ہیکل سلیمانی کا بہت چرچا ہے۔ لیکن یہودیت کی تاریخ کچھ عجیب بات بیان کرتی ہے۔

(الف) عبرانی تنک (TaNaK) میں یروشلیم ۶۶۰ بار آیا ہے۔ بارہا صیہون (Zion) کا ذکر اس کے مترادف کے اعتبار سے (تقریباً ۱۵۴ بار) ہوا ہے۔ لیکن سب سے چونکانے والی بات، یہ ہے کہ اگر تنک میں مذکور لفظ ”شلیم“ کو نظر انداز کر دیا جائے یا اس کی دیگر تعبیروں کو تسلیم کر لیا جائے تو یہ لفظ تورات (Torah) میں ایک بار بھی استعمال نہیں ہوا ہے۔ اس سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ یہودیت میں یروشلیم کی کوئی دینی اہمیت نہیں۔

(ب) یہ سارے کے سارے استعمالات جو تقریباً ۶۶۰ بار ہوئے ہیں فی الواقع نبییم اور کتبیم یعنی تاریخی حصے میں ہوئے ہیں۔ مثلاً ۲ سموئیل، بادشاہان، تواریخ، عزرا، نحمیا یا یسعیاہ، یرمیاہ، یحزقئیل اور زکریاہ میں۔

(ج) ان کے مطابق اس شہر کی اہمیت دراصل حضرت داؤد کے ذریعہ یہاں ”تابوت سکینہ“ کے لانے اور رکھنے اور بعدہ اس پر حضرت سلیمان کے ذریعہ ہیکل کی تعمیر کرنے سے ہے۔ لیکن واضح ہو کہ یہ صرف ان کا دعویٰ ہے۔ ورنہ حضرت داؤد ہی وہ پہلے نبی ہیں جنہوں نے بنی اسرائیل کی علانیہ بغاوت پر اصرار پر ان کی لعنت کی۔ اور قرآن نے اس کی کوئی صراحت نہیں کی ہے کہ یہودیوں کے دعویٰ کے مطابق وہ ہیکل حضرت سلیمان نے بنوایا تھا بلکہ اسے صرف مسجد قرار دیا گیا۔ یہاں نا پیچیدگی اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب دو نبیوں حضرت میکاہ اور حضرت یرمیاہ نے یروشلیم کے حرم ہونے کی تردید کی۔

(د) جب بابلیوں نے (۵۸۶-۵۸۷ ق م) اس شہر کو برباد کر دیا تو یہودی روایات کے

مطابق بعض انبیاء بنی اسرائیل نے اسکی بحالی اور مسجد کی تعمیر سے امیدیں وابستہ کیں۔ ایسے تذکرے ضرور ملتے ہیں۔ ۷۰ عیسوی میں حضرت مسیح علیہ السلام کے یہودیوں کے مطابق مصلوب کئے جانے کے بعد وہ شہر دیران کر دیا گیا اور ہیکل تباہ ہو گئی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب یہودی پیشین گوئی (Jewish Apocalyptic Literature) میں دو طرح کے تصورات در آئے۔
(۱) دنیا کے آخری عہد میں وہ آسمانی یروشلم جسے خدا نے بنارکھا ہے زمین پر اتر آئے گا۔

(۲) اس آسمانی یروشلم میں جسے خدا نے آسمان پر بنارکھا ہے وہ یہودی داخل ہو جائیں گے جو صدیق ہوں گے۔

بہر حال ان دونوں اعتبار سے یروشلم کا تصور ان کی آخری زندگی کا حصہ ہو گیا۔
(۵) ربیانی یہودیت (Rabbinical Judaism) جس کا عہد تیسری صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے دو چیزوں کی قائل رہی:

(۱) مسیحی عہد میں یروشلم کی تجدید کی مرکزیت
(۲) مستقبل کے (مسیحی عہد) عہد کے ذکر میں ابہام کا ہونا۔ یعنی بعض کا آسمانی یروشلم پر یقین اور بعض کا زمینی یروشلم پر یقین۔

بلکہ اس میں بھی عجیب و غریب بات یہ ہے کہ ابتدائی ربیانی عہد میں یروشلم کے دو تذکرے ملتے ہیں۔ اور وہ دونوں تذکرے دونوں تصورات پر یکساں زور ڈالتے ہیں۔ یعنی اس یروشلم پر جو تصوراتی اور مسیحی عہد میں بننے والا نامعلوم — اور بعض حلقوں کا آسمانی یروشلم اور بعض حلقوں کا زمینی یروشلم — ہے۔ اور دوسرا اس یروشلم پر جو یہودیوں کی تاریخ یعنی ان کے بادشاہوں کی راجدھانی کے اعتبار سے پایا جاتا ہے۔

چنانچہ جس یروشلم کا تذکرہ یہودیت کرتی ہے وہ دو یروشلم ہیں:
(۱) وہ تصوراتی یروشلم جو مستقبل کے مسیحی عہد میں یا تو زمین سے آسمان پر چلا جائے گا اور وہ اس طرح کہ یہودیوں کو یہاں سے لے جا کر اس آسمانی یروشلم میں بسادیا جائے گا یا آسمان پر بنا ہوا یروشلم زمین پر اتر آئے گا۔

(۲) دنیا کے بہت سے خطوں اور شہروں کی طرح فلسطین کا وہ شہر جسے کئی سالوں تک

یہودی بادشاہوں کی راجدھانی بننے کا موقع ملا اور جس کی قومی زندگی میں صرف تاریخی حیثیت ہے۔
یہ دونوں یروشلم تصوراتی اور نفسیاتی ہیں۔ ان میں پہلا:

(۱) روحانی، مسیحی، تصوراتی اور دوسرا

(۲) نفسیاتی، تاریخی، تصوراتی ہے۔

گوناگوں اعتبار سے یہی وہ تضاداتی کیفیت ہے جس کا اظہار مشہور اسرائیلی مصنف اموس ایلون (Amos Elon) نے اپنی کتاب (Jerusalem: City of Mirrors) میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

It is as if the very name Jerusalem (Hebr. Yerusalaim) is a reflection of the City's contradictory, even dualistic nature (aim is the Hebrew suffix indicating a dual or pair), manifesting itself even in its location on the boundary between Israel's cultivated grasslands and arid desert regions. There has always been a tension between the present and the future, the earthly and the heavenly, the real and the ideal Jerusalem a city of diverse peoples struggling to accomplish their daily activities and the city of religious visionaries.”^{۱۲}

ترجمہ: یہ ایسا ہے کہ اس شہر یروشلم (عبرانی: یروشلائم) کا نام ہی اس کے متضاد بلکہ دوہری فطرت کی عکاس ہے (ائم عبرانی میں ایک لاحقہ ہے جو دوہرے پن یا جوڑے کو ظاہر کرتا ہے) اور اس کا اظہار اس کے محل وقوع میں بھی ہوتا ہے اس لیے کہ یہ شہر (موجودہ) اسرائیل کے زیر کاشت لائے گھاس کے میدانوں اور خشک ریگستانی علاقے کی سرحد پر واقع ہے۔ یہاں ہمیشہ ایک کشاکش رہی حال اور مستقبل، زمینی اور آسمانی، حقیقی اور مثالی یروشلم کے مابین — متضاد قوموں کا یہ ایک ایسا شہر ہے جہاں وہ اپنے روزانہ کے کاموں کو انجام دیتے ہیں اور اسی طرح ایک ایسا شہر جو مذہبی مفکرین (کے تصورات کامرکز بھی ہے)

(ز) یہودیت کی طرح عیسائیت بھی یروشلم کے تعلق سے کچھ اسی طرح مگر کمتر درجے میں صورت حال سے دوچار ہے۔

(۱) ابتدائی عیسائیت دو یروشلم کی قائل رہی تھی جن میں ایک آسمانی تھا اور دوسرا زمینی

(ملاحظہ فرمائیں: گلیٹینز ۲۵:۴-۲۶ — عبرانی ۱۲:۲۲-۲۴)

چنانچہ رابرٹ و لکن (Robert Wilken) کے مطابق ابتدائی عیسائی عقائد میں مثلاً جسٹن مارٹر (Justin Martyr) اور ارینائس (Irenaeus) اس کے قائل تھے کہ مسیحی عہد میں وہ یروشلم زمین پر ہوگا۔ لیکن بعد کے کلیسائی آبا (Church Fathers) مثلاً اوریجن (Origen) نے اس کی سختی سے تردید کی اور کہا کہ کسی زمینی یروشلم کے قائم ہونے کا سوال نہیں بلکہ جس یروشلم کی آباد کاری کا ذکر ہے وہ آسمانی یروشلم ہے۔

اس تنقیح سے صرف یہ بات مقصود تھی کہ عیسائیت کا کوئی واضح تصور یروشلم نہیں یا جو تصور یروشلم پیشین گوئی میں پیش کیا گیا ہے اس کے حقیقی معنی آنکھوں سے او جھل ہو گئے اور عیسائیت جس طرح بہت سارے امور میں یہودیت سے متاثر ہوئی اسی طرح اس باب میں بھی اس میں یہودیت کے اثرات آ گئے۔

یہی وجہ ہے کہ عیسائی علماء کے مختلف طبقات اس تعلق سے الگ الگ خیالات رکھتے ہیں۔ والوورد (Walvoord) کا خیال ہے کہ نیا یروشلم ایک واقعی شہر ہوگا۔^{۱۳} لیڈ (Ladd) کا کہنا ہے کہ یروشلم حضرت عیسیٰ کی موت اور نشاۃ ثانیہ کے مابین انتقال ہونے والے بزرگوں کا آسمانی مسکن ہے جو حضرت مسیح کی آمد پر زمین پر قائم ہو جائے گا۔^{۱۴} لیلیے (Lilje) اسے ایک آفاقی کلیسیا کے مفہوم میں لیتا ہے۔^{۱۵} کڈل (Kiddle) کی تعبیر ہے کہ تمثیل کا قلب — انسانوں کا ایک مجموعہ ہے — یہ شہر ایک خاندان ہے۔ مکمل ملت کا نمونہ ہے — جس کا زمین پر حصول ناممکن ہے اس لیے کہ یہاں گناہوں کا اثر ہے جس نے پہلی تخلیق کو فاسد کیا ہے۔^{۱۶} ہنٹر (Hunter) کی تعبیر ہے کہ عیسائی امید کی تکمیل اعلیٰ ترین درجے میں معاشرتی ہے۔ یہ ایک کا ایک کی طرف فرار نہیں بلکہ آسمان میں ملت مغفور لہا کی زندگی ہے۔^{۱۷}

چنانچہ یوحنا نے اپنے مشہد میں جس نئے یروشلم کو دیکھا اس سے کیا مراد ہے؟ جو بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے وہ درج ذیل ہے:

- (۱) نیا یروشلم یقیناً مسیحی ہے، اس کا تعلق مستقبل سے ہے اور تصوراتی ہے۔
- (۲) نیا یروشلم سے مراد نہ یروشلم ہے نہ یروشلم کی تجدید بلکہ یہ خالصتاً تشبیہی اور تمثیلی ہے۔
- (۳) نئے آسمان اور نئی زمین سے جہاں مراد اسی زمین کا تمام آلائشوں اور خرابیوں سے

کلیتاً پاک ہو جانا ہے وہیں نئے یروشلیم سے مراد دین اللہ کا اس روئے زمین پر از سر نو قائم ہو جانا ہے اور اسی تناظر میں بیت اللہ کا حرم خالص ہو جانا۔

حصہ سوم: حادثہ، سازش اور المیہ

موجودہ عیسائیت تاریخ انسانی کی ایک غیر معمولی، عدیم المثال اور دردناک حادثہ کا نتیجہ ہے۔ اس غیر معمولی، عدیم المثال اور دردناک حادثے کی تفہیم کے لیے ایک تشبیہ دینی ضروری ہے۔ وہ تشبیہ درج ذیل ہے:

اگر قانونیت، فساد اور افراتفری کی صورت حال میں ایک قافلہ جو بچوں، بوڑھوں، عورتوں، معذوروں اور چند مردوں پر مشتمل تھا — جو ایک حادثے کے نتیجے میں اپنے قافلہ سالار سے بکھڑ گیا تھا اور اس بتائے ہوئے نقشے کے مطابق جو اس قافلہ سالار نے وہاں سے اس لیے بھیجا تھا جہاں وہ اس وقت مقیم ہے تاکہ قافلہ اس نقشے میں بتائے ہوئے راستوں پر چل کر اس سے آٹے — جارہا تھا کہ اچانک جنگل میں منظم رہزنوں نے حملہ کر کے ان کا سارا سامان لوٹ لیا جس میں وہ نقشہ بھی تھا اور انہیں بھی اذیت دے کر اس لقمہ و دق صحرا میں چھوڑ دیا۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ جو کچھ ان کی یادداشت میں قافلہ سالار کا نقشہ رہ گیا تھا اس کے سہارے اس جنگل سے نکل سکیں کہ رہزنوں کے اسی طائفے کے دوسرے جتھے نے انہیں گھیر لیا اور نہایت ہمدرد بنتے ہوئے اور معصومانہ لب و لہجہ میں گفتگو کرتے ہوئے انہیں غلط راستوں کی نشاندہی کی — لیکن معصومانہ طور پر بتائی جانے والی راہ دراصل وہ راہ تھی جو اس ملک کی جانب جاتی تھی جہاں پکڑے ہوئے غلاموں کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ ان رہزنوں کا ارادہ تھا کہ ان کو وہاں لے جا کر بیچ دیا جائے۔

یہ ہے وہ تمثیل جو اس غیر معمولی، عدیم المثال اور دردناک حادثے کی دی جاسکتی ہے۔ یہ قافلہ جو بچوں، بوڑھوں، عورتوں، معذوروں اور چند مردوں پر مشتمل ہے عیسائی ہیں۔ اور ان کے قافلہ سالار حضرت مسیح علیہ السلام ہیں۔ رہزن یہودیت ہے۔

اس دردناک حقیقت پر سب سے جامع تبصرہ قرآن نے فرمایا ہے۔ قرآن کے الفاظ ہیں:

ولا الضالین (الفتح)

ترجمہ: اور نہ (جو) بھٹکے ہوئے ہیں۔

یہاں بھٹکے ہوئے کے تین معانی لیے جاسکتے ہیں:

(۱) حالت فاعلی میں: وہ جو اپنے ارادے اور سہو سے بھٹک گئے۔

(۲) حالت عام: جن سے راہ گم ہو چکی ہے اور صحیح راہ کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں۔

(۳) حالت مفعولی: جو غلط راہ پر ڈال دیئے گئے ہیں۔ قرآن میں اس کی مثالیں ہیں کہ

حالت فاعلی کو حالت مفعولی پر محمول کرتے ہیں۔ مثلاً: لا عاصم الیوم من امر اللہ الامن رحم۔^{۱۸}

(۴) حالت لاعلمی: جنہیں معلوم نہیں کہ ہر جانا ہے۔

جہاں تک چوتھی حالت کا سوال ہے تو اس کا اطلاق عیسائیت پر نہیں ہوتا۔ عیسائیت کی گہرائیوں سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کے کم از کم مبشرہ حواریین پر پہلی صورت یعنی حالت فاعلی کا اطلاق نہیں ہوتا۔ یہی بات کسی درجے میں پوری عیسائی تاریخ میں عیسائی مخلصین کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔

اب رہی دوسری اور تیسری صورت حال کی بات تو ان دونوں صورت حال میں صرف زاویے کا فرق ہے کوئی جوہری فرق نہیں۔ اور قرآن کا اشارہ اسی جانب ہے۔ واللہ اعلم۔

عیسائی تاریخ میں ”راہ کا گم ہونا“ یا ”غلط راہ پر ڈال دیا جانا“ کوئی معمولی حادثہ نہیں بلکہ تاریخ انسانی کا ایک غیر معمولی واقعہ ہے، جس کا ہر باب دردناک ہے (اس پر تفصیلی بحث ان شاء اللہ عالم اسلام کی منصبی مقصدی صورت حال میں آئے گی)۔ اس دردناک واقعہ کی تفہیم کے لیے ایک اور تمثیل کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو ذیل میں دی جاتی ہے:

حضرت مسیح علیہ السلام کو صلیب دیئے جانے کے کچھ ہی عرصے بعد دین عیسیٰ ایک عدیم المثال بحرانی کیفیت سے دوچار کر دی گئی۔ وہ بحرانی کیفیت یہ تھی کہ پطرس کے دل کو پہچانے کی صرف ایک صورت رہ گئی تھی کہ پطرس کے مرتے ہی اسے کسی کے جسم میں آپریشن کر کے لگا دیا جائے۔ بحران کی ایک انتہا یہ تھی کہ اگر چند ثانیوں کے اندر اسے نہ لگایا جائے تو وہ دل ہمیشہ کے لیے مر جاتا۔ اور دوسری طرف بحران کی دوسری انتہا یہ تھی کہ اس چند ثانیے میں جس کا جسم میسر آسکا تاکہ پطرس کا وہ دل اس جسم میں لگایا جاسکے تو وہ جسم پال کا تھا۔ چونکہ اس دل کا پہچانا

ضروری تھا اس لیے پطرس کا دل پال کے جسم میں لگا دیا گیا۔“

سن ۶۲ عیسوی کے بعد عیسائیت ایک ایسا فرد ہو گئی جس کا جسم پال کا ہو اور دل پطرس کا۔ عیسائیت کے لیے دونوں طرف موت تھی۔ دل کو جسم سے یا جسم کو دل سے الگ کرنے کا انجام موت کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

دین عیسیٰ پطرس کا دل ہے۔ پال کا جسم یہودیت ہے جس نے عیسیٰ کو مصلوب کیا۔ عیسائیت کی یہی وہ دردناک مجبوری ہے جس کے خون سے اس کی تاریخ رنگین ہے۔

لیکن پطرس کا دل پال کے جسم میں مجبور، مقید اور بے بس ہونے کے باوجود زندہ رہا اور اس جسم سے نکلنے کی راہ ڈھونڈھتا رہا۔ ادھر پال کا جسم بھی بے خبر نہیں تھا اور اس نے ایک لمحے کے لیے بھی اس دل کو اپنے بندھنوں سے آزاد ہونے نہیں دیا یہی کشمکش عیسائیت کی تاریخ ہے۔ عیسائیت مجبور ہے کہ پطرس کے دل کو زندہ رکھنے کے لیے پال کے جسم کو غذا فراہم کرے اس لیے کہ پطرس کے دل کو زندہ رکھنے کی صرف ایک صورت ہے کہ پال کا جسم زندہ اور توانا رہے۔ عیسائیت یہ بھی جانتی ہے کہ پال کے جسم کا زندہ اور توانا ہونا پطرس کے دل کو مقید رکھنے کے زیادہ اہل ہو گا۔ لیکن مجبوری یہی ہے کہ خود پطرس کے دل کو زندہ رکھنے کے لیے پال کے جسم کا زندہ ہونا ضروری ہے۔

عیسائیت خوب جانتی ہے کہ پطرس کے دل کو پال کے جسم سے صرف ایک ہی ذات نجات دلا سکتی ہے اور وہ ذات خود حضرت مسیح علیہ السلام کی ہے۔ جو آنے والے ہیں۔ چنانچہ اس روز سعید کے انتظار میں عیسائیت پطرس و پال دونوں سے ہم آغوش ہے۔ لیکن یہ بات درست نہیں کہ پطرس کا دل اور پال کے جسم میں تصادم نہیں ہوتا۔ تصادم ہوتا ہے اور یہی وہ تصادم ہے جس نے عیسائیت کے اندر دو قسم کے سفروں کو جنم دیا ہے۔ یہ دو قسم کے اسفار عیسائیت میں ہرگز پائے نہیں جاتے اگر پال کی یہودیت کے جسم میں پطرس کے اسلام کا دل مرچکا ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ پطرس کے اسلام کا دل زندہ رہا اور متحرک رہا ہے جس نے دو قسم کے سفروں کا غیر منقطع سلسلہ شروع کیا۔ ان میں ایک سفر طبعی تھا اور دوسرا روحانی۔

طبعی سفر جسم کی بقا کے لیے تھا جس میں پطرس کے دل اور پال کے جسم کی طبعی ضرورتوں کو پورا کیا جاتا رہا ہے۔ دوسرا سفر پطرس کے دل کے اندر اسلام کا اصلی سفر ہے جس کی صرف

روحانی صورت ہی ممکن تھی۔

اس روحانی سفر کی زاد راہ رہی اللہ رب العزت، حضرت مسیح علیہ السلام اور حضرت مریم سے محبت۔ عیسائیت کی یہی وہ عدیم النظیر پونجی اور سرمایہ حیات ہے جس سے وہ اب تک زندہ ہے۔ اور اسی کے سہارے شاید کل وہ آزاد ہو پائیں۔ یہی سفر ہے جو کبھی (Passion) کے نام سے ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ اس روحانی سفر میں پطرس کے اسلام کا دل پال کی یہودیت کے جسم سے حضرت مسیح کی طرف سفر کر رہا ہے۔ یہی وہ سفر ہے جس پر چلنے کا عزم نوافل نے کیا تھا اور نجاشی نے کر دکھایا۔ اور بہت ممکن ہے کہ بہت سی سعید روحمیں عیسائیت میں ایسی ہوں گی جو یہ سفر آج بھی کر رہی ہوں۔ ممکن ہے ان میں وہ خوش قسمت بھی ہوں جن کی خوش بختی آسمان کی بلندیوں کو چھونے والی ہو اور وہ ان میں شامل ہوں جو حضرت عیسیٰ کا استقبال کریں۔

لیکن عام حالات میں ایسا لگتا ہے کہ عیسائیت کے جسم کی وہ ثنویت (Dualism) اس وقت تک برقرار رہے گی۔ جب تک کہ خود حضرت عیسیٰ ابن مریم علی نبینا الصلوٰۃ والسلام تشریف نہ لے آئیں اور خود اس کا فیصلہ نہ کر دیں۔ اس عاجز کو پورا یقین ہے کہ جو بے پناہ محبت اور جاں نثاری ہر عیسائی کے دل میں حضرت عیسیٰ ابن مریم علی نبینا الصلوٰۃ والسلام کے لیے پائی جاتی ہے اور جس طرح ان کے دل ان کی ایک جھلک دیکھنے کو بیتاب ہیں جب وہ تشریف لے آئیں گے تو ایک آن میں یہ سب اپنی موجودہ حالت سے ہجرت کر جائیں گے اور حضرت عیسیٰ کے قدموں میں ہوں گے اور ان کی بات ان کے سر آنکھوں پر ہوگی۔

یہی وہ بات ہے جس کی طرف وہ حدیث اشارہ کرتی ہے۔ جس میں کہا گیا ہے:

فیکسر الصلیب۔

آپ صلیب کو توڑ دیں گے۔

بلاشبہ کتنے خوش قسمت ہوں گے وہ لوگ جو حضرت عیسیٰ سے ملیں گے اور ان کا اتباع کریں گے لیکن ان سے بھی زیادہ خوش قسمت وہ لوگ ہیں جن کو ان کی آمد سے قبل ان کے استقبال کی نعمت نصیب ہو۔ طلقاء سے بہر حال ہجرت کرنے والے افضل ہوتے ہیں۔

عیسائیت کے اندرون میں اس کے جسم کے طبعی سفر کے علاوہ یہی وہ روحانی سفر ہے جو

دیگر مختلف راستوں سے ہوتا رہا ہے۔ عیسائیت میں پطرس کے دل کے اسلام کی یہی بے چینی تھی جو بظاہر لاعلمی میں کبھی اس راستے کی جانب کبھی اس راستے کی جانب بھٹک رہی تھی۔ یہ مسافر بظاہر بھٹک رہا تھا مگر باطن اس کے اندر اس کے راہ کے پانے کی تڑپ اور آرزو تھی جو راہ حضرت مسیح علی نبینا الصلوٰۃ والسلام تک جاتی ہے۔ اس لیے اس سفر میں ان سے غلطیاں بھی ہوئیں وہ ٹھوکر بھی کھائے، گرے بھی اور غلط راہوں میں دور تک بھی چلے گئے مگر ان سب کے باوجود ان میں پطرس کا دل دھڑکتا رہا۔ یہی وہ بات ہے جسے اپنے الفاظ میں بابائی مطالعات (Patristic Studies) کو ہمیز کرتے ہوئے پوپ پاؤل ششم نے کہی تھی:

"We particularly wish to emphasize at this turn the fact that return to the Fathers of the Church is, infact part of the return to Christian Sources....."

"To prove this convincingly, it is enough to recall the special function exercised by the Fathers in the Church. Witness of the faith of the early centuries, they hold a vital place in the Tradition that stems from the Apostles. 'The assertions of the Holy Fathers, as the Council points out, 'bear witness to the living presence of this Tradition whose richness is transfused into the life and Practice of the Church which believes and prays' (Const. Dei Verbum, no 8.) It is therefore easy to understand how necessary is the study of the Fathers for a more profound understanding of Holy Scripture, and how decisive for the Church is their agreement upon its interpretation. The Encyclical *Divino Afflante Spirite* recalls that even though the Fathers were 'sometimes less well-informed in profane science and linguistic studies than the interpreters of our day, nevertheless, on account of the duty in the Church which God had committed to them, they excel in the calm penetration of heavenly things and in a sharpness of thought which deeply probes the

depth of the divine words.

"They further possessed a richly abundant treasure of the Christian spirit derived from their personal holiness, in their school of Faith they were not content simply with intellectual elucidation but were also intent upon the mystical sense. As the great Bossuet pointed out, their works 'produce wonderful fruit in anyone who studies them, because when all is taken into account, these great men are nourished with the true food of the elect, with the pure essence of religion, and since they are, so to speak, saturated with the primitive spirit which they have more directly and more abundantly drawn from the same source, it not frequently happens that what springs in all its natural freshness from their plenitude is more nourishing than what comes later after mature thought and reflection' -- (*Defense de la Tradition/et des Saints Peres, I partie, L. IV. C. XVIII*)

"For these reasons, it cannot be doubted that more profound and systematic Patristic Studies can afford an immeasurable help to theological renewal in this Post-Conciliar period.....

(Rome, May 4, 1970) ^{۱۹}

ترجمہ: ہم لوگ، بطور خاص اس موقع پر اس حقیقت پر زور دینا چاہتے ہیں کہ کلیسیا کے آبا کی طرف واپسی دراصل عیسائی منابع کی طرف واپسی ہے۔

یقین ہو جانے کی حد تک اسے ثابت کر دینے کے لیے یہ یاد دلانا کافی ہو گا کہ کلیسیائی آبا نے کیا خدمات انجام دیئے۔ ابتدائی صدیوں میں ایمان کی شہادت دینا ان کی وہ خدمت ہے جس کے تسلسل کارروایت کے اعتبار سے بنیادی مقام ہے اس لیے کہ وہی اس روایت کو مرسلین (Apostles) سے مربوط کرتے ہیں۔ ان مقدس آبا کی حیثیت کا اعتراف کرتے ہوئے کونسل نے اس طرح بیان کیا ہے: مقدس آبا کی کوششیں روایت کی زندہ موجودگی کی شہادت ہیں جن کی حقیقتیں کلیسیائی زندگی اور عمل کی صورت میں ڈھل سکیں جو ایمان اور عبادت کی علامت ہے۔ (Const: Dei

Verbum, No.8)۔ اس لیے یہ اندازہ کرنا نہایت آسان ہے کہ آبا کا مطالعہ مقدس صحائف کے درک کے لیے کتنا ضروری ہے اور کلیسیا کے لیے ان کا اتفاق و اجماع ان کی تعبیر کے لیے کتنا فیصلہ کن ہے۔ ہدایت نامہ Divino Afflante Spirite میں اسی حقیقت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے: ہر چند کہ آبا غیر دینی علوم اور لسانیات کے معاملے میں بعض اوقات عہد حاضر کے مفسرین کے مقابلے میں نسبتاً کم واقفیت رکھتے تھے لیکن اس فرض منصبی کی وجہ سے جو خدا نے کلیسیا کے تعلق سے ان پر عاید کیا تھا وہ خاموشی سے آفاق و انفس کی گہرائیوں میں اتر جانے کے زیادہ اہل تھے اور ان کا تخیل زیادہ تیز تھا جو ربانی الفاظ کی گہرائیوں کو پالیتا تھا۔

مزید ازیں وہ اپنے ذاتی تقدس کے سبب عیسائی روحانیت کے خزانے کے وافر حصے سے فیض یاب تھے۔ اپنے عقاید میں وہ محض عقلی ترفع کے حامل نہ تھے بلکہ انہیں روحانی مذاق بھی حاصل تھا۔ عظیم بوسے (Bousuet) نے اسی لیے لکھا ہے کہ ان (آبا) کی تصنیفات اپنے قارئین کے اندر حیرتاک بار آوری کرتی ہیں۔ چنانچہ جب تمام چیزوں کا احاطہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اکابر اس 'منتخب' کی روحانی غذا کے اصل پروردہ تھے۔ انہیں دین کا مغز مل گیا تھا اگر ایسا کہا جائے کہ یہ حضرات چونکہ اصلی روح سے سیر ہو چکے تھے جسے انہوں نے وافر مقدار میں اور بلا واسطہ اصل منبع سے حاصل کیا تھا۔ کوئی وجہ نہیں کہ اس ذریعہ سے قدرتی طور پر زیادہ تازہ چیز حاصل نہ ہو بمقابلہ اس ذریعہ کے جو ہر چند کہ زیادہ بالیدہ فکر اور تدبیر کا نتیجہ ہے لیکن بہر حال بعد میں نمودیر ہوا ہے۔ (Defense de la Tradition et des Saints) (Peres, 1 Partie)۔

ان اسباب سے، اس میں شک نہیں کیا جاسکتا ہے کہ مزید آبائی مطالعات ما بعد کینسلیر عہد میں دینیات کی تجدید کے لیے بے حد حساب مدد کا باعث ہوگا۔
(روم مئی ۱۹۷۰ء)

یہودیت حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت اول سے کبھی بھی غافل نہیں رہی۔ وہ ہمہ دم مصروف رہی کہ حضرت مسیح، ان کی دعوت اور ان کے پیغام کو صفحہ ہستی سے مٹا دے۔ اپنی سمجھ کے مطابق یہودی حضرت مسیح علیہ السلام کو صلیب دینے کے بعد بھی خاموشی اور بے خبر نہیں رہے۔ انہوں نے طرح طرح سے کوششیں کیں کہ حضرت عیسیٰ کا ہر پیغام اور اس کے معتبر حاملین صفحہ ہستی سے مٹ جائیں۔ کبھی انہوں نے ان کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر ان میں

گمراہیاں پیدا کیں کبھی عام انسانی فطرت کے مطابق پیدا ہونے والے جھگڑوں یا اختلافات یا غلط فہمیوں کو جو کسی بھی انسانی اجتماعیت کا خاصہ ہیں ہو اوے کر رائی کا پہاڑ بنا دیا تاکہ عیسائیت کی رہی سہی قوت آپسی مناقشوں کی نذر ہو کر تباہ ہو جائے۔ یہی وہ عمل ہے جسے عیسائیت کی تاریخ تفریق (Schism) کے نام سے جانتی ہے۔^۱

چنانچہ یہ ایک سلسلہ ہے جو پہلی صدی عیسوی سے مسلسل جاری ہے۔ لیکن اس میں سب سے بڑا زلزلہ اس وقت آیا جب ۱۰۵۴ء میں روم اور قسطنطنیہ کے اکابر نے ایک دوسرے کو عیسائیت سے خارج کر دیا۔ ۱۹۶۵ء میں پوپ پال ششم (Pope Paul VI) اور بطریق اتھے ناگورس (Patriarch Athanagoras) نے باہمی اخراج کے ان فتاویٰ یا تکفیری فتاویٰ (Anathemas) کو رد کر دیا۔ ۱۰۵۴ء کا یہ عمل اپنے اندرون میں یہودیت کی حضرت عیسیٰ کی تلاش میں سرگرداں اس قافلے پر ضرب تھا تو ۱۹۶۵ء کا عمل بطرس کے اسلام کا جواب تھا پال کو۔ لیکن ۱۰۵۴ء کے ضرب سے یہودیت مطمئن نہیں تھی۔ چنانچہ یہودیت نے حضرت عیسیٰ کے اس بھٹکتے ہوئے قافلے پر اب تک کی سب سے بڑی اور سب سے کاری ضرب لگائی۔ یہی وہ کاری ضرب ہے جسے عیسائیت کی تاریخ مخالف اصلاح تفریق (Counter Reformation) (Schism) کہتی ہے۔ جس کا آغاز سیکولر تاریخ میں نشاۃ ثانیہ (The Renaissance) کہلاتا ہے۔ یہ ایک خالص یہودی سازش تھی۔^۲ بظاہر بہت سارے معقول نکات کے باوجود یہ تحریک یہودیت کی ایک گہری اور پیچیدہ سازش تھی جو رومن کیتھولک چرچ کے خلاف بالخصوص اور پوری عیسائیت کے خلاف بالعموم کی گئی تھی۔ اس نے دو نتائج پیدا کیے:

(۱) پورا آر تھوڈوکس چرچ بالعموم اور رومن کیتھولک چرچ بالخصوص اپنی جڑ سے ہل گیا۔ اور پوری عیسائی دنیا بنیادی طور پر تین بڑے حصوں میں منقسم ہو گئی اور ان میں کا ایک طبقہ پوری طرح یہودیت کی گود میں چلا گیا۔

(۲) یہودیت کی گود میں جانے والے طبقہ پروٹسٹنٹ کہلایا۔ جو بظاہر قائم چرچ کے خلاف صدائے احتجاج کی شکل میں سامنے آیا۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ یہ ایک یہودی سازش تھی۔ جس نے احتجاج کا طریقہ اختیار کیا۔ یہودیت نے فی الواقع ”احتجاج“ کا ایک ایسا جرثومہ پیدا کیا جو وقت گزرنے کے ساتھ بڑھتا ہی رہا۔ چنانچہ اس کے درج ذیل نتائج برآمد ہوئے:

(۱) یہ جرثومہ احتجاج وہ تھا جس میں خلقی طور پر یہ صفت تھی کہ وہ قائم اور موجود — صورت اور کیفیت کو رد کرتا تھا اور اس کے خلاف قوی اور عملی احتجاج کرتا تھا اور اس سے الگ ہو جاتا تھا۔

(۲) کسی قائم اور موجود صورت، کیفیت، عقیدہ، ادارہ، تنظیم، ثقافت اور نظریہ کے خلاف قوی اور عملی احتجاج کر کے اور اس سے الگ ہو جانے کے بعد وہ خود جو صورت، کیفیت، عقیدہ، ادارہ، تنظیم، ثقافت اور نظریہ قائم کرتا تھا وجود پانے کے بعد چونکہ وہ قائم اور موجود کے درجے میں آچکے ہوتے تھے لہذا اس کے اندر کا جرثومہ اس کے خلاف پھر قوی اور عملی احتجاج کرتا تھا۔

(۳) چنانچہ یہ ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ بن گیا جو یہودیت نے حضرت عیسیٰ کے قافلے میں شروع کروایا۔ وہ پروٹسٹنٹ جو سولہویں صدی میں احتجاج کرنے ہوئے رومن کیتھولک چرچ سے الگ ہو گئے تھے اب تک خود احتجاج در احتجاج کے طور پر کم از کم ۵۰۰ طبقوں میں منقسم ہو چکے ہیں۔

(۴) یہ سارے پروٹسٹنٹ بڑی عجیب کیفیت کے حامل ہیں۔ پروٹسٹنٹ کے بارے میں اس بات پر کلی اتفاق ہے کہ عقیدہ سے لے کر ثقافت تک کسی بھی بات پر جو موجود اور قائم ہو جائے تو ان کا اس پر اتفاق نہیں رہتا۔ تاہم صرف اور صرف ایک بات ایسی ہے جو ان کے ہر گروہ میں ہمیشہ سے مشترک، چلی آتی ہے اور وہ ہے یہودیت، اس کے صحائف، اس کے عزائم، اس کے رسوم اس کے جذبات سے قربت اور اس کی قدردانی۔

”احتجاج“ کے، اس جرثومے کا ادخال حضرت مسیح کے بھٹکے ہوئے قافلے پر یہودیت کی کاری ترین ضرب تھی۔ جس نے بلاشبہ عیسائیت کے جوڑ جوڑ کو ڈھیلا کر دیا۔ لیکن دوسری طرف دوسرے ویٹیکن کونسل (Second Vatican Council) نے اپنے دو فیصلوں کے ذریعہ یہودیت کو جواب دیا ہے۔ یہ جواب دراصل پطرس کے دل کا جواب ہے۔ یہ دو فتاوے ہیں:

(۱) Vatican II, Lumen Gentium, 21 November 1964

"Dogmatic Constitution on the Church"

اس فتویٰ کی دفعہ ۸ کا آغاز یوں ہوتا ہے:

The one mediator, Christ, established and ever sustains here on earth his holy Church, the

community of faith, hope and charity, as visible organization through which he communicated truth and grace to all men. But the society structured with hierarchical organs and the mystical body of Christ, the visible society and the spiritual community, the earthly Church and the Church endowed with heavenly riches, are not to be thought of as two realities.....

ترجمہ

واحد شفاعت کرنے والے — مسیح — نے اس روئے ارض پر اپنی کلیسیا، اہل ایمان کے گروہ، امید اور صدقہ کو قائم فرمایا اور اس کی برقراری کی ہمیشہ کوشش کی تاکہ وہ ایک سرکاری ادارے کی طرح باقی رہیں جس کے ذریعہ اس نے حق اور رحم کو انسانوں تک پہنچایا۔ لیکن مذہبی اعضاء پر مشتمل معاشرہ اور مسیح کا روحانی جسم — یعنی سرکاری معاشرہ اور روحانی برادری زمینی کلیسا اور اصلی کلیسیا کو جس پر آسمانی برکات کا نزول ہے دو الگ حقائق کے اعتبار سے نہیں لیا جاسکتا۔
یہ فتویٰ اس طرح اختتام کو پہنچتا ہے:

"The Church, "like a stranger in a foreign land, presses forward amid the persecutions of the world and the consolations of God," announcing the cross and death of the Lord until he comes (Cf. 1. Cor 11:26) ۲۲

ترجمہ: کلیسیا — کسی اجنبی ملک میں اجنبی کی طرح — دنیا کے مظالم اور خدا کی تسلیوں کے مابین جب تک اس کی آمد ہو آقا کے صلیب اور موت کے اعلان پر زور دیتا ہے۔

اور دوسرا فتویٰ ہے:

(2) Vatican II, Unitatis Redintegratio, 21 November 1964. "Decree of ecumenism"

اس فتویٰ کی دفعہ ۳ کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

"In this one and only Church of God from its very beginnings there arose certain rifts, which the Apostle strongly censures as damnable. But in

subsequent centuries much more serious dissensions appeared and large communities become separated from full communion with the Catholic Church -- for which, often enough, men of both sides were to blame.

ترجمہ: اپنی ابتداء سے خدا کی اس ایک اور واحد کلیسیا میں بعض تفریق پیدا ہوئیں جسے مرسلین نے شدت سے قابل مذمت قرار دیا۔ لیکن بعد کی صدیوں میں مزید سنسکین اختلافات ظاہر ہوئے اور کیتھولک کلیسا کی اجتماعیت سے بڑے بڑے گروہ الگ ہو گئے جس کے لیے اکثر دونوں طرف کے لوگ ذمہ دار تھے۔

یہ دفعہ ان الفاظ پر اختتام کو پہنچتی ہے:

"It was to the apostolic college alone of which Peter is the head, that we believe that our Lord entrusted all the blessings of the New Covenant, in order to establish on earth the one Body of Christ into which all those should be fully incorporated who belong in any way to the people of God. During its pilgrimage on earth, this people, though still its members liable to sin, is growing in Christ and is guided by God's gentle wisdom, according to his hidden designs, until it shall happily arrive at the fullness of eternal glory in the heavenly Jerusalem." ۲۳

ترجمہ: یہ صرف وہ دائرہ مرسلین ہے جس کے قائد پطرس ہیں — جو — ہمارا عقیدہ ہے کہ — ہمارے آقا (حضرت عیسیٰ) کے ذریعہ اس کا مجاز بنایا گیا ہے اور جسے نئے میثاق کے برکات دیئے گئے ہیں تاکہ وہ روئے ارض پر مسیح کا وہ واحد جسم میں قائم کرے جس میں وہ تمام لوگ پوری طرح شامل کیے جاسکیں جو کسی بھی اعتبار سے خدا کے لوگ ہیں۔ روئے ارض پر اس سفر کے دوران یہ لوگ جو اگرچہ گناہ گار ہو سکتے ہیں — مسیح میں افزائش پا رہے ہیں یہ خدا کے مہربان حکمتوں سے ہدایت یاب ہیں جو اس کے پوشیدہ منصوبے کے عین مطابق ہے۔ یہ صورت اس وقت تک برقرار رہے گی جب تک وہ وقت نہ آجائے جب لافانی عظمت آسمانی یروشلیم کی صورت میں اپنے نقطہ کمال کو پہنچ جائے۔

یہودیت کے حملے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بھٹکے ہوئے قافلے پر جاری ہیں اور پطرس کا دل مقید ہو کر بھی اس کا مقابلہ کر رہا ہے۔ چنانچہ مارچ ۲۰۰۰ کی آخری تاریخوں میں ایک ایسا ہی حملہ — یہودیت نے اس وقت کیا جب موجودہ پوپ جان پال II فلسطین کے دورے پر تھے۔ انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ ۶۰ لاکھ یہودیوں کے نام نہاد قتل کی یاد میں بنائی گئی یاد گارید و شیم (Yad wa Shem) کی زیارت کریں اور پوری تاریخ میں عیسائیوں نے یہودیوں کو جو مبینہ طور پر ستایا ہے اس پر پورن عیسائی قوم کی طرف سے معافی مانگیں۔ بوڑھا، کمزور، جھکی کمر اور لڑکھڑاتا ہوا پطرس کی لاشی کا حامل چرواہا — پوپ جان پال II نے اپنی روایتی اندرونی مضبوطی کا ثبوت دیتے ہوئے اس نازک وقت میں بھی اپنے موقف پر جمار ہا جب چاروں طرف سے یہودی زعماء سے نوح کھانے کو تیار تھے۔ اس نے نہایت صبر و سکون سے ہر پہنچنے والے دکھ پر افسوس کیا اور صرف اتنا کہا:

”یہودی ممل یثاق ہیں“

Jews are the people of Covenant."

یہ تھا پطرس کا جواب یہودیت کو۔

حضرت مسیح علی نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قوم کی تاریخ کی حقیقت کیا ہے؟

اس قوم کی تاریخ اور اس کی سب سے بڑی حقیقت ہے:

وہ غیر منقطع اور مسلسل سفر جو ایک حادثے کے بعد — عیسائیت — یہودیت سے دین مسیح علیہ السلام کی طرف کر رہی ہے۔ عیسائیت اپنی لٹی ہوئی پونجی کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ یہی وہ سفر ہے جو انشاء اللہ اس دن ختم ہو جائے گا جب جلالت مآب حضرت عیسیٰ ابن مریم مسیح علی نبینا الصلوٰۃ والسلام خود تشریف لے آئیں گے اور اپنی بھیڑوں کو جسے یہودیت دو ہزار سالوں سے ساری دنیا میں ہانکتی پھر رہی ہے جمع فرمائیں گے اور ان کے چہروں کے گرد و غبار پونچھ ڈالیں گے یہی وہ تاریخی سفر ہے اور اسی پر حضرت مسیح اور اللہ تعالیٰ کا وہ مکالمہ شاہد ہے جسے قرآن نے یوں درج کیا ہے:

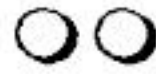
”اللہ فرمائے گا کہ اے عیسیٰ ابن مریم، کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے

سوا مجھے اور میری ماں کو بھی خدا بنا لو؟ تو وہ جواب دیں گے کہ ”سبحان اللہ، میرا یہ کام نہ

تھا کہ وہ بات کہتا جس کے کہنے کا مجھے حق نہ تھا، اگر میں نے ایسی بات کہی ہوتی تو آپ کو

ضرور علم ہوتا، آپ جانتے ہیں جو کچھ میرے دل میں ہے اور میں نہیں جانتا جو کچھ آپ کے دل میں ہے۔ آپ تو ساری پوشیدہ حقیقتوں کے عالم ہیں۔ میں نے ان سے اس کے سوا کچھ نہیں کہا جس کا آپ نے حکم دیا تھا، یہ کہ اللہ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ میں اسی وقت تک ان کا گمراہ تھا جب تک کہ میں ان کے درمیان تھا۔ جب آپ نے مجھے واپس بلا لیا تو آپ ان پر گمراہ تھے۔ اور آپ تو ساری ہی چیزوں پر گمراہ ہیں۔ اب اگر آپ انہیں سزا دیں تو وہ آپ کے بندے ہیں اور اگر معاف کر دیں تو آپ غالب اور دانا ہیں۔ تب اللہ فرمائے گا ”یہ وہ دن ہے جس میں بچوں کو ان کی سچائی نفع دیتی ہے، ان کے لیے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں یہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اللہ ان سے راضی ہو اور وہ اللہ سے یہی بڑی کامیابی ہے۔“

(المائدہ: ۱۱۶-۱۱۹)



حقیقت و جال

”عالم اسلام کی منصبی و مقصدی صورت حال — محور اول: کتاب اول: ماکان و مایکون“

میں میں نے لکھا تھا:

”معرکہ خیر و شر کا واقعی (Virtual) خاتمہ دراصل ابلیس کے اعتراض کا واقعہ (Virtually) رفع ہوتا ہے۔ لیکن وصال آنحضور ﷺ سے قیامت تک کی مدت دراصل معرکہ خیر و شر کے اصلی (Actual) خاتمہ کی مدت ہے۔ قیامت کا برپا ہونا دراصل ابلیس کے اعتراض کے رفع ہونے اور اس کی شکست کا اعلان ہے۔ اللہ تعالیٰ اس وقت تک قیامت برپا نہیں کر سکتا جب تک ابلیس اصلاً (Actually) اپنے اعتراض میں غلط ثابت نہ ہو جائے۔

چنانچہ آنحضور ﷺ کی وفات ہی دراصل اقامت قیامت کا اعلان اور اس کی پہلی اور سب سے بڑی علامت تھی۔ یہی وفات واقعہ (Virtually) ظہور دجال کی شروعات ہے۔ دجال ابلیس کا وہ آخری اور خوفناک ترین حربہ ہے جسے وہ مذکور و وجہوں سے حاصل کر سکا ہے۔ دجال ابلیس کی وہ تخلیق ہے جسے اس نے مقبوض علم کلا سماء اور مخطف علم الوحی سے تیار کیا ہے۔ اس سے بڑا ابلیس کے پاس کوئی حربہ نہیں۔ دجال ابلیس کے ترکش کا آخری تیر ہے۔ لیکن وہ ہار چکا ہے۔ اللہ نے اپنے نبی آخر الزماں ﷺ کی بعثت فرمادی ہے اور اس نبی آخری الزماں ﷺ نے اقامت دین کا کام انجام دے دیا لیکن ابلیس دجال کو ان کے خلاف استعمال کر کے انہیں روک نہیں سکا۔ جس آدم کو حیات الحیۃ میں ابلیس نے علم الاسماء کا سہارا لے کر گمراہ کر دیا تھا اور اسے اپنے فرض منصبی کی ادائیگی سے روک دیا تھا اسی آدم کو جس کی ذریت میں اب نوح، ابراہیم، اسمعیل، اسحاق، موسیٰ، عیسیٰ اور محمد علیہم السلام ہوئے حیات ارضی میں نہ گمراہ کر سکا نہ روک سکا۔ ابلیس اس قدر حواس باختہ ہو گیا کہ اسے اپنے آخری اور خوفناک ترین حربہ دجال کے استعمال کی ہمت تک نہ ہو سکی۔ اس طرح اس نے واقعہ (Virtually) شکست تسلیم کر لی لیکن اللہ تعالیٰ اس پر اپنی حجت پوری کرے گا۔ لہذا اس کا واقعہ

(Virtually) شکست تسلیم کرنا کافی نہیں سمجھا گیا۔ اللہ تعالیٰ اسے اصلاً (Actually) شکست سے دوچار کر کے اس کے اعتراض کو اصلاً (Actually) رفع کرے گا۔

آنحضور ﷺ کی وفات حسرت آیات سے آج تک زمین پر معرکہ خیر و شر دراصل واقعیت (Virtuality) سے اصلیت (Actuality) کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس سفر میں مشیت الہی ابلیس کو واقعیت (Virtuality) سے اصلیت (Actuality) کی طرف دھکیل رہی ہے۔ مشیت الہی ابلیس کو مجبور کر رہی ہے کہ وہ اپنے آخری تیر و جال کو اصلاً (Actually) ظاہر کرے تاکہ اس پر حجت پوری ہونے میں کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ کسر باقی نہ رہ جائے جس کا وہ سہارا لے کر اپنا دعویٰ پیش کر سکے۔

اکیسویں صدی عیسوی ظہور و جال کی صدی معلوم ہوتی ہے۔ یہی معرکہ و جال کی بھی صدی معلوم ہوتی ہے۔ یہ معرکہ و جال معرکہ علم ہے۔ و جال علم و اسماء مقبوض و علم الوحی خطف سے بنایا گیا ایک غیر معمولی حربہ ہے۔ یہ معرکہ صحیح و صالح علم و اسماء اور صحیح و خالص علم الوحی اور مقبوض علم و اسماء اور خطف علم الوحی کے مابین ہے۔“ ۱

تین حقائق

قیامت سے قبل اس آخری اور سب سے ہولناک معرکہ، اس کی وسعت اور اس کی حقیقت کے سمجھنے کے لیے چند دیگر حقائق کا پیش نظر رہنا ضروری ہے۔ ہر چند کہ ان میں سے ہر ایک عنوان الگ الگ تفصیل سے بیان کیے جانے کا متقاضی ہے جس کی اس وقت کے نازک حالات میں گنجائش نہیں لہذا یہاں ہم صرف ضروری پہلوؤں سے ہی تعارض کریں گے۔ مذکورہ حقائق جن کا پیش نظر رہنا ضروری ہے وہ درج ذیل ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ اور اس کے ذریعہ خلق کردہ کائنات امر اور کائنات خلق

(۲) ابلیس، الشیطان و غیر ہم اور ان کی حقیقت اور

(۳) معرکہ خیر و شر

حقیقت اول

اللہ تعالیٰ اور اس کی کائنات

’ماکان وما یكون‘ میں صفحہ ۱۳۶ تا ۱۴۰ میں مذکور چار عوالم کی بحث کو ہم ایک دوسرے زاویے سے پیش کرتے ہیں۔ یہ زاویہ ہے کائنات کی حقیقت اس کے خالق کے اسماء کے اعتبار سے۔ اس اعتبار سے کائنات چار درج پر منقسم ہے۔

(۱) پہلا درج: کائنات کا پہلا درج عالم اصل ہے۔ اس عاجز نے کائنات کے پہلے درج کو عالم اصل لکھا ہے لیکن اسے نہیں معلوم یہ پہلا درج ’عالم‘ ہے یا نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ اس عاجز نے یہاں اصل کے ساتھ عالم صرف اس لیے لکھا ہے کہ اس کے بعد بیان کیے جانے والے تین عوالم سے اسے ایک صوتی مناسبت ہو جائے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ ’اس‘ کو جسے یہاں ’عالم‘ کہا گیا ہے اصل کہنا بھی چاہئے یا نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں میرے علم کی حد تک اس لفظ کا استعمال نہیں کیا ہے۔ لیکن یہ وہی ’عالم‘ ہے جو غالباً اس آیت میں ’عند‘ سے پرے مذکور ہے۔

فی مقعد صدق عند ملیک مقتدر (القمر: ۵۵)

ترجمہ: سچی بیٹھک میں نزدیک مقتدر بادشاہ کے۔

سچی بیٹھک کے قریب جو ”عالم“ ہے وہی ”عالم اصل“ ہے۔ یہ وہ عالم اصل ہے جہاں صرف اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ ہیں۔ اور ان میں بطور خاص درج ذیل کا ظہور تام سمجھ میں آتا ہے۔ ”سمجھ میں آتا ہے“ کا مفہوم یہ ہے کہ عالم خلق کے کسی فرد کی سمجھ میں آتا ہے ورنہ وہاں تو اللہ تعالیٰ کے کل اسماء حسنیٰ کا ظہور تام ہے۔ یہ اسماء ہیں:

(۱) هو :

یہ وہی ’هو‘ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

(۱) هو الله الذی لا اله الا (هو) (الحشر: ۲۲)

ترجمہ: وہ اللہ جس کے سوا کوئی الہ نہیں مگر وہ

(۲) (هو) الرحمن الرحيم (الحشر: ۲۲)

ترجمہ: وہ الرحمن الرحيم

(۳) الله لا اله الا (هو) (البقرہ: ۲۵۵)

ترجمہ: اللہ، نہیں ہے الہ مگر وہ

(۴) الم! الله لا اله الا (هو) الحي القيوم (آل عمران: ۱-۲)

ترجمہ: الم! اللہ، نہیں ہے الہ مگر وہ الحي القيوم

(۲) اللہ :

یہ وہی 'اللہ' ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

(۱) (الله) لا اله الا هو (البقرہ: ۲۵۵)

ترجمہ: اللہ نہیں ہے الہ مگر وہ

اسی طرح دیگر مقامات پر مثلاً سورہ اخلاص آیت: ۱، اور الحشر: ۲۲ میں مذکور ہے۔

(۳) الحي :

یہ وہی 'الحي' ہے جسے اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا ہے:

(۱) الله لا اله الا هو الحي القيوم (البقرہ: ۲۵۵)

ترجمہ: اللہ، نہیں ہے الہ مگر وہ الحي القيوم

(۲) الم! الله لا اله الا هو الحي القيوم (آل عمران: ۱-۲)

ترجمہ: الم! اللہ نہیں ہے الہ مگر وہ الحي القيوم

اس کے علاوہ سورہ غافر، الفرقان، طہ، میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔

(۴) القيوم :

یہ وہی 'القيوم' ہے جسے اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا ہے:

(۱) هو الحي القيوم (البقرہ: ۲۵۵)

ترجمہ: وہ الحي القيوم

(۲) هو الحي القيوم (آل عمران: ۲)

ترجمہ: وہ الحی القيوم

(۲۰) وعنت الوجوه للحی القيوم (طہ: ۱۱۱)

ترجمہ: (کائنات کی تمام اشیاء کی حقیقت کے) چہرے متوجہ ہیں صرف اسی الحی

القيوم کی جانب۔

(۵) هو اللہ :

یہ وہی 'هو اللہ' ہے جس کا ذکر قرآن میں یوں آیا ہے:

(۱) (هو الله) الذي لا اله الا هو (الحشر: ۲۲)

ترجمہ: وہ اللہ جو کہ نہیں ہے الہ مگر وہ

(۲) (هو الله) (الحشر: ۲۳)

ترجمہ: وہ اللہ

(۳) (هو الله) الخالق (الحشر: ۲۴)

ترجمہ: وہ اللہ الخالق

(۶) اللہ الصمد :

اللہ تبارک و تعالیٰ کا یہ وہ اسم مبارک ہے جو قرآن میں صرف ایک بار مذکور ہوا ہے:

(۱) الله الصمد (الاخلاص: ۲)

ترجمہ: اللہ بے نیاز ہے۔

(۷) مالک الملک :

اللہ تبارک و تعالیٰ کا یہ بھی وہ اسم مبارک ہے جو قرآن میں صرف ایک بار مذکور ہوا ہے:

(۱) قل اللهم مالك الملك (آل عمران: ۲۶)

ترجمہ: آپ کہہ دیجئے اے اللہ مالک ساری سلطنت کا۔

(۸) الملك القدوس السلام المؤمن المهيمن العزيز الجبار المتكبر۔

اللہ تبارک و تعالیٰ کی جلالت کے اظہار کے لیے یہ وہ اسماء حسنیٰ کا مجموعہ ہے جو

بیک وقت کئی اسماء کا مجموعہ بھی ہے اور تمام اسماء سے مل کر بنا ایک نام بھی ہے جو حضرت باری

تعالیٰ کے شایان شان ہے۔ یہ اسم مبارک بھی قرآن میں صرف ایک بار بیان کیا گیا ہے۔

(۱) الملك القدوس السلم المؤمن المهيمن العزيز الجبار المتكبر

(الحشر: ۲۳)

ترجمہ: بادشاہ، پاک ذات سب عیبوں سے، سالم، امان دینے والا، پناہ میں لینے والا، زبردست، دباؤ والا، صاحب عظمت

غور طلب بات یہ ہے کہ جہاں اسماء حسنیٰ کا یہ مجموعہ قرآن میں صرف ایک بار آیا ہے، وہیں اس کے اندر بعض اسماء بھی صرف ایک ہی بار اور اسی آیت میں مذکور ہوئے ہیں مثلاً: الجبار، المؤمن، المہیمن، المتکبر، اور السلام۔

(۲) دوسرا درج: کائنات کا دوسرا درج عالم بریہ ہے۔ بالفاظ دیگر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ عالم خلق کا پہلا موجودہ درج عالم بریہ ہے۔ یہ عالم بریہ عالم اصل سے نیچے ہے۔ اور عالم اصل سے اس کا ظہور ہوا ہے۔ اسی عالم سے خلق کا باضابطہ آغاز ہوا ہے۔ چنانچہ یہاں اللہ تعالیٰ کے جس اسم مبارک کی شان کا ظہور ہوا وہ الخالق الباری ہے۔ جس کا ذکر قرآن نے اس طرح فرمایا ہے:

هو الله الخالق الباری (الحشر: ۲۴)

ترجمہ: وہ اللہ! الخالق الباری

یہی درج الکرسی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وسع كرسیه السموات والأرض (البقرہ: ۲۵۵)

ترجمہ: گنجائش ہے اس کی کرسی میں تمام آسمانوں اور زمین کو

سعادت اور شقاوت کے اعتبار سے یہی درج آخری فیصلہ کن درج ہے۔ چنانچہ اسی درج پر ہونے والا فیصلہ آخری فیصلہ ہے جو بالآخر دائمی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

ان الذين كفروا من اهل الكتاب والمشرکین فی نار

جہنم خلدين فيها اولئك هم شر البرية. ان الذين آمنوا وعملوا

الصلحت اولئك هم خير البرية. (المیة: ۶-۷)

ترجمہ: اور جو منکر ہوئے اہل کتاب اور مشرک ہوں گے دوزخ کی آگ میں

سدا رہیں اس میں وہ لوگ ہیں البریہ کے برے۔ وہ لوگ جو یقین لائے اور کئے بھلے کام

وہ لوگ ہیں البریہ کے اچھے۔

یہی وہ درج ہے جہاں تک ارتقاء نفس کو نفس مطمئنہ میں بدل دیتا ہے۔ جس کا ذکر قرآن

نے اس طرح کیا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمَطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكَ رَاضِيَةً مَُّرْضِيَةً.

فادخلی فی عبدی۔ وادخلی جنتی (البقرہ: ۲۷-۳۰)

ترجمہ: اے مطمئن جی! لوٹ آپنے رب کے پاس۔ تو اس سے راضی وہ تجھ

سے راضی، اور داخل ہو جا میرے بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں۔

یہی وہ ذکر ہے جس کو سورۃ الہینۃ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ. (الہینۃ: ۸)

ترجمہ: اللہ ان سے راضی اور وہ اس سے راضی۔

یہ نفس مطمئنہ وہی نفس ہے کہ بالکل ابتداء میں جب اللہ رب العزت نے نفس انسان کو

عالم اصل سے عالم بریۃ میں بنایا تو اسے ہی پیدا فرمایا۔ اس لیے قرآن اس نفس کے تعلق سے فرماتا ہے:

ارْجِعِي۔

ترجمہ: لوٹ آ

رجعت وہیں ہوتی ہے جہاں سے انتقال ہوتا ہے۔ چونکہ یہ نفس وہیں سے منتقل ہو کر عالم

بریۃ میں موجود ہوا اس لیے اسے رجعت کا حکم دیا جا رہا ہے۔ یہی وہ نفس ہے جسے قرآن نے ممیز

کرنے کے لیے نفس مطمئنہ سے پکارا ہے۔ یہی نفس ناک (TaNaK) میں نشمۃ کے نام سے پکارا

گیا ہے۔ چنانچہ کہا گیا

(۱) نَشْمَةُ خِيمٍ (براشیت: ۲ آیت: ۷)

ترجمہ: نفس حیات

(۲) نَشْمَةُ شَدَى (ایوب: ۳۲ آیت: ۸)

ترجمہ: نفس خدا

(۳) تیسرا مدرج: کائنات کا تیسرا مدرج 'عالم عصر' ہے۔ دوسرے الفاظ میں کہا

جاسکتا ہے کہ عالم خلق کا دوسرا موجودہ مدرج عالم عصر ہے۔ یہ عالم عصر عالم بریۃ سے نیچے ہے۔ اور

اس عالم عصر کا عالم بریۃ سے ظہور ہوا۔ یہ عالم عصر ہی ہے جہاں سے خلق میں صورت پیدا ہوتی

ہے۔ اس لیے اسے عالم صورت بھی کہا جاسکتا ہے۔ تخلیق کی یہ وہ دوسری منزل ہے جہاں اللہ

تعالیٰ کی شان صورت گری کا ظہور ہوا جس کا ذکر قرآن میں اس طرح فرمایا گیا ہے:

”هو الله الخالق الباری المصور“ (الحشر: ۲۴)

ترجمہ: وہ اللہ ہے بنانے والا نکال کھڑا کرنے والا، صورت کھینچنے والا۔

یہ وہی مدرج ہے جہاں اللہ رب العزت ’الخالق المصور‘ ہے۔ ظاہر ہے یہ الخالق المصور دراصل الخالق الباری کے بعد کی شان ہے۔ یہ مدرج صورت گری کا مدرج ہے۔ چنانچہ جب انسان عالم بریۃ سے عالم عصر میں منتقل کیا گیا تو اس کے وجود میں صورت پیدا ہوئی۔ اور وہ نفس جسے عالم بریۃ میں نفس معصومہ کہا گیا اس مدرج پر روح بن گئی۔ چنانچہ اسی صورت گری کے مراحل کا ذکر قرآن میں اس طرح کیا گیا ہے:

(۱) الذی احسن کل شئی خلقه وبدا خلق الانسان من طین ثم

جعل نسله من سلالۃ من ماء مهین ثم سواه ونفخ فیہ من روحہ وجعل

لکم السمع والابصار والافئدہ قليلاً ما تشکرون۔ (السجدہ: ۹)

ترجمہ: جس نے خوب بنائی جو چیز بنائی اور شروع کی انسان کی پیدائش ایک

گارے سے پھر بنائی اس کو اولاد پنچرے ہوئے مقوی پانی سے پھر اس کا ڈھانچہ بنایا اور

پھونکی اس میں اپنی ایک جان اور بنادیئے تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل تم بہت

تھوڑا شکر کرتے ہو۔

(۲) واذ قال ربک للملائکۃ انی خالق بشرا من صلصال من

حملہ مسنون۔ فاذا سویتہ ونفخت فیہ من روحی فقعوا لہ سجدین۔

(الحجر: ۲۸-۲۹)

ترجمہ: اور جب کہا تیرے رب نے ملائکہ کو میں بنائوں گا ایک بشر کھٹکنا

تے ہوئے گارے سے۔ پھر جب اس کو ڈھانچہ بنادوں گا اور پھونک دوں گا اس میں اپنی

روح میں سے تو گر پڑو اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے۔

(۳) اذ قال ربک للملائکۃ انی خالق بشراً من طین فاذا سویتہ

ونفخت فیہ من روحی فقعوا لہ سجدین۔ (نہ: ۷۱-۷۲)

ترجمہ: جب کہا تیرے رب نے ملائکہ کو میں بنائوں گا ایک بشر کھٹکنا

تے ہوئے گارے سے۔ پھر جب اس کا ڈھانچہ بنادوں اور پھونک دوں گا اس میں اپنی روح میں

سے تو گر پڑو اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے۔

قیامت اور بعث بعد الموت دراصل اسی عمل کی تکرار ہے۔ چنانچہ یہی عمل عالم بریۃ کو عالم صورت میں لاتا ہے اور پھر عالم صورت سے عالم بریۃ میں لے جاتا ہے۔ پہلے عمل سے بے صورت میں صورت پیدا ہوتی ہے اور دوسرے عمل سے وہ صورت بے صورت ہو جاتی ہے۔ اور تیسرے عمل سے پھر بے صورت صورت میں بدل جاتی ہے۔ چنانچہ عالم عصر کا یہ مرحلہ عالم بریۃ کے نیچے ہے۔ یہاں عالم بریۃ جو عالم عصر سے اوپر ہے اور وہ اس چوتھے عالم کا جس کا ذکر ان شاء اللہ کیا جائے گا جو عالم عصر سے نیچے ہے باہم ادغام ہوتا ہے۔ یعنی نفس مطمئنہ کا ادغام جسم کے ساتھ۔ چنانچہ نفس مطمئنہ کا ادغام جسم سے نہیں ہو سکتا ہے۔ اس لیے نفس مزید کثیف کر دی جاتی ہے اور وہ روح میں بدل جاتی ہے۔ چنانچہ روح کا جسم سے ادغام یا اتصال ہوتا ہے اور جب عالم عصر کو بالکل فنا کرنا مقصود ہوتا ہے تو کلیتہاً روح کا جسم سے الگا کر دیا جاتا ہے اور جسم ختم کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس دوران عالم عصر کی وہ کیفیت ہوتی ہے جو تین حالتوں پر مشتمل ہے:

(۱) کسی انسان کی پیدائش ارض سے پہلے روح اور جسم کے اتصال کی عبوری حالت

(۲) پیدائش ارضی اور موت سے قبل کی کلی اتصالی حالت اور

(۳) موت اور قیامت سے قبل کی عبوری اتصالی حالت۔

چنانچہ قیامت کے پہلے صور پھونکے جانے سے مراد ہے اس روئے ارض پر موت اور قیامت کے درمیان تمام انسانوں کی عبوری اتصالی حالت کا خاتمہ۔ اور ہر طرح کی صورت کا خاتمہ۔ ظاہر ہے اس صورت میں ان تمام صورتوں کو فنا ہو جائے گی جو قیامت کے دن زندہ ہوں گے یا اس سے قبل مر چکے ہوں گے۔ اس پہلے صور میں ہر دو حالت عالم فنا کے حوالے ہو جائے گی۔ چنانچہ اسی مرحلے کے بارے میں قرآن نے اس طرح وضاحت فرمائی ہے۔

(۱) وَنَفَخَ فِي الصُّورِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا

مَنْ شَاءَ اللَّهُ. (الزمر: ۶۸)

ترجمہ: اور پھونکا جائے صور میں پھر مر جائیں گے جو کوئی ہے آسمانوں میں

اور زمین میں مگر جس کو اللہ چاہے۔

(۲) فَإِذَا نَفَخَ فِي الصُّورِ نَفْخَةٌ وَاحِدَةٌ وَحُمِلَتِ الْأَرْضُ

وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَاحِدَةً (الحاقة: ۱۳-۱۴)

ترجمہ: پھر جب پھونکا جائے صور میں ایک بار پھونکنا اور اٹھائی جائے زمین

اور پہاڑ پھر کوٹ دیئے جائیں ایک بار۔

اس مرحلے کے بعد اللہ تعالیٰ پھر صورت گری کی تکرار فرمائے گا اور ساری صورتیں پھر بن جائیں گی۔ چنانچہ اس صورت گری کا ذکر کرتے ہوئے قرآن نے فرمایا:

(۱) وَنَفَخَ فِي الصُّورِ فَاذْهَبَ مِنْ الْاجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنْسِلُونَ ۔

(یس: ۵۱)

ترجمہ: اور پھونکی جائے صورت پھر تبھی وہ قبروں سے اپنے رب کی طرف لپک

پڑیں گے۔

(۲) ثُمَّ نَفَخَ فِيهِ اٰخَرٰی فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَنْظُرُوْنَ (الزمر: ۶۸)

ترجمہ: پھر پھونکی جائے دوسری بار تو فوراً وہ کھڑے ہو جائیں ہر طرف دیکھتے۔

(۳) يَوْمَ يَنْفَخُ فِي الصُّورِ فَتَأْتُونَ اَفْوَاجًا (النبا: ۱۸)

ترجمہ: جس دن پھونکی جائے صورت پھر تم چلے آؤ فوج در فوج۔

ان آیات میں جہاں جہاں 'صور' کا استعمال ہوا ہے اور اس سے قرنا یا شکھ جیسی کوئی چیز جو عام طور پر مراد لی جاتی ہے وہ محض عوامی بیان ہے۔ راسخون فی العلم جانتے ہیں کہ یہ دراصل اس خدائے عزیز و جبار کی شان صورت گری اور شان صورت شکنی اور پھر شان صورت گری کا ظہور ہے۔ چنانچہ اسی شان صورت گری کی قسم کھاتے ہوئے اللہ تعالیٰ اس انسان کی کامیابی اور ناکامی پر تبصرہ فرماتا ہے:

وَالْعَصْرِ! اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِي خَسْرٍ۔ (العصر: ۱-۲)

ترجمہ: قسم ہے عصر کی! بے شک انسان ٹوٹے میں ہے۔

یہاں العصر سے مراد 'عالم عصر' ہے جو کائنات کا تیسرا درجہ ہے۔

(۴) چوتھا درجہ: کائنات کا چوتھا درجہ 'عالم اشیاء' ہے۔ دوسرے الفاظ میں کہا

جاسکتا ہے کہ عالم خلق کا تیسرا موجودہ درجہ 'عالم اشیاء' ہے۔ یہ 'عالم اشیاء' 'عالم عصر' سے نیچے ہے۔ اور اس عالم اشیاء کا عالم عصر سے ظہور ہوا ہے۔ یہ عالم اشیاء ہی ہے جہاں عالم عصر کی صورت گری دراصل اشیاء میں صورت گری کی یا 'تسویہ' کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس لیے اس عالم کو "عالم اشیاء" یا 'عالم اسباب' بھی کہا جاتا ہے۔ تخلیق کی یہ تیسری منزل ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی شان 'مسبب الاسباب' کا ظہور ہوتا ہے۔ جس کا ذکر قرآن نے اسی طرح فرمایا ہے:

(۱) ان الله على كل شئ قدير (البقرہ: ۲۰)

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ ہر شے کا ہمہ وقت اندازہ مقرر کرنے والا ہے۔

(۲) هو الذى خلق لكم ما فى الارض جميعاً ثم استوى الى

السماء فسوٰهن سبع سموات وهو بكل شئ عليم (البقرہ: ۲۹)

ترجمہ: وہ وہی ذات ہے جس نے تمہارے لیے پیدا کیا جو کچھ زمین میں ہے

سب پھر تصد کیا آسمان کے ڈھانچہ بنانے کا پھر اس کا ڈھانچہ بنادیا سات آسمانوں میں اور وہ ہر شے کو جانتا ہے۔

(۳) ولله ملك السموات والارض والله على كل شئ قدير

(آل عمران: ۱۸۹)

ترجمہ: السموات اور الارض کی ملک اللہ کی ہے اور اللہ ہر شے کا اندازہ مقرر

کرنے والا ہے۔

(۴) ولله ما فى السموات والارض وكان الله بكل شئ محيطا

(النساء: ۱۲۶)

ترجمہ: السموات والارض میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے اور وہ ہر شے کو گھیرے

ہوئے ہے۔

(۵) بديع السموات والارض انى يكون له ولد ولم تكن له

صاحبة وخلق كل شئ وهو بكل شئ عليم. ذلكم الله ربكم لا اله الا

هو خالق كل شئ فاعبدوه وهو على كل شئ وكيل. (الانعام: ۱۰۱-۱۰۲)

ترجمہ: پہلی بار بنانے والے آسمانوں اور زمین کو کیونکر ہو سکتا ہے اس کا بیٹا

اور کیونکر ہو سکتا تھا کوئی اس کا شریک کار جوڑا (اس لیے کہ) اسی نے بنائی ساری چیزیں

اور وہ ہر شے کا جاننے والا ہے۔ یہی اللہ تمہارا رب ہے نہیں ہے کوئی الہ مگر وہ پیدا کرنے

والا تمام اشیاء کا سی کی بندگی کرو وہ ہر چیز کا کار ساز ہے۔

یہی عالم اشیاء ہے۔ جہاں عالم بریۃ کا نفس مطمئنہ جو 'عالم عصر' میں 'روح' کی صورت میں

منتقل ہو چکا تھا از سر نو منتقل ہو کر صرف 'نفس' بلکہ 'نفس روح' یا 'روح' میں بدل گیا۔ یہ وہی نفس

روح ہے جو تنفس کی صورت میں جاری ہے اور موت تک رہتا ہے۔ دوسری طرف اس 'نفس

روح' یا 'نفس روح' کا محمل دراصل عالم عصر کی 'صورت' یا 'صورت نوعیہ' نہیں رہتی بلکہ عالم

عصر کی 'صورت' یہاں باضابطہ اشیاء (جمادات، نباتات، حیوانات) میں ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ اس

مدرج میں عالم عصر کی 'صورت'، 'صورت اشیاء' میں اور عالم عصر کی 'روح'، 'نفس ریح و روح' یا تنفس میں بدل جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس عالم اشیاء میں یہ دو صورتیں الگ ہو جاتی ہیں تو کہا جاتا ہے کہ جان نکل گئی یا فلاں مر گیا۔ یا یہ کہ جب تک سانس ہے تب تک زندگی ہے۔ اور جب یہ سانس چلی گئی تو اسے موت کہتے ہیں۔ یہ موت ہے لیکن یہ موت عالم اشیاء کی مادیات اور نفس ریح کا الگاؤ اور ان کی موت ہے۔ یہ روح کی موت نہیں جو عالم عصر کی اصل ہے۔ نہ اس 'صورت' کی جو عالم عصر میں روح کا محمل ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ موت سے روح نہیں مرتی نہ صورت ختم ہوتی ہے۔ اور اسی لیے کہا جاتا ہے کہ

کل نفس ذائقة الموت والینا ترجعون۔ (العنکبوت: ۵۷)

ترجمہ: ہر نفس موت چکھنے والا ہے اور ہماری طرف لوٹ آنے والا ہے۔

یہی 'عالم اشیاء' 'کلف' کا محمل ہے۔ جسے 'تکلیف' کہا جاتا ہے۔ قرآن نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:

(۱) لا نکلف نفساً الا وسعها۔ (الانعام: ۱۰۴)

ترجمہ: ہم کسی نفس کو مکلف نہیں کرتے مگر جو اس کی وسعت ہے۔

(۲) والذین آمنوا وعملوا الصالحات لا نکلف نفساً الا وسعاً۔

(الاعراف: ۴۲)

ترجمہ: اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے ہم کسی نفس کو مکلف نہیں کرتے مگر جو اس کی وسعت ہے۔

(۳) ولا نکلف نفساً الا وسعها ولدینا کتاب یتعلق بالحق۔

(المومنون: ۶۲)

ترجمہ: اور ہم کسی نفس کو مکلف نہیں کرتے مگر جو اس کی وسعت ہے، اور ہمارے پاس ہے کتاب جس میں یہ باتیں ٹھیک ٹھیک انداز میں درج ہیں۔

(۴) لا یکلف الله نفساً الا وسعاً۔ (البقرہ: ۲۸۶)

ترجمہ: اللہ مکلف نہیں کرتا کسی نفس کو مگر جو اس کی وسعت ہے۔

(۵) لا یکلف الله نفساً الا ما اتاہا۔ (الطلاق: ۷)

ترجمہ: اللہ مکلف نہیں کرتا کسی نفس کو مگر جو اس کے لیے دیا گیا ہے۔

چنانچہ یہی عالم اشیاء ہے جہاں 'دین اللہ'، شرعہ، اور 'منہاج' میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ جس کا

ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس طرح فرمایا ہے اور یہی 'شرع' اور 'منہاج' ہے جسے قرآن میں 'الحق' سے بھی موسوم کیا گیا ہے:

(۱) وانزلنا اليك الكتاب بالحق مصدقا لما بين يديه من الكتاب ومهيمناً عليه فاحكم بينهم بما انزل الله ولا تتبع اهوام عما جاذك من الحق. لكل جعلنا منكم شرعة ومنهاجا ولو شاء الله لجعلكم واحده ولكن ليبلوكم في ما اتيكم فاستبقوا الخيرات الى الله مرجعكم جميعاً فينبئكم بما كنتم فيه تختلفون. (المائدہ: ۴۸)

ترجمہ: اور تجھ پر اتاری ہم نے کتاب سچی تصدیق کرنے والی سابقہ کتابوں کی اور ان کے مضامین پر نگہبان سو تو حکم کر ان میں موافق اس کے جو کہ امار اللہ نے اور ان کی خوشی پر مت چل چھوڑ کر سیدھا راستہ جو تیرے پاس آیا ہر ایک کو تم میں سے دیا ہم نے، ایک دستور اور راہ اور اللہ چاہتا تو تم کو ایک دین پر کر دیتا لیکن تم کو آزمانا چاہتا ہے اپنے دیئے ہوئے حکموں میں سو تم دوڑ کر لو خوبیاں اللہ کے پاس تم سب کو پہنچنا ہے۔ پھر جتادے گا جس بات میں تم کو اختلاف تھا۔

چونکہ یہ عالم اشیاء تکلیف کا محمل ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس عالم میں دین اللہ کو شریعت میں جاری فرمایا۔

حقیقت دوم

ابلیس، الشیاطین کی حقیقت :

ابلیس اور الشیاطین وغیرہم کی حقیقت پر مختصر بحث سے قبل یہ بات ضروری معلوم ہوتی ہے کہ تخلیق کے اس دور کا ذکر کیا جائے جب اللہ تعالیٰ نے تخلیق کا عمل شروع فرمایا اور کائنات خلق میں اس کی کئی مخلوقات ارتباء کے مقامات طے کرنے لگیں جس کا 'ماکان وما یکون' میں صرف برائے نام ذکر کیا گیا ہے۔

(۱) ملاحظہ فرمائیں : صفحہ ۹۲ : سلسلہ ارتباء کائنات نوری

سلسلہ ارتباء کائنات ناری

سلسلہ ارتباء کائنات ارضی

(۲) ملاحظہ فرمائیں : صفحہ ۱۷۵ : "موجودات اول کے بعد تخلیق کا وہ دور شروع ہوتا

ہے جسے موجودات ثانی کہا جاسکتا ہے۔ چنانچہ کائنات السموات والارض مزید کثیف بنائی گئی اور اللہ تعالیٰ نے تین موجودات کی تخلیق کی۔ انہیں مخزن سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یہ تین مخزن درج ذیل ہیں:

(۱) مخزن نور

(۲) مخزن نار

(۳) مخزن ارض

یہی تین مخازن خلق میں ارتباء مطلق مجرد کی آخری کڑی معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ارتباء مطلق کے ساتھ ساتھ اضافی بھی ہو گیا۔ یہی تین مخازن اصلاً کائنات نور، کائنات نار اور کائنات ارض کے مخزن ہیں۔

(۳) ملاحظہ فرمائیں : صفحہ ۱۸۲ - "خلق ثالث کے بعد اللہ تعالیٰ نے خلق رابع شروع

کیا۔ چونکہ ہم اپنی بحث کو کائنات ارضی تک محدود رکھیں گے۔ اس لیے سلسلہ ارتباء کائنات نوری اور سلسلہ ارتباء کائنات ناری کا ذکر صرف ضمناً ہو گا۔"

(۴) ملاحظہ فرمائیں : صفحہ ۱۹۰ : ”جیسا کہ عرض کیا گیا کہ خلقِ ثالث کے دوسرے مرحلے میں ارتباء کائنات السموات والارض نوری کا آغاز ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ ارتباء کائنات السموات والارض ناری اور ارتباء کائنات السموات والارض ارضی کا۔ چنانچہ کائنات السموات والارض نوری میں کھربوں السماء والارض نوری تشکیل پانے لگیں اور ان میں ارتباء کا عمل جاری ہوا۔ انہیں میں سے ایک وہ السماء والارض نوری ہوگی جو دراصل ہماری السماء والارض کی مثل ہوگی۔ اسی طرح کائنات السموات والارض ناری میں کھربوں السماء والارض ناری تشکیل پانے لگیں۔ اور ان میں ارتباء کا عمل جاری ہوا۔ انہیں میں سے ایک وہ السماء والارض ہوگی جو دراصل ہمارے السماء والارض کی مثل ہوگی۔

چنانچہ عالمِ عصر میں اللہ تبارک تعالیٰ نے ان تینوں مخازن سے ارتباء کا عمل جاری فرمایا۔ اور اس طرح ان کے تین الگ نام قرار پائے۔

(۱) الْعَلَک : ابناء نوری یا انواع نور کا نوعی نام ملک ہے۔ مَلَّک اور ملائکہ ایک نہیں بلکہ دو الگ الگ الفاظ ہیں جو الگ الگ مادوں سے بنے ہیں۔ ملک اسمِ نوع ہے جبکہ ملائکہ اسمِ تفویض ہے۔ چنانچہ نہ ہر ملک ملائکہ ہے اور نہ ہی ہر ملائکہ ملک۔

(۲) الْجِن : ابناء ناری یا انواع نار کا نوعی نام جن ہے۔ الجن اور الملک میں نوعی فرق ہے لیکن دونوں ملائکہ ہو سکتے ہیں۔ اس لیے کہ ملائکہ تفویضی اسم ہے جبکہ جن نوعی۔ جس طرح سارے ملائکہ کا ملک یا جن ہونا محال ہے اسی طرح سارے جن کا ملائکہ ہونا بھی محال ہے۔

(۳) الْاَیْدِم : ابناء ارض یا انواع ارض کا نوعی نام الایدم ہے۔ الایدم، الجن اور الملک میں نوعی فرق ہے۔ لیکن تینوں ملائکہ ہو سکتے ہیں۔ اس لیے کہ ملائکہ تفویضی اسم ہے جبکہ الایدم، الجن اور الملک نوعی۔ جس طرح سارے ملائکہ کا تنہا ملک، جن یا آدم میں سے کسی ایک سے ہونا محال ہے اسی طرح سارے آدم کا ملائکہ ہونا بھی محال ہے۔ یہ الایدم وہی ہے جو آدم قدیم بھی کہلاتا ہے۔

الملائکہ :

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ مَلَّک اور ملائکہ دو بالکل الگ الگ وجود ہیں۔ مَلَّک نوع ہے اور اس کا تعلق ابناء نور سے معلوم ہوتا ہے۔ جب کہ ملائکہ اسمِ تفویض ہے اور ایک منصب، مقام اور

ذمہ داری ہے۔ چنانچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ کا کسی بھی نوع سے پایا جانا متبادر ہے۔ اس طرح
انباء نور، انباء نار اور انباء ارض ہر سہ گروہوں سے ملائکہ ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ:

(۱) انباء نور یعنی مَلَك سے مَلَاکَک ملائکہ — کا ہونا ممکن ہے۔

یہی وہ بات ہے جس کی طرف قرآن میں اس طرح اشارہ کیا گیا ہے:

(۱) وَقَالُوا لَوْ لَا انْزَلَ عَلَیْهِ مَلَكٌ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَاکًا تَقْضِی الْاَمْرَ ثُمَّ

لَا یَنْظُرُونَ۔ وَلَوْ جَعَلْنَا مَلَاکًا لَجَعَلْنَاهُ رَجُلًا وَلَلْبَسْنَا عَلَیْهِمْ مَا یَلْبَسُونَ۔

(الانعام ۸-۹)

ترجمہ: اور کہتے ہیں کہ کیوں نہیں اترا اس پر کوئی ملک اور اگر ہم اتاریں

ملک۔ لے ہو جائے قصہ پھر ان کو مہلت بھی نہ ملے اور اگر ہم رسول بنا کر بھیجتے کسی ملک کو

تو وہ بھی آدمی ہی کی صورت میں ہوتا اور ان کو اسی شبہ میں ڈالتے جس میں اب پڑ رہے

ہیں۔

(۲) قُلْ لَوْ کَانَ فِی الْاَرْضِ مَلَاکَکَ یَمْشُونَ مَطْمَئِنِّینَ لَنَزَلْنَا

عَلَیْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ مَلَاکًا رَّسُولًا (نہی اسرائیل: ۹۵)

ترجمہ: کہہ اگر ہوتے زمین میں ملائکہ پھرتے بستے تو ہم اتارتے ان پر آسمان

سے کوئی ملک رسول۔

(۲) انباء نار یعنی جن سے جِنَا مَلَاکَکَکَ یا مَلَاکَکَکَ الْجِنِّ — کا ہونا ممکن ہے۔

یہی وہ بات ہے جس کی طرف قرآن میں اس طرح اشارہ کیا گیا ہے:

(۱) وَانْزَلْنَا لِلْمَلَاکَکَکَ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا اِلَّا ابْلِیْسَ۔

(البقرہ: ۳۴)

ترجمہ: اور جب ہم نے کہا ملائکہ کو سجدہ کرو تم سب آدم کو تو انہوں نے سجدہ

کیا مگر ابلیس۔

اس حکم میں نفس ملائکہ میں تمام ہی داخل تھے جو انباء ارض کے علاوہ تھے یعنی انباء نور میں سے

ملائکہ یعنی ملائکہ الانبیاء اور انباء نار میں سے ملائکہ الجن یعنی جن ملائکہ دونوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا۔

(۳) انباء ارض یعنی انباء بشر سے اَرْضًا مَلَاکَکَکَ، آدَمًا مَلَاکَکَکَ یا بَشَرًا مَلَاکَکَکَ کا

ہونا ممکن ہے۔

چنانچہ اگر قرآن میں غور کیا جائے تو یہ اَرْضًا مَلَاکَکَکَ، آدَمًا مَلَاکَکَکَ یا بَشَرًا مَلَاکَکَکَ دراصل انبیاء

کرام ہی ہیں جو دراصل انسانوں میں سے ملائکتہ ہیں۔ یہی وہ بات ہے جس کی طرف قرآن نے اس طرح اشارہ کیا ہے:

(۱) وَلَقَدْ صَرَفْنَا لِلنَّاسِ فِي هَذَا الْقُرْآنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ فَأَبَى أَكْثَرُ النَّاسِ إِلَّا كُفُورًا وَقَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنْبُوعًا أَوْ تَكُونَ جَنَّةً مِنْ نَخِيلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خُلُلًا تَفْجِيرًا أَوْ تَسْقُطَ السَّمَاءُ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسْفًا أَوْ تَأْتِيَ بَالِلًا وَالْمَلَائِكَةُ قَبِيلًا أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِنْ زُخْرَفٍ أَوْ تَرْقَى فِي السَّمَاءِ وَلَنْ نُؤْمِنَ لِرَقِيِّكَ حَتَّى تَنْزِلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَقْرُؤُهُ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَى إِلَّا أَنْ قَالُوا بَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا رَسُولًا (بنی اسرائیل ۸۹-۹۳)

ترجمہ: اور ہم نے پھیر پھیر کر سمجھائی لوگوں کو اس قرآن میں ہر مثل سو نہیں رہتے بہت لوگ بن ناشکری کیے۔ اور بولے ہم نہ مانیں گے تیرا کہا جب تک تو نہ جاری کر دے۔ ہمارے واسطے زمین سے ایک چشمہ یا ہو جائے میرے واسطے ایک باغ کھجور اور انگور کا پھر بہائے تو اس کے بیج نہریں چلا کر یا گرا دے آسمان ہم پر جیسا کہ تو کہا کرتا ہے ٹکڑے ٹکڑے یا لے آ اللہ کو اور ملائکہ کو سامنے۔ یا ہو جائے تیرے لیے ایک گھر سنہرا یا چڑھ جائے تو آسمان میں اور ہم نہ مانیں گے تیرے چڑھ جانے کو جب تک نہ اتار لائے ہم پر ایک کتاب جس کو ہم پڑھ لیں تو کہہ سبحان اللہ میں کون ہوں مگر ایک بشر رسول اور لوگوں کو روکا نہیں ایمان لانے سے جب پہنچی ان کو ہدایت مگر اسی بات نے کہ کہنے لگے کیا اللہ نے بھیجا بشر رسول۔

آنحضور ﷺ پر یہ کوئی آسمان علمی حملہ نہ تھا۔ بلکہ ان کی حقانیت کو پرکھنے کے لیے اس وقت ابلیس نے پوری کائنات میں اپنی پوری فوج کے اعلیٰ ترین ماہرین لگا دیئے تھے اور جن کے ترجمان علماء یہود تھے۔ یہ سوالات کسی قریشی کے بس کی بات نہیں بلکہ عام علماء یہود کے بس سے بھی باہر کی بات ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس وقت روئے زمین پر جو آخری درجے کے احبار و رہبان یہود تھے وہ آنحضور ﷺ سے علمی ٹکر لے رہے تھے جن کا دعویٰ تھا کہ ہزاروں سالوں میں جمع کائنات کا سارا اچھا اور برا علمی سرمایہ صرف ان کے دلوں میں پوشیدہ ہے۔ اور باقی ساری خلقت عام حارِض یعنی Gentile یعنی امی ہے۔ اور صرف وہی لوگ عام حا سِفر ہیں۔

یہاں کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کی وضاحت ضروری ہے:

(۱) اگر انبیاء بشر اُملائکہ ہیں تو ان کا قیام (Abode) آسمان میں ہونا چاہئے تھا۔ اور انہیں آسمان سے زمین پر نازل ہونا چاہئے تھا۔ اس تعلق سے پہلی غلط فہمی آسمان کے معنی کی تعین میں ہے۔ آسمان کے کئی مفہام ہیں اور ہر کوئی اپنی جگہ بامعنی ہے ان میں سب سے وسیع تر معنویت اس السموات کے معنی میں ہے جو الارض کے علاوہ ہے۔ دوسری چیز یہ کہ ملائکہ کا قیام کہیں بھی ہو سکتا ہے۔ خواہ وہ الارض ہو یا یہ ارض، السماء ہو یا یہ آسمان۔ اسی طرح ان کا میدان عمل یا ذمہ داریوں کی جگہ اللہ کے حکم سے کہیں بھی ہو سکتی ہے۔

اب سوال ہے نزول کا۔۔۔ یہ بات کہ اگر انبیاء بشر اُملائکہ ہیں تو پہلے انہیں انسانوں میں پیدا ہونا چاہئے تھا پھر یہاں سے آسمان میں جانا چاہئے تھا پھر اتر کر اللہ کا پیغام دینا چاہئے تھا۔ ہر چند کہ ایسا ہونا نہ خلاف عقل ہے نہ مستبعد۔ لیکن عام اعتبار سے ایسا اس وقت کیا جاتا جب انسان کسی اور مقام میں موجود ہوتے مثلاً کسی اور سیارے اور کہکشاں میں اور ان کا میدان عمل کسی اور مقام پر ہوتا مثلاً کسی دوسرے سیارے یا کہکشاں میں۔ لیکن چونکہ تین واقعات ایسے ہوئے جنہوں نے صورت حال میں یہ تبدیلی کر دی کہ پوری کائنات میں یہی ارض جو زہرہ (Venus) اور مریخ (Mars) کے مابین ہے۔ پوری کائنات میں معرکہ خیر و شر کے لیے میدان کارزار قرار دے دی گئی۔ یہ تین واقعات ہیں:

(۱) اسی نفس ارض سے آدم کی تخلیق کا ہونا۔

(۲) الجنۃ میں آدم و حوا سے غلطی کا ہونا۔

(۳) آدم و حوا کے لیے اس ارض کو مسکن قرار دینا (جو زہرہ اور مریخ کے مابین ہے) اور توبہ کی انابت اور مغفرت کے باوجود ان کا اس زمین پر منتقل کیا جانا اور اس طرح معرکہ خیر و شر کا الجنۃ سے الارض پر منتقل ہو جانا اور اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ کہ وہ ہدایت بھیجیں گے چنانچہ اس طرح رسالت کا اجراء کیا جانا۔

یہ وہ خصوصی صورت حال تھی جس میں تمام بشر نبیاً جو بشر اُملائکہ تھے اسی زمین پر ان کا مولد و مسکن بھی ہو گیا اور میدان کار بھی۔ دین اللہ میں یہ وہ سنت الہی ہے جس کو سمجھنے کے لیے اس تقریر کا سمجھنا ضروری ہے جو حکیم الامت مولانا تھانوی نے ”بیان القرآن“ میں کی ہے۔

آپ سورہ المائدہ آیت: ۳۱ کے تحت آدم کے دو بیٹوں قابیل اور ہابیل کے واقعے میں پہلے قصہ نقل کرتے ہیں: ”خلاصہ قصہ کا یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے جو لڑکا پیدا ہوتا تھا اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی پیدا ہوتی اسی طرح دوسرے بطن میں بھی ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہوتی اور ایک بطن کا لڑکا دوسرے بطن کی لڑکی سے اور دوسرے بطن کا لڑکا پہلے بطن کی لڑکی سے بیاہ دیا جاتا۔“

اس قصہ کی تقریر کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں:

”آدم علیہ السلام کی شریعت میں حسب ضرورت وقت یہ افتراق بطون بمنزلہ افتراق نسب کے قرار دیا گیا۔“

اس پر حاشیہ لکھتے ہوئے آپ مزید فرماتے ہیں:

”اس تقریر کے بعد علی الاطلاق اس کا قائل ہونا بلا دلیل ہے کہ حضرت آدم کی شریعت میں بہن سے نکاح جائز تھا۔ بلکہ بہن سے نکاح میں یہ بھی قید تھی کہ دوسرے بطن سے ہو پس یہ افتراق ایسا تھا جیسا کہ آج کل خالہ کی لڑکی سے نکاح جائز ہے، حالانکہ ماں کی لڑکی اور خالہ کی لڑکی میں چنداں فرق نہیں کیونکہ نانی میں یہ دونوں ایک ہی ہو جاتی ہیں کہ دونوں کی ماں اس ایک ہی سے پیدا ہوئی ہیں۔“ (تبیان)

(مولانا اشرف علی تھانوی: بیان القرآن: سورہ المائدہ آیت: ۳۱)

چنانچہ ”حسب ضرورت وقت یہ افتراق بطون بمنزلہ افتراق نسب کے قرار دیا گیا“ ٹھیک اسی طرح اس روئے زمین پر بعثت بمنزلہ نزول ہے۔ اور وہ اس لیے کہ نازل ہونا اس وقت ضرور ہوتا جب ان انبیاء کو کہیں اور جگہ سے آنا پڑتا یا کہیں اور جانا پڑتا۔ بلاشبہ اس بعثت کے لیے اعلان اور خود اس پر اس شخص کے لیے بھی شہادت لازمی قرار دی گئی۔ چنانچہ کوئی نبی نہ تو خفیہ طور پر نبی رہ کر پوری زندگی اپنا فرض انجام دے سکتا تھا اور نہ اس صورت میں کہ دوسرے لوگ تو اسے نبی کہیں اور اس پر ایمان لائیں اور خود وہ اپنے آپ کو نہ نبی کہے اور نہ اس کا اقرار کرے۔ چنانچہ یہ بعثت مع اعلان اور اقرار بمنزلہ نزول ہیں۔

(۲) ملائکہ کا اردو میں اکثر ترجمہ فرشتہ کیا جاتا ہے یہ درست ہوتے ہوئے بھی اب چونکہ مخصوص تصورات کے ساتھ رائج ہو چکا ہے اس لیے احتیاطاً یہاں فرشتہ لکھنے سے احتراز کیا گیا ہے اور ملائکہ ہی لکھا گیا ہے۔

(۳) ملائکہ کے تصور کے ساتھ ان کے اڑنے، مافوق العادة کام انجام دینے، آسمانوں اور زمینوں کی وقت کے چھوٹے سے چھوٹے حصے میں سیر کرنے کا تصور کیا جاتا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ملائکہ تو ایک ذمہ دارانہ منصب کا نام ہے جس کی بنیادی ذمہ داری یا صفت اڑنا، مافوق العادة کام انجام دینا، آسمانوں اور زمینوں کی چھوٹے سے چھوٹے وقت میں سیر کرنا نہیں۔ بلکہ یہ صفت دراصل وہ فطری قوت ہے جو بحیثیت مخلوق کے الگ الگ مخلوقات کو دی گئی ہے۔ اور ابناء نور اور ابناء نار اور ابناء آدم یعنی ملک اور جن اور آدمی میں پائی جاتی ہے۔ سب سے زیادہ قوت، تیز رفتاری ملک میں اس سے کم جن میں اور سب سے کم آدمی میں۔ چنانچہ آدمی بغیر کسی چیز کا سہارا لیے اڑنے سے قاصر ہے یا عام حالات میں اڑنے یا پلک جھپکتے کسی جگہ جانے سے قاصر ہے۔ جبکہ جن اس پر قادر ہیں اور جن چیزوں پر جن قادر ہیں ان سے زیادہ بہتری کے ساتھ اس پر ملک قادر ہیں۔ چنانچہ ممکن ہے کوئی چیز یا کام آدمی کے لیے مافوق القوۃ ہو وہی چیز جنوں کے لیے مافوق القوۃ نہ ہو اور ممکن ہے کوئی چیز یا کام جنوں کے لیے مافوق القوۃ ہو لیکن وہی چیز یا کام ملک کے لیے مافوق القوۃ نہ ہو۔ اسی طرح آدمی، جن اور ملک کے لیے عجز کے الگ الگ معیار ہیں۔ ممکن ہے جنوں کے ذریعہ کیے جانے کے لائق کام آدمی کے ذریعہ اگر ہو جائے تو اسے معجزہ کہیں گے تو ملک کے ذریعہ کیے جانے والے کام اگر جنوں کے ذریعہ ہو جائے تو وہ جنوں کے لیے معجزہ کہلائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی کام ملک کرنے سے عاجز ہیں اور وہ کام کسی کے ذریعہ ہو جائے تو یہ عظیم الشان معجزہ ہو گا۔

اسی مقام پر معراج کی حقیقت کے لیے دلیل بھی ملتی ہے۔ اور وہ یہ کہ ملائکہ میں سے بھی سب سے مقرب ذات حضرت جبریل کی ہے اور وہ بھی سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچ کر آپ ﷺ سے فرماتے ہیں کہ آپ آگے تنہا تشریف لے جائیں میں اس سے آگے آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

اگر یک سر موئے برتر پر م فروغ تجلی بسوزد پر م
مَلَاکاً مَلَائِکَہ :

اب جہاں تک ملائکہ کی بات ہے تو وہ اپنی صفات اور ذمہ داریوں کے اعتبار سے کئی

اقسام اور مدارج کے ہیں مثلاً:

(۱) (الف) (۱) حاملین عرش

(۲) ملائکہ حول العرش

(۳) حفظ

(ب) (۱) صافات

(۲) زاجرات

(۳) تالیات

(۴) مرسلات

(۵) عاصفات

(۶) ناشرات

(۷) فارقات

(۸) ملقیات ذکراً

(۹) ملقیات عذراً

(۱۰) ملقیات نذراً

(ج) (۱) رقیب عتید

(۲) کاتبین کرام کراما کاتبین

(۳) ملک الموت وغیرہم۔

لیکن ان کا تذکرہ اس بحث کو طول دے دیگا جس کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس وقت ہم صرف چند مخصوص ذمہ داریوں کے تعلق سے جن کا بنیادی تعلق معرکہ خیر و شر سے ہے بیان کرتے ہیں اور اس تعلق سے ان ملائکہ کا ذکر ہوگا۔

(د) (۱) الروح الامین

(۲) الروح

(۳) ملائکہ بالروح

(۴) ملائکہ رسولاً

(۵) ملائکہ رسولاً بشیراً

(۶) ملائکہ زکراً

(۷) ملائکہ بشرأ

(۸) ملائکہ عذراً

(۹) ملائکہ نذراً

(۵) ان کے علاوہ وہ ملائکہ ہیں جن کا اس اعتبار سے خصوصی ذکر کیا جانا چاہئے مثلاً:

(۱) جنود اللہ اور جنود الرب

(الف) جند الارض

(ب) جند السماء

(۱) المسومین

(۲) المردفین

(۳) المنزلین

بشرأ ملائکہ رسولاً

(الف) (۱) سیداً

(۲) حصوراً

(۳) حناناً

(۴) صادق الوعد

(۵) زکیاً

(۶) تقییاً

(۷) برأ

(۸) علماً

(۹) کلمۃ

(۱۰) تکلیماً

(ب) (۱) نبیاً

(۲) رسولاً نبیاً

(۳) صديقاً نبیاً

اس تعلق سے الملک، الجن اور الآدم کے پسندیدہ، اعلیٰ اور برگزیدہ مقام کو قرآن نے ”المقربون“ یا ”المقربین“ سے مخاطب کیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(۱) لن يستنكف المسيح ان يكون عبدالله ولا الملائكة

المقربون (النساء: ۱۷۲)

ترجمہ: مسیح کو اس سے ہر گز عار نہیں کہ وہ بندہ ہو اللہ کا اور نہ ملائکہ کو کہ وہ

مقرب ہوں۔

(۲) والسابقون السابقون اولئك المقربون (الواقعة: ۱۰-۱۱)

ترجمہ: اور آگے والے تو آگے والے وہی ہیں مقرب۔

(۳) كلا، كتاب الابرار لفي عليين. وما ادراك ما عليون

كتاب مرقوم يشهدون: بون (المطففين: ۱۸-۲۱)

ترجمہ: ہر گز نہیں بیشک کتاب الابرار علیین ہے۔ اور تجھ کو کیا خبر کیا ہے

علیون۔ ایک لکھی ہوئی کتاب۔ اس کو ہمہ وقت سامنے رکھتے ہیں مقرب۔

(۴) عينا يشرب بها المقربون (المطففين: ۲۸)

ترجمہ: وہ ایک چشمہ ہے جس سے پیتے ہیں مقرب

(۵) اذ قالت الملائكة يفرم ان الله يبشرك بكلمة منه اسم

المسيح عيسى ابن مريم وجيها في الدنيا والآخرة ومن المقربين (آل

عمران: ۴۵)

ترجمہ: جب کہا ملائکہ نے اے مریم! بے شک اللہ تجھ کو اپنے سے ایک کلمہ

کی خوشخبری دیتا ہے جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہو گا صاحب مرتبہ دنیا میں اور آخرت

میں اور مقربون سے۔

(۶) فاما ان كان من المقربين فروح وريحان وجنت نعيم۔

(الواقعة: ۸۸-۸۹)

ترجمہ: سو جو اگر وہ مردہ ہو مقرب لوگوں میں تو راحت ہے اور روزی ہے

اور باغ نعمت کا۔

جیسا کہ ابتداء عرض کیا گیا کہ کائنات میں عالم اصل، عالم بریہ، عالم عصر اور عالم اشیاء

پائے جاتے ہیں تو اس سے مراد ہر سہ مخازن میں ان کا وقوع ہے۔ چونکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام مخلوقات میں عالم اصل اور عالم بریۃ مشترک ہیں اس لیے تقسیم کی صورت اس کے بعد واقع ہوتی ہے۔ یعنی عالم عصر اور عالم اشیاء میں۔ اس طرح کائنات نور میں بھی کسی عالم عصر اور عالم اشیاء کا پایا جانا یقینی ہے۔ اسی طرح کائنات نار میں عالم عصر اور عالم اشیاء کا پایا جانا۔

انواع نور

اللہ تعالیٰ نے انواع نور میں ارتباء کا عمل جاری فرمایا اور ایسا لگتا ہے کہ جب وہ عالم عصر اور عالم اشیاء سے گزارے گئے تو جو بات سامنے آئی وہ یہ تھی کہ ان میں بحیثیت مجموعی یا بالاکثر 'عصو' یعنی نافرمانی کے رجحان نہیں پائے گئے۔ یعنی وہ حیات اور شعور سے تو متصف ہیں لیکن تکلیف یعنی تنخیر یا اختیار سے بالاکثر متصف نہیں یا وہ اس تعلق سے مفراط نشاط (Overactive) نہیں۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں اس صورت حال کو تسلیم کر لیا جو اس آیت میں مذکور ہے:

لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ. (التحریم - ۶)

ترجمہ: وہ نافرمانی نہیں کرتے جو ان کو حکم دیا جاتا ہے۔

(اس تعلق سے مزید باتیں ان شاء اللہ بعد میں آئیں گی)

یوں تو اللہ علیم وخبیر اس بات سے ہمیشہ باخبر تھا تاہم اس پر اس بات نے بھی حجت قائم کر دی جب اللہ تعالیٰ کے انسان کو خلیفہ بنائے جانے کے اعلان پر انواع نور کی جانب سے اعتراض کیا گیا۔ اور اس اعتراض کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے انواع نور پر یہ بات آدم کے ذریعہ واضح فرمادی کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ درست ہے اور انواع نور کے بجائے آدم ہی خلافت کے لیے مستحق ہے۔ مزید ازیں یہ کہ خود انواع نور کی بھلائی اور زیادہ فلاح اسی میں مضمر ہے کہ وہ اس مسابقت سے الگ ہو جائیں۔ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ حجت کی تکمیل صرف واقعی (Virtually) نہیں کرتا بلکہ اصلی (Actually) کرتا ہے۔ چنانچہ اس نے انواع نور پر اصلی حجت بھی پوری کر دی۔

اس تعلق سے کم از کم دو باتیں قرآن اور احادیث میں مذکور ہیں:

(۱) بابل کے دو ملک کا واقعہ

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وما انزل علی الملکین ببابل هاروت وماروت ، وما یعلمان من
احد حتی یقولوا انما نحن فتنه فلا تکفر (البقرہ۔ ۱۰۲)

ترجمہ: اور جو اترادو ملک ہاروت اور ماروت پر بابل میں۔ اور وہ دونوں نہیں
سکھاتے تھے کسی کو جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم تو آزمائش ہیں۔ اس لیے تم کفر نہ
کرو۔“

اس آیت کی تمام تاویلات میں اس عاجز کے نزدیک سب سے مضبوط تاویل (جس پر
تفصیل سے بحث کرنے کی یہاں گنجائش نہیں) وہ ہے جس کا ذکر ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں
اس طرح کیا ہے:

”روایت کی حسن بن یحییٰ نے فرمایا خبر دی عبدالرزاق نے فرمایا، فرمایا معمر نے فرمایا قتادہ
اور زہری نے عبد اللہ سے ”وما انزل علی الملکین ببابل هاروت وماروت“ یہ دونوں
ملائکہ میں سے ملک تھے (یہ دونوں ملک ملائکہ میں سے تھے) ان دونوں کو (زمین پر) اتارا گیا
تاکہ یہ دونوں لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں۔ (یا حکمت سکھائیں) اور وہ اس لیے کہ ملائکہ نے
بنی آدم کو جو احکام دیئے گئے تھے ان کا مذاق اڑایا۔ چنانچہ ان دونوں کے پاس ایک عورت آئی تو وہ
دونوں اس کے دام میں گرفتار ہو گئے۔ چنانچہ انہیں اوپر بلایا گیا اور ان پر ان کی غلطی واضح کی گئی۔
انہیں اختیار دیا گیا کہ وہ عذاب دنیا اور عذاب آخرت میں کسی ایک کا انتخاب کر لیں۔ چنانچہ ان
دونوں نے عذاب دنیا کو چن لیا۔۔۔۔۔“

یہ واقعہ دراصل ایک حجت تھی۔ (اس سے قبل بھی کئی واقعات ایسے ہوئے ہیں جن کا
ذکر یہاں کیا جانا بحث کو طویل بنادے گا جس کی گنجائش نہیں۔)

(۲) دجال کے ساتھ دو فرشتوں کا واقعہ

یہ حدیث مسند احمد اور الذرا لمشور میں بیان ہوئی ہے:

”رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے
کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے سامنے خطبہ دیا اور فرمایا: سنو! مجھ سے پہلے جو نبی بھی آیا
اس نے اپنی امت کو دجال سے ڈرایا ہے۔ وہ بائیں آنکھ سے کانا ہوگا۔ اسکی دائیں آنکھ
پر ایک موٹی سے پھلی ہوگی۔ اس کی دو آنکھوں کے درمیان ”کافر“ لکھا ہوگا اس کے
ساتھ دو واویاں ہوں گی جن میں سے ایک جنت اور دوسری آگ ہوگی۔ اس کی آگ

جنت ہرگی اور جنت آگ۔ اس کے ساتھ دو فرشتے ہوں گے جو انبیاء میں سے دو نبیوں کے مشابہ ہوں گے اگر میں چاہوں تو ان دونوں نبیوں کے نام اور ان کے آباؤ اجداد کے نام بھی بتا سکتا ہوں۔ ان دو فرشتوں میں سے ایک دجال کے دائیں جانب ہو گا اور دوسرا بائیں جانب اور یہ سب کچھ آزمائش کے لیے ہو گا۔ چنانچہ دجال پوچھے گا: کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ کیا میں زندہ کرتا اور مارتا نہیں ہوں؟ ایک فرشتہ جواب دے گا کہ ”تو نے جھوٹ بولا۔“ یہ جواب سوائے اس کے ساتھی کے کوئی آدمی نہ سن سکے گا اور وہ کہے گا کہ ”تو نے سچ کہا“ اس جواب کو سب حاضرین سن لیں گے اور گمان کریں گے کہ یہ دوسرا دجال کی تصدیق کر رہا ہے۔..... الخ۔“

یہ حدیث نہایت پیچیدہ حدیثوں میں سے ایک ہے جس پر تفصیلی بحث ان شاء اللہ آئندہ صفحات میں ہوگی۔ اس وقت تو صرف اس جانب اشارہ کرنا ہے کہ

(۱) کیا وہ دونوں فرشتے دجال کے قیدی ہوں گے؟

(۲) کیا وہ اتنا طاقتور ہو گا کہ پہلے فرشتے کی بات کو جو اس کے خلاف جاتی ہے اس کو صوفنا

محو (Black out) کر دے؟ اور دوسرے کی بات کو اس طرح اس کے بعد لے آئے کہ معلوم ہو کہ وہ دونوں اس کی تصدیق کر رہے ہیں۔

(۳) واضح ہو کہ وہ دونوں فی الحقیقت ملک ہوں گے مگر شکل دو انبیاء ہوں گے۔ اس لیے

عوام الناس کے لیے اس معیت اور تصدیق کی حیثیت دو انبیاء کا حضرت مسیح کے ساتھ معیت اور تصدیق کا معاملہ سمجھا جائے گا۔ اس لیے کہ یہ دجال اصلاً حضرت عیسیٰ کا ہم شکل اور ہم صفات ہو گا۔

ان حالات میں ملائکہ کا دجال کے ہاتھوں مقید ہو جانا ایک بہت بڑا سوال ہے جو ملائکہ پر

اللہ تعالیٰ کی ایک جہت کی تکمیل کرتا ہے:

(۱) پہلی صورت میں وہ بطیب خاطر گناہ میں آلودہ ہوئے۔

(۲) دوسری صورت میں وہ باکراہ گناہ معیت و تصدیق میں آلودہ ہوں گے۔

اس طرح انواع نور یا ملک خود اپنی مرضی سے خلافت اللہ کی مسابقت سے الگ ہو گئے۔ اور

انہوں نے پورے شرح صدر کے ساتھ منصوبہ ربانی کی تکمیل میں اللہ اور اللہ کے اولیاء کے ساتھ ہو گئے۔

انواع نار

انوار نور کی طرح ہی اللہ تعالیٰ نے انواع نار میں ارتباء کا عمل جاری فرمایا۔ ایسا لگتا ہے کہ جب وہ عالم عصر اور عالم اشیاء سے گزارے گئے تو جو بات سامنے آئی وہ یہ تھی کہ ان میں بحیثیت مجموعی یا بالاکثر ”عصو“ یا نافرمانی اور فساد ہی فساد کے رجحان پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بحیثیت نوع انواع نار کو ارتباء کے عمل سے معزول کر دیا۔ اور ان کی عملی تیج کئی کا فیصلہ فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے اس تیج کئی کی ذمہ داری اسی نوع کے ایک ذمہ دار جو انواع نار میں سے ارتباء پذیر ہو کر مقرب ہو چکا تھا اور ملائکہ کے درجے پر فائز تھا کے کاندھوں پر ڈالی۔ یہ تیج کئی خود ان کے فسادات کا منطقی نتیجہ تھی۔ اس لیے کہ ان جنوں نے جو ابناء نار تھے عالم اشیاء سے ترقی کر کے عالم عصر اور پھر عالم بریہ یہاں تک کہ عالم اصل تک رجعت کیا کرتے انہوں نے عالم اشیاء کو فساد اور خون ریزی سے بھر دیا۔ چنانچہ عالم اشیاء میں ہر جانب فساد ہی فساد تھا اور خوں ریزی ہی خوں ریزی تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سی مخزن نار سے ارتباء پذیر ایک فرد کو جس کا لقب اس وقت عزائیل تھا اس کی ذمہ داری دی کہ وہ ان تمام جنوں کو یعنی ابناء نار کو جو مفسد ہیں ختم کر دے۔ عزائیل نے یہ کام ملائکہ کی مدد سے بخوبی انجام دے دیا۔ جس کے بعد اس کا لقب ابلیس ہو گیا جس کے معنی ہیں تباہ کر دینے والا۔ یہی وہ تفصیل ہے جس کا ذکر ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں حضرت عبد اللہ بن عباس کے حوالے سے کیا ہے:

”ضحاک نے حضرت عبد اللہ بن عباس سے روایت کی کہ ابلیس ملائکہ کے قبیلوں میں سے ایک قبیلے سے تھا جنہیں جن کہا جاتا ہے جن کی تخلیق نار سموم سے ہوئی ملائکہ کے مابین۔ اس کا نام حرث تھا۔ وہ جنت کے خزانوں کا ذمہ دار تھا۔ بقیہ ملائکہ نور سے بنائے گئے تھے۔ اس قبیلے کے علاوہ اور جن جن کا ذکر قرآن میں ہوا ہے کہ وہ آگ کی لپٹ سے بنائے گئے ہیں جو گویا اس کی زبان ہے جو اس کے بھڑکتے وقت اسکے اطراف میں پھیلی ہوتی ہے۔ اور انسان کچھڑ سے بنایا گیا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے جو ارض پر بے وہ جن تھے۔ انہوں نے یہاں فساد کیا اور خوں ریزی کی اور بعض نے بعض کو قتل کیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو ان کی طرف بھیجا ملائکہ کی فوج کے ساتھ اور یہ سب اسی قبیلے سے تھے جو جن تھے۔ چنانچہ ابلیس نے تمام جنوں کو قتل کر دیا۔ یہاں تک کہ ان میں سے بعض (جو بچ گئے) انہوں نے سمندروں کے (غیر آباد اور دور افتادہ) جزیروں میں

پناہ لے لی۔ اور اسی طرح جبال کے ارد گرد گئے۔

اس طرح عالم اشیاء سے انواع نار کی بڑی آبادی کا تقریباً خاتمہ ہو گیا اور وہ نوع بحیثیت نوع کے ارتقاء کے اس منصوبے سے خارج ہو گئی۔ کائنات میں پہلے کے مقابلے میں بہت تھوڑے جن باقی بچ گئے۔

ہر چند کہ اب اس کا کوئی سوال نہیں تھا کہ بحیثیت نوع جنوں میں ارتقاء کا عمل جاری رہتا۔ لیکن اسی دوران وہ واقعہ پیش آیا جس نے نہ صرف جنوں اور کائنات کی صورت حال میں انقلابی تبدیلی کر دی بلکہ پورے منصوبہ ربانی میں فیصلہ کن موڑ لادیا۔ اور یہ واقعہ تھا عزائیل کا غرور اور تکبر میں پڑ جانا جو اب ابلیس کے نام سے ملقب تھا۔ اسی صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے حضرت ابن عباس فرماتے ہیں:

چنانچہ جب ابلیس نے یہ کام انجام دے دیا تو اس نے اپنے دل میں غرور محسوس کیا۔ اور اس نے کہا کہ میں نے ایسا کام کر دیا ہے جو کوئی نہیں کر سکا۔ اللہ تعالیٰ اس کے دل کی اس بات سے مطلع ہوا اور اس نے ملائکہ کو مطلع نہیں کیا اور اللہ تعالیٰ نے ان ملائکہ سے جو اس کے ساتھ تھے فرمایا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ تو فرشتوں نے جواباً کہا کہ کیا آپ اس میں بتائیں گے جو فساد کریگا اور خون ریزی کرے گا، جیسا کہ جنوں نے فساد کیا اور خون ریزی کی۔ اور جس کے لیے ہم لوگ بھیجے گئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں اس بات کو جانتا ہوں جسے تم لوگ نہیں جانتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ابلیس کے قلب میں جو ہے اس سے واقف ہو گیا ہوں جس پر تم لوگ مطلع نہیں۔ اور وہ یہ بات کہ اس کے دل میں کبر اور غرور کی کیا صورت ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آدم کی مٹی طلب کی۔ جو اوپر لے جائی گئی اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو لیسدار مٹی سے بنایا۔ لیس دار سخت مٹی جو بدبودار کچھڑ کی طرح تھی۔ اور وہ مٹی سے بدبودار کچھڑ بنی تھی۔ کہا کہ آدم کو میں نے اس سے اپنے ہاتھوں بنایا۔ کہا کہ آدم کا یہ بنایا ہوا جسد چالیس دنوں تک پڑا رہا۔ اسی دوران ابلیس آیا اور اس نے اپنے پاؤں سے اسے ٹھوکر لگائی جس پر اس سے ٹھنکنا کی آواز آئی اور یہی ہے مطلب اللہ کے قول کا ”من صلباں کالفرار“ یعنی ایسی کھوکھلی چیز جو ٹھوس نہ ہونے کی وجہ سے خاموش نہ ہو۔ کہا پھر وہ اس کے منہ میں داخل ہوا اور اس کے پیچھے سے نکل گیا۔ اور اس کے پیچھے سے داخل ہوا اور منہ سے نکل آیا۔.....

اب اللہ تعالیٰ نے ان ملائکہ کو جو ابلیس کے ساتھ تھے اور ان کے علاوہ تھے جو

آسمانوں اور زمینوں میں تھے کہا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں۔ چنانچہ سمجھوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔ اس نے انکار کر دیا جو کبر اور غرور اس کے دل میں پیدا ہوا تھا اس سے وہ متکبر ہو گیا۔ اس نے کہا کہ میں اسے سجدہ نہیں کروں گا۔ میں اس سے بہتر ہوں۔ میں اس سے عمر میں بڑا، خلقت میں مضبوط ہوں۔ تو نے مجھے نار سے بنایا اور اسے کیچڑ سے۔ اس نے کہا کہ آگ کیچڑ سے زیادہ قوی ہے۔ چنانچہ جب ابلیس نے انکار کیا سجدہ کرنے سے تو اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے سے مایوس کر دیا اور وہ خیر سے مایوس ہو گیا پوری طرح اور وہ شیطان رجیم ہو گیا۔“ ۵

قرآن نے انواع ناریا جنوں کی اسی نافرمانی کو جواب تقریباً کلی نافرمانی پر مشتمل ہو چکی تھی اس طرح بیان فرمایا ہے:

(۱) فسجدوا لا ابلیس ابی راسمکبر۔ (البقرہ: ۳۴)

ترجمہ: پس سجدہ کیا ان سمجھوں نے مگر ابلیس اس نے انکار کر دیا اور استکبار کیا۔

(۲) لا ابلیس ابی (الحجر: ۳۱)

ترجمہ: مگر ابلیس اس نے انکار کر دیا۔

(۳) فسجدوا لا ابلیس ابی (طہ: ۱۱۶)

ترجمہ: سجدہ کیا (ملائکہ نے) مگر ابلیس اس نے انکار کر دیا۔

لیکن انواع نار کے تعلق سے قابل غور بات یہ ہے کہ وہ جنس آخر کس طرح تقریباً کلی طور پر تباہی سے دوچار ہو گئی؟ اس کے متعدد اسباب اور مخصوص تدریج ہو سکتی ہے:

(۱) سب سے قبل تو خود اس جنس نے آپس میں فساد برپا کیا اور پھر خوں ریزی کی اور اس طرح خود کو تباہ کیا۔

(۲) اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ابلیس اور ملائکہ کی فوج کے ذریعہ ان کی اکثریت کا خاتمہ کروا دیا۔

(۳) ان میں سے کچھ جن بھاگ کر چھپ گئے اور کچھ ابلیس کے ساتھ تھے اور انہوں نے نافرمانی کی۔ یہی وہ بات تھی جس کی طرف قرآن نے اس طرح اشارہ فرمایا ہے کہ بلاشبہ سب سے نمایاں ابلیس ضرور تھا نافرمانی کرنے میں لیکن وہ تنہا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ اور بھی جن شامل تھے۔ چنانچہ قرآن نے فرمایا ہے:

(۱) وکان نالفرین (البقرہ: ۳۴)

ترجمہ: اور وہ بن گیا انکار کرنے والوں میں سے

(۲) ان یکون مع الساجدین (الحجر: ۳۱)

ترجمہ: کہ وہ ہو جائے سجدہ کرنے والوں میں سے۔

(۳) وکان من الکافرین۔ (ص: ۷۴)

ترجمہ: اور وہ ہو گیا ان لوگوں میں جنہوں نے نافرمانی کی۔

اس طرح یہ سارے جن مردود اور مرجوم قرار پائے۔ چنانچہ ابلیس نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ اسے مہلت دی جائے تاکہ وہ ثابت کر دے کہ وہ درست تھا اور اللہ تعالیٰ کا فیصلہ غلط۔ چنانچہ اس درخواست کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

(۱) قال انظرنی الی یوم یبعثون۔ (الاعراف: ۱۴)

ترجمہ: اس نے کہا مجھے بعث کے دن تک مہلت دی جائے۔

(۲) قال رب فانظرنی الی یوم یبعثون۔ (الحجر: ۳۶) اور (ص: ۷۹)

ترجمہ: اس نے کہا کہ اے رب! پس تو مجھے بعث کے دن تک مہلت دے دے۔

ابلیس، الشیاطین وغیرہم کی حقیقت:

اگرچہ یہ بات فائدے سے خالی نہیں ہوتی کہ ابلیس اور الشیطان کی لغوی اور لفظی بحث سے یہاں تعارض کیا جاتا لیکن اس عاجز کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ بحث اس حصے کو طول دے دینے کا باعث ہوگی۔ اس لیے ان پر بغیر بحث کیے ان دونوں کے صرف ایک ایک معنی متعین کر کے اس تعلق سے بقیہ باتیں عرض کروں۔ ان دونوں کے لغوی معانی درج ذیل ہیں:

(۱) ابلیس - تباہ کرنے والا

(۲) شیطان - رکاوٹ ڈالنے والا۔ دور کرنے والا۔ مخالف

(۱) ابلیس: ابلیس مرکز و محور شر ہے۔ جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا کہ ابلیس — نام نہیں

بلکہ لقب ہے۔ جس کا مفہوم ہے تباہ کرنے والا — برباد کرنے والا — ابلیس جس فرد مخلوق

کا لقب ہے اس کا اس سے قبل لقب عزرائیل تھا۔ یہ دونوں ہی لقب اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے یا

ملائکہ میں مشہور معلوم ہوتے ہیں۔ ابلیس اپنی نوع کے اعتبار سے ابناء نار یا انواع نار میں سے ہے۔

اس کا اصلی نام اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ یہ بات بھی واضح کی گئی کہ ابلیس کا یہ موجودہ لقب دراصل

اس کی اس خدمت کے صلے میں دیا گیا جو اس نے نسل جن یا ابنائے نار کے مفسدوں کے کلی خاتمے

کے تعلق سے انجام دیا تھا۔ لیکن یہی کام اور اس پر دیا گیا لقب اس کے لیے بالآخر فتنہ ثابت ہوا۔ اپنی اس خدمت اور اس پر ہمت افزائی کے نتیجے میں وہ متکبر اور مغرور ہو کر سرکش ہو گیا۔ قرآن کے مطابق ابلیس اللہ کا نافرمان ضرور ہے اس لیے کہ اس نے اللہ کے حکم سے سرتابی کی۔ لیکن وہ نہ تو اس کا منکر ہے کہ اللہ کو حکم دینے کا اختیار اور حق ہے نہ وہ اس بات کا منکر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ قرآن نے ابلیس کے تعلق سے جو نقطہ نظر اور موقف پیش فرمایا ہے وہ دو باتوں پر قائم ہے:

- (۱) پہلی بات : ابی واستکبر (اس نے انکار کر دیا اور استکبار کیا)
 - (۲) دوسری بات : وکان من الکافرین (اور وہ کافروں میں سے ہو گیا)
- پہلی بات یہ کہ جب اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تو ابلیس سے دو باتوں کا صدور ہوا۔ اس کا پہلا عمل تھا۔ ابی۔ ابی کے دو معانی ہو سکتے ہیں۔ پہلا معنی یہ کہ تمام ملائکہ آدم کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے لیکن ابلیس سجدہ ریز نہیں ہوا۔ دوسرا معنی یہ کہ جب ملائکہ کو حکم دیا گیا تو مارے ملائکہ سجدہ ریز ہو گئے اور ابلیس نے کہا کہ میں آدم کو سجدہ نہیں کروں گا۔ اور اس نے سجدہ نہیں کیا۔

ابلیس کا دوسرا رد عمل تھا۔ استکبر۔ عام طور پر اس کے معانی یہ لیے جاتے ہیں: ابلیس نے تکبر کیا یا تکبر میں پڑ گیا یا تکبر کے گھمنڈ میں پڑ گیا۔ جب کہ اس کے دو مفہوم سمجھ میں آتے ہیں جو زیادہ حسب حال ہیں:

- (۱) ابلیس نے اللہ تعالیٰ سے کہا کہ وہ انہیں خلیفہ کے مقام پر فائز کریں اور ملائکہ اور آدم کو حکم دیں کہ وہ ابلیس کو سجدہ کریں۔
- (۲) یا ابلیس نے براہ راست ملائکہ اور آدم کو حکم دیا کہ وہ لوگ اسے خلیفہ تسلیم کر کے ابلیس کو سجدہ کریں۔

ظاہر ہے یہ دونوں عمل یعنی ابی اور استکبر اسے کافر بنانے کے لیے کافی تھے۔ جہاں تک ذات باری تعالیٰ کی بات ہے تو اس تعلق سے قرآن نے ابلیس کا موقف واضح طور پر بیان کر دیا ہے کہ ابلیس ذات باری تعالیٰ کو رب تسلیم کرتا ہے۔

(۱) قال رب فانظرنی الی یوم یبعثون۔ (الحجر: ۳۶)

ترجمہ: اس نے کہا اے رب! پس تو مجھے بعث کے دن تک مہلت دے۔

(۲) قال رب فانظرني إلى يوم يبعثون (ص: ۷۹)

ترجمہ: اس نے کہا اے رب! پس تو مجھے بعث کے دن تک مہلت دے دے۔

ان دونوں مقامات پر رب سے مراد اے مرے رب ہے۔

اور صرف یہی نہیں بلکہ وہ کسی صورت سے باری تعالیٰ کے اقتدار کو چیلنج نہیں کرتا بلکہ اس کی حیثیت کا ناقص ہے اور اپنے بارے میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ وہ ہر اعتبار سے اس اقتدار اعلیٰ کا مطیع ہے۔ چنانچہ مذکورہ آیتوں میں لفظ فانظرني، اسی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ یہ ایک عجیب و غریب المیہ اور انسان کے لیے آزمائش ہے کہ ابلیس کی کوششوں کا بنیادی محور انسان سے گناہ کروانا نہیں بلکہ ذات باری تعالیٰ اور اس کے اقتدار اعلیٰ کا انکار کروانا اور اپنی حیات سے حضرت باری تعالیٰ کی ایک ایک نشانی کو مٹا دینے کی ہے۔ جب کہ خود ابلیس کی پوری ذات حتیٰ کے اس کی موجودہ زندگی بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں گزر رہی ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اسے حکم دیا:

قال فاخرج منها فانك رجيم۔ (ص: ۷۷)

ترجمہ: (اللہ تعالیٰ) نے حکم دیا: نکل اس سے بے شک تو دھتکارا ہوا ہو گیا۔

لیکن اس نے اپنے کو اطاعت الہی کے دائرے سے نکلنے سے اس طرح بچا لیا کہ اس نے درخواست پیش کی رب فانظرني إلى يوم يبعثون اے میرے رب! مجھے دوبارہ اٹھائے جانے کے دن تک مہلت دی جائے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ درخواست قبول فرمائی۔ اور فرمایا:

(۱) قال فانك من المنظرين إلى يوم الوقت المعلوم۔

(الحجر: ۳۷-۳۸)

ترجمہ: (اللہ تعالیٰ نے) کہا: بیشک تو ان لوگوں میں سے ہو گیا جن کو وقت

معلوم کے دن تک مہلت دے دی گئی ہے۔

(۲) قال فانك من المنظرين إلى يوم الوقت المعلوم۔

(ص: ۸۰-۸۱)

ترجمہ: (اللہ تعالیٰ نے) کہا: بیشک تو ان لوگوں میں سے ہو گیا جن کو

وقت معلوم کے دن تک مہلت دے دی گئی ہے۔

اس نے رب تعالیٰ کے تعلق سے اپنے موقف کو مزید واضح اور مؤکد کرتے ہوئے کہا:

(۱) قال رب بما اغويتني لازينن لهم في الارض ولا غوينهم
اجمعين إلا عبادك منهم المخلصين۔ (الحجر: ۳۹-۴۰)
ترجمہ: (ابلیس نے) کہا: اے رب! جیسا آپ نے مجھے برباد کر دیا اسی
طرح میں بھی ان سب کو زمین میں لہجھادے کر برباد کر دوں گا۔
(۲) قال بعزتک لا غوينهم اجمعين الا عبادک منهم المخلصين۔
(ص: ۸۲-۸۳)

ترجمہ: (ابلیس نے) کہا: اے رب تیری عزت کی قسم! میں ضرور سب کو
برباد کر دوں گا مگر تیرے مخلص بندوں کے۔
یہاں دو امور نہایت دقیق اور غور طلب ہیں۔ پہلا — بے، اور دوسرا — اغویتنی۔
بے —

یہاں بے نہایت دقیق معنی میں استعمال ہوا ہے۔ بلکہ اگر کہا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ اس
روئے ارضی میں حیات انسانی کی ساری آزمائش اور کائنات میں جاری و ساری معرکہ خیر و شر کی
ساری گتھی اور اس کا سارا راز اسی 'بے' میں مضمر ہے۔ یہاں بے کے اندر پائی جانے والی معنویت کو
اگر کسی فقرے سے ظاہر کیا جاسکتا ہے تو وہ اس طرح ہوگا:

(۱) بے — جس بات پر

(۲) بے — جس نکتے پر

(۳) بے — جس پوائنٹ (Point) پر

معرکہ خیر و شر کے تعلق سے جس بات نے پورے منصوبہ ربانی میں غیر معمولی انقلاب
اور اتھل پتھل پیدا کر دی ہو وہ بات ایسی نہیں کہ انسان اس سے سرسری طور پر گزر جائے۔ ابلیس
جیسے صاحب علم و صاحب فہم سے یہ بات بعید تھی کہ وہ اتنے بڑے فیصلے کے خلاف خود بارگاہ
رب العزت میں اپنا استغاثہ اور مرافعہ کسی لچر اور بے وزن بات کہہ کر پیش کرے۔ اور اس کی پیش
کی گئی بات — خواہ کتنی ہی نادرست کیوں نہ ہو — لیکن وہ اتنی وزنی ضرور تھی کہ اللہ تعالیٰ نے
اس کی نادرستی اور اپنے فیصلے کی اصابت کو ثابت کرنے کے لیے حجت پوری کرنے اور اس کے لیے
حیات ارضی میں آباد کاری کی مخصوص سنت جاری فرمانے کا فیصلہ کیا۔ دراصل اس لفظ پر غور کیا
جانا ہم انسانوں کے لیے بھی بنیادی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں درک انسان کو معرکہ خیر و شر کے

سمجھنے، اپنے منصب کا ادراک کرنے اور توحید، رسالت اور آخرت کو سمجھنے میں بنیادی مدد فراہم کرتا ہے۔

اغویتنی :

دوسرا لفظ جو نہایت دقیق اور غور طلب ہے وہ ہے: — اغویتنی — اغویتنی وہ دوسرا لفظ ہے جو بما کے ساتھ مل کر کائنات کی حقیقت واضح کرتا ہے۔ اس کے اندر پائی جانے والی معنویت کو اگر کسی فقرے سے ظاہر کیا جاسکتا ہے تو وہ اس طرح ہوگا:

- (۱) اغویتنی — آپ نے میرے (بارے میں) فیصلے کو بدل دیا۔
 - (۲) اغویتنی — آپ نے میرے (بارے میں) فیصلے کو بدل دیا اور مجھے برباد کر دیا۔
 - (۳) اغویتنی — آپ نے میرے (بارے میں) فیصلے کو بدل کر مجھے برباد کر دیا۔
 - (۴) اغویتنی — آپ نے (پہلے مرحلے میں) مجھے غلط سوچنے اور کرنے کے لیے چھوڑ دیا (اور دوسرے مرحلے میں میرے بارے میں) فیصلے بدل کر مجھے برباد کر دیا ہونے دیا۔
- ”بما اغویتنی“ دراصل اس کا تقاضا کرتے ہیں کہ ہمارے سامنے وہ صورت حال اور اس کا تسلسل (Sequence) پوری طرح واضح ہو کہ آخر ابلیس کے دھتکارے جانے سے پہلے کیا ہوا تھا؟ جو ہوا وہ کیسے ہوا؟ اس کی کیا صورت اور ترتیب تھی؟ وہ کیا حالات اور اس کی نزاکتیں تھیں جن میں ابلیس نے اتنا بڑا فیصلہ کیا؟

بما اغویتنی سے کئی باتیں ظاہر ہوتی ہیں:

- (۱) ابلیس اپنے دل میں واقعی یہی سمجھتا تھا کہ وہ ”مقام عظیم“ جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اس کا وہی مستحق ہے۔

(۲) الارض میں خلافت کے قائم کیے جانے کا اعلان، اس کے بعد آدم کی عالم عصر میں تخلیق اور پھر اس کے بعد اسے سجدہ کرنے کے لیے ملائکہ کو حکم دیا جانا جس میں ابلیس بھی شامل تھا دراصل ابلیس کے لیے حیران کن، مایوس کن، اور ہولناک تھا۔ خواہ وہ ایسا کیسے جانے کا اصل سبب نہ جانتا ہو لیکن اس نے یہی قیاس کیا کہ یہ فیصلہ دراصل اس ”مقام عظیم“ جس کا وہ خود کو مستحق سمجھتا تھا اس سے معزولی کا اعلان پہلے ہے اور سجدہ کرنے کا حکم بعد میں۔ اور ایسا سمجھنے میں وہ اپنی

جگہ درست معلوم ہوتا ہے۔ یعنی یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ اس کی معزولی کا حکم پہلے تھا اور سجدہ کرنے کا بعد میں۔

(۳) لہذا لازمی طور پر کائنات میں واقع ہونے والے اتنے بڑے حادثے کی کنہ تک پہنچنے کی ضرورت اس کی پہلی ترجیح بن گئی اور اس کی ساری توجہ 'بہما' پر مرکوز ہو گئی۔ آخر وہ کیا بات ہے جس کے سبب اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ کیا؟ اس سے کیا چوک ہو گئی؟ ایسا لگتا ہے کہ اس کی نظر وہاں پڑ گئی جو اس فیصلے کا سبب ہو سکتی تھی۔ یعنی یہ کہ وہ دل میں اپنے بڑے ہونے صاحب علم، صاحب تقویٰ، اللہ کا مطیع و فرمانبردار ہونے اور اس تناظر میں اس مقام عظیم کا اپنے کو مستحق سمجھنے کے مرحلے سے گزرا ہے۔ اور یہ سبب بنا ہو اس کے معزول کیے جانے کا — ایسا لگتا ہے کہ وہ اس کا قائل ہو کہ ایسا سمجھنا غلط تھا۔ لیکن ساتھ ساتھ دو باتوں کے تعلق سے اس کی ایک خاص رائے قائم ہو گئی:

(۱) پہلی بات یہ کہ اس نے ایسا سوچا تو غلط کیا۔ لیکن وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ ایسا سوچنا غلط تو نہیں تھا۔

(۲) دوسری بات یہ کہ وہ اب تک اللہ کا مطیع و فرمانبردار اور اطاعت شعار رہا ہے اگر اس نے ایسا سوچا اور ایسا سوچنا غلط تھا تو اس کی اطاعت کے سابقہ ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے اس کا حق تھا کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنے جبر سے روک دیتا اور اسے معزول ہونے سے بچا لیتا۔ وہ اس رعایت یا جانبداری (Grace or Favour) کا مستحق تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا اور گویا اس اعتبار سے اس پر ظلم کیا گیا یا اس کے ساتھ غیر عادلانہ سلوک کیا گیا اور انسان کے ساتھ غیر معمولی حمایت (Favour) یا جانبداری کا سلوک روا رکھا گیا۔

(۱) ہر چند کہ فی الحقیقت ایسا نہیں تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے سوچا کہ ابلیس کا ایسا سوچنا حقیقتاً درست نہیں تاہم اس کے ظواہر کے اعتبار سے ابلیس ایسا سوچ سکتا ہے اور اس طرح اس کا سوچنا معتبر بھی ہے اور وزنی بھی جو اس کا تقاضا کرتا ہے کہ اس پر حجت قائم کی جائے۔

(۲) دوسرا نکتہ پہلے سے بھی زیادہ اہم تھا۔ یعنی ابلیس کا ایسا کہنا کہ وہ رعایت (Grace) اور جانبداری (Favour) کا مستحق تھا۔ لیکن اس کے ساتھ نہ رعایت کی گئی نہ جانبداری، بلکہ اس کے تمام سابقہ کردار کے باوجود اس کے برخلاف آدم کے ساتھ صریح جانبداری کی گئی۔

یہ بات بظاہر زیادہ وزنی تھی۔

یہی ہے وہ مطلب ہے جو 'بما غوثی' میں پوشیدہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ استغاثہ یا مرافعہ بارگاہ رب العزت میں اور خود اس ذات باری تعالیٰ کے خلاف دائر کی گئی۔ ہر چند کہ کسی مخلوق کا یہ حق نہیں لیکن یہ بھی اللہ کی سنت ہی ہے کہ وہ عادل حقیقی ہے۔ یہ دادرسی غلط سہی لیکن اللہ کی یہ سنت اسے سننے جانے اور اس پر حجت قائم کیے جانے کو جائز رکھتی ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی شان ربوبیت کا ایک اور ظہور فرمایا اور ایک نئی سنت جاری فرمادی۔ اور اس کے تحت ابلیس کے استغاثہ کو تین شقوں میں بانٹ کر حجت قائم کرنے کے لیے قبول فرمالیا۔

(۱) پہلی شق — ابلیس کا اپنے مطیع و فرمانبردار ہونے پر اپنے کو مستحق سمجھنا غلط تھا۔
(۲) دوسری شق — آدم کے ساتھ رعایت (Grace) کی گئی اور ابلیس کے ساتھ عدم رعایت۔

(۳) تیسری شق — آدم کے ساتھ جانبداری (Favour) کی گئی اور ابلیس کے ساتھ عدم جانبداری۔

اس نئی سنت کی وضاحت کے لیے ہم ترتیب میں تبدیلی کرتے ہوئے سب سے پہلے دوسری شق کو زیر بحث لاتے ہیں پھر تیسری اور سب سے آخر میں پہلی شق زیر بحث آئے گی۔
دوسری شق :

ہر چند کہ فی الواقع ایسا نہیں تھا لیکن محض حجت قائم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے ابلیس کے ساتھ علانیہ رعایت (Grace) کا معاملہ کیا اور کہا کہ اگر اسے یہ خیال ہے — جو اپنی جگہ غلط سہی کہ اس کے ساتھ رعایت نہیں کی گئی تو اللہ اس کے ساتھ اس معاملے میں رعایت کا اعلان کرتا ہے اور باوجود اس کے کہ اس نے حکم عدولی کی ہے اسے رعایت دیتا ہے:

قال فانك من المنظرین —

یہاں دو نکتے اہم ہیں۔

(۱) ابلیس کا اصلی جرم تو سجدہ نہ کرنا ہے۔

(۲) المنظرین — میں اجازت دیئے جانے کے بعد سے الوقت المعلوم تک کی مدت میں ابلیس کے ذریعہ کیا گیا عمل اس کے لیے 'فرد جرم' میں شامل نہیں۔

چنانچہ ایک کے بجائے اللہ تعالیٰ نے اسے دو رعایتوں (Grace) سے نوازا۔ یعنی پہلی رعایت یہ کہ حکم عدولی کے فوراً بعد اسے سزا نہیں دی۔ فاخرج (نکل جاؤ) اور فاکم رجیم (پس تو مردود قرار دے دیا گیا) سزا نہیں یہ تو صرف ناراضگی ہے۔ دوسری رعایت یہ کہ المنظرین سے الوقت المعلوم تک کی پوری مدت گویا "چھوٹ" میں داخل ہے۔ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ احادیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ابلیس کئی بار آنحضور ﷺ کی گرفت میں آیا اور آپ اس پر قادر تھے کہ اس کو ہلاک کر دیتے لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔

تیسری شق :

تیسری شق کے تعلق سے اللہ تعالیٰ نے حجت اس طرح قائم کی کہ جس آدم کے تعلق سے جانبداری کا الزام لگایا گیا تھا اس کے ساتھ عدم جانبداری اور ابلیس کے ساتھ جانبداری کی سنت جاری فرمائی۔ اور وہ سنت درج ذیل طریقے سے رو بہ عمل لائی گئی:

(۱) آدم کو زمین پر بھیج کر۔ چنانچہ:

(۱) حدیث: حجت النار بالشہوات و حجت الجنة بالمکلوہ

(متفق علیہ الا عند مسلم حفت بدل حجت)

ترجمہ: جہنم شہوات سے چھپادی گئی اور جنت تکلیف دہ، مشکل، ناپسندیدہ اور

گرامی چیزوں سے (متفق علیہ سوائے مسلم کے جس نے چھپادی گئی ہے کے بجائے

ڈھانپ دی گئی ہے لکھا ہے)

(۲) حدیث: الدنيا سجن للمومن وجنت الکافر (رداء مسلم)

ترجمہ: دنیا مومن کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے جنت ہے۔

(الف) زمین پر اہل حق اور معرکہ حق کی پوری تاریخ اس بات کا ثبوت پیش کرتی ہے کہ

اہل حق حزب اللہ ہوتے ہوئے بھی ہمیشہ مفلس، تنگ دست، مظلوم، اذیت دیئے گئے اور بے

چارگی کی حالت میں رہے۔ اور اہل باطل حزب الشیطان ہوتے ہوئے بھی ہمیشہ خوشحال، ظلم پر قادر

اور اذیت دینے والے اور آزاد اور بظاہر بے مہار رہے۔ یہی وہ بات ہے جس کی طرف حضرت

موسیٰ علیہ السلام کی جانب سے سورہ یونس میں اشارہ کیا گیا ہے:

وقال موسى ربنا انك آتيت فرعون وملائه زينة واموالا في
الحياة الدنيا ربنا ليضلوا عن سبيلك ربنا اطمس على اموالهم واشدد
على قلوبهم فلا يؤمنوا حتى يروا العذاب الاليم.

ترجمہ: اور موسیٰ نے دعا کی ”اے ہمارے رب تو نے فرعون اور اس کے
سرदारوں کو دنیا کی زندگی میں زینت اور اموال سے نواز رکھا ہے۔ اے رب کیا یہ اس
لیے ہے کہ وہ لوگوں کو تیری راہ سے بھٹکائیں؟ اے رب ان کے مال کو بے اثر کر دے
اور ان کے دلوں پر سختی کر دے کہ ایمان نہ لائیں جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔“

یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ ایک طرف ایک برگزیدہ اور اولوالعزم رسول اور نبی نے
اپنے اللہ تعالیٰ سے ایک ایسی دعا کی جو ہر چند کہ صرف اللہ کی رضا اور اس کی سر بلندی کے لیے تھی
اور اس میں ذرہ برابر بھی کوئی اور جذبہ پوشیدہ نہ تھا لیکن وہ دعا اس روئے زمین پر معرکہ خیر و شر
کے بنیادی ربانی ضابطوں سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دعا کی مقصدیت کو
اجابت نصیب فرمائی لیکن دعا کے ظاہر کو قبول نہیں فرمایا اور صرف یہی نہیں بلکہ اس پر اپنے
دونوں اولوالعزم انبیاء کو خصوصی ہدایت دی کہ وہ کوئی ایسا کام نہ کریں جو منصوبہ ربانی کے مطابق
نہ ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جواباً فرمایا:

قال قد اجيب دعوتكما فاستقيما ولا تتبعان سبيل الذين لا
يعلمون (يونس: ۸۹)

ترجمہ: (اللہ تعالیٰ نے جواب میں) فرمایا: تم دونوں کی دعا قبول کی گئی۔
ثابت قدم رہو اور ان لوگوں کے طریقے کی ہر گز پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔

چنانچہ بعد میں جو نتائج برآمد ہوئے وہ یہ نہیں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کے مال چھین
لیے اور انہیں کنگال کر دیا اور اس کی فوج اور اس کے اسلحے مالی تنگی کے سبب بے اثر ہو گئے بلکہ دعا کی
قبولیت دوسری طرح سے ظاہر ہوئی اور وہ یہ کہ وہ اور اس کی فوج اپنی پوری قوت قاہرہ سے پیچھا
کرتے ہوئے نہیں بیچ سمندر میں غرق ہو گئے۔ یہاں لطیف بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نہ ان دونوں
کے متعلق سبیل المفسدین کہانہ سبیل الظالمین کہانہ سبیل الذین ظلموا وغیرہ کہا بلکہ
فرمایا سبیل الذین لا يعلمون۔ اس سے بہتر خیر خواہانہ اور مشفقانہ تنبیہ اور کیا ہو سکتی تھی؟

(ب) دنیا کی معلوم تاریخ کے جو کم از کم دس ہزار سالوں پر محیط ہے جس کی کچھ نہ کچھ تفصیل ضرور دستیاب ہے مطالعے سے جو بات ثابت ہوتی ہے اس کی کفہ کو ظاہر کرنے کے لیے اسے درج ذیل دو طریقوں سے بیان کیا جاسکتا ہے:

(۱) اگر روئے زمین کی تاریخ ایک لق و دق صحرا مان لی جائے تو اس میں باطل اور اللہ کے باغی اور ابلیس کے پیروکاروں اور ان کا نظام سینکڑوں میل پر پھیلے بے آب و گیاہ صحرا کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ اور ان میں آنے والے انبیاء اور بطور خاص اولوالعزم انبیاء جو نظام شر کو شکست دے کر حق قائم کرنے والے ہوئے سینکڑوں میلوں کے بے آب و گیاہ صحرا کے بعد دو چار میل پر پھیلے نخلستان کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ یعنی سینکڑوں میل تک پھیلے بے آب و گیاہ صحرا کے بعد صرف چند میلوں کے نخلستان جہاں پانی اور سرسبزی ہو۔ اور پھر سینکڑوں میلوں پر پھیلی تپتی دھوپ اور گرم ریت کے تھمیزے۔

(۲) اگر روئے زمین کی تاریخ کو حکومت مان لیا جائے تو اس میں سینکڑوں سالوں پر پھیلی باطل کی وحشیانہ اور آمرانہ حکومت جہاں انبیاء اور اہل حق حزب مخالف شمار ہو کر غیر قانونی اور باغی اور مستحق اذیت قرار پائے اور سینکڑوں سالوں کے بعد چند مہینوں اور چند سالوں پر محیط اولوالعزم انبیاء کی عادلانہ حکومت جو تھوڑی ہی مدت کے بعد ختم ہو جائے اور پھر سینکڑوں سالوں پر پھیلنے والا وحشیانہ اور آمرانہ حکومت کا دور۔

در اصل اس کی کہنہ یہی وہ سنت ہے جو اللہ تعالیٰ نے ابلیس پر اس کے اس اعتراض پر اپنی حجت قائم کرنے کے لیے جاری فرمائی ہے جس میں ابلیس نے الزام لگایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کے ساتھ جانبداری کی ہے اور ابلیس کے ساتھ عدم جانبداری۔ زمین پر اللہ تعالیٰ نے پوری تاریخ میں ثابت کر دیا کہ اس نے مال، متاع، طاقت، قوت، جبر یا صلاحیت ہر اعتبار سے ابلیس اور اس کے متبعین کو سب کچھ دیا اور اپنے لوگوں کو اس لق و دق صحرا میں ان کے یقین اور ایمان پر چھوڑ دیا۔

(۲) ابلیس کو اس دنیا میں کچھ بھی کرنے کے لیے مکمل آزادی دے کر:

حیات ارضی میں انسان کی مدت حیات میں اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو پوری آزادی اور وسائل دیئے کہ وہ جس طرح چاہے اس سے انسان سے اپنے مقاصد پورا کرنے کے لیے معاملہ کرے۔

پہلی شق :

ابلیس کا پہلا اعتراض یہی تھا کہ اس نے ہمیشہ اللہ کی فرمانبرداری کی، اللہ تعالیٰ کے لیے اپنے کو وقف کر دیا اس کے لیے سارے کام کیے یہاں تک کہ خود ملائکہ کی فوج لے کر اللہ کے حکم سے اپنی نوعِ انسانی ابناءِ نار کی اکثریت کا جو مفسدین تھے صفایا کر دیا لہذا وہ — بلکہ صرف وہی — اس کا مستحق تھا کہ اسے وہ مقامِ عظیم دیا جاتا۔ ابلیس کا خیال تھا کہ اسے اس کا استحقاق تھا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کے نزدیک کسی بندے کی یہ شانِ عبدیت نہیں کہ وہ استحقاق کا دعویٰ کرے۔ شانِ عبدیت کی انتہا یہ ہے کہ اس کے دل اور لب پر یہ بات ہو:

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس پر اسی بنیادی حجت کو پورا کرنے کے لیے آدم کے لیے منصوبہٴ حیاتِ ارضی جاری فرمایا۔ چنانچہ اس روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کے انبیاء نے اسی کو ثابت کر دیا۔ اور اللہ کے اولوالعزم انبیاء نے تو وہ مثال قائم کر دی جو انسان ہی نہیں ساری مخلوقات کے لیے سرمایہٴ حیات ہے۔ اور وہ غیر معمولی اسوہ جو ان انبیاء کرام نے قائم فرمایا یہ تھا: ”اپنی جان اپنا مال اپنی زندگی کی ہر چیز اللہ کی رضا کے لیے قربان کر دینا اور اس کے بعد بھی یہی اظہار کہ اے اللہ آپ کا حق ادا نہ ہو سکا۔ ہم اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرتے ہیں۔ ہمیں معاف فرما دیجئے۔“

(۱) حضرت ابراہیم علیہ السلام :

(۱) وَاذْهَبْ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبِّهِ بِكَلِمَاتِ فَاتِمَةٍ (البقرہ: ۱۲۴)

ترجمہ: اور جب ابراہیم کے رب نے اسے کلمات سے آزمایا تو اس نے انہیں

پورا کر دیا۔

(۲) فَلَمَّا اسْلَمَا وَلْتَةً لِلْجَبِينِ وَنَادَيْنَاهُ أَنْ يَا إِبْرَاهِيمُ قَدْ صَدَّقْتَ

الرُّوبَا إِنَّ كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ وَفَدَيْنَاهُ

بِذَبْحٍ عَظِيمٍ (الصافات: ۱۰۳-۱۰۷)

ترجمہ: پس جب (ابراہیم اور اسمعیل) دونوں نے اس حکم کو سربرمان لیا

اور اس (ابراہیم) نے اس (اسمعیل) کو چہرے کے بل لٹا دیا (یعنی ذبح کر دیا) تو ہم نے

آواز دی: اے ابراہیم بے شک تم نے روبا کے حکم کو پورا کر دیا بے شک ہم انہیں جزا

دیتے ہیں جو صرف میرے لیے سب کچھ کر ڈالیں۔ بے شک یہی وہ کھلی آزمائش

تھی۔ اور دیکھ ہم نے اس ذبح عظیم کو فدیہ کر دیا۔

(۳) واذ يرفع ابراهيم للقواعد من البيت واسماعيل ربنا تقبل منا
انك انت السميع العليم ربنا واجعلنا مسلمين لك ومن ذريتنا امة مسلمة لك
وارنا مناسكنا وتب علينا انك انت التواب الرحيم (البقرہ: ۱۲۷-۱۲۸)
ترجمہ: اور یاد کرو جب اٹھارہ تھے ابراہیم بنیادیں البیت کی اور اسماعیل
(تو ان دونوں نے دعا کی تھی) اے ہمارے رب! قبول کر ہم سے۔ بے شک تو ہی سننے
والا جاننے والا ہے۔ اے ہمارے رب! اور کر ہم کو حکم بردار اپنا اور ہماری اولاد میں بھی
کر ایک جماعت فرمانبردار اپنی اور بتا ہم کو مناسک ہمارے اور ہم کو معاف کر دے۔ بے
شک آپ توبہ قبول کرنے والے اور مہربان ہیں۔

(۴) واذ قال له ربه اسلم قال اسلمت لرب العالمين (البقرہ: ۱۳۱)
ترجمہ: اور یاد کرو جب اس کو کہا اس کے رب نے کہ حکم برداری کر تو بولا کہ
میں حکم بردار ہوں تمام عالم کے پروردگار کا۔

(۲) حضرت عیسیٰ علیہ السلام:

(۱) واذ قال الله يا عيسى ابن مريم ، انت قلت للناس
اتخذوني وامى الهين من دون الله قال سبحنك ما يكون لى ان اقول ما
ليس لى بحق ان كنت قلته فقد علمته تعلم ما فى نفسى ولا اعلم ما فى
نفسك انك انت علام الغيوب. ما قلت لهم الا ما امرتنى به ان اعبدوا
الله ربى وربكم وكنتم عليهم شهيذاً مادمت فيهم فلما توفيتنى كنت
انت الرقيب عليهم وانت على كل شئ شهيد. (المائدہ: ۱۱۶-۱۱۷)

ترجمہ: اور جب کہے گا اللہ اے عیسیٰ مریم کے بیٹے! تو نے کہا لوگوں کو کہ
ٹھہراؤ مجھ کو اور میری ماں کو دو معبود سوا اللہ کے۔ کہا تو پاک ہے مجھ کو لائق نہیں کہ
کہوں ایسی بات جس کا مجھ کو حق نہیں اگر میں نے یہ کہا ہو گا تو تجھ کو ضرور معلوم ہو گا تو
جاننا ہے جو میرے جی میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے جی میں ہے۔ بے شک تو ہی
ہے، جاننے والا چھپی باتوں کا۔ میں نے کچھ نہیں کہا ان کو مگر جو تو نے حکم دیا کہ بندگی کرو
اللہ کی جو رب ہے میرا اور تمہارا اور میں ان سے خبردار تھا جب تک ان میں رہا پھر جب
تو نے مجھ پر اپنی قدرت دکھائی تو تو ہی تھا خبر رکھنے والا ان کی اور تو ہر چیز سے خبردار ہے۔

(۲) ان تعذبهم فانهم عبادك وان تغفر لهم انك فانت العزيز
الحكيم (المائدہ: ۱۱۸)

ترجمہ: اگر تو ان کو عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو ان کو معاف کر دے تو تو ہی ہے زبردست حکمت والا۔

(۳) حضرت محمد ﷺ :

(۱) اللہم الیک اشکو ضعف قوتی وقلة حیلتي وهو انی علی الناس یا ارحم الراحمین انت رب المستضعفین وانت ربی، الی من تکلنی؟ الی بعید یتجهمني؟ أم إلی عدو ملکته أمری؟ ان لم یکن بک علی غضب فلا ابالی ولكن عافیتک ہی أوسع لی، اعوذ بنور وجهک الذی اشرقت له الظلمات صلح علیه امری الدنیا والآخرة من أن تنزل بی غضبک أویحل علی سخطک لک العتبی حتی ترضی ولا حول ولا قوة الا بک۔ (السيرة النبوية لابن هشام)

ترجمہ: اے اللہ! میں تجھ سے ہی اپنی طاقت کی کمزوری اپنے تصرف کی قوت کی کمی اور لوگوں کے سامنے اپنی بے وقعتی کی فریاد کرتا ہوں۔ اے سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والے! آپ کمزور بنادیئے جانے والوں کے رب ہیں۔ آپ میرے رب ہیں۔ آپ نے مجھے کس کے حوالے کر دیا؟ کس غیر کے جو مجھ پر تیوریاں چڑھائے رکھتا ہے؟ یا کسی دشمن کے جس کو مجھ پر قابو مل گیا ہو؟ اگر آپ کی مجھ پر ناراضگی نہیں تو مجھے کسی بات کی پروا نہیں۔ ہر صورت حال میں بھی آپ کی عافیت میرے لیے وسیع ہے۔ میں تیرے چہرے کے نور سے جس سے تاریکیاں منور ہو جاتی ہیں پناہ طلب کرتا ہوں جس سے دنیا اور آخرت کے امر سنور جاتے ہیں۔ میں اس سے پناہ چاہتا ہوں کہ میرے اوپر آپ کا غضب اترے یا مجھ پر آپ کی ناپسندیدگی واجب ہو جائے۔ میرے لیے آپ کا عتاب ہی ہے جب تک آپ راضی نہ ہو جائیں اور کوئی طاقت ہے نہ قوت مگر آپ کی۔

(۲) عن ابی ہریرہ قال قال رسول اللہ ﷺ واللہ انی لاستغفر

اللہ واتوب الیہ فی الیوم اکثر من سبعین مرة۔ (رواہ البخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: فرمایا رسول اللہ ﷺ

نے: اللہ کی قسم! میں دن بھر میں ستر بار سے زائد اللہ تعالیٰ سے استغفار اور توبہ کی دعا کرتا ہوں۔

(۳) عن ابی ہریرہ قال قال رسول اللہ ﷺ والذی نفسی

بیده لو لم تذنبوا لذهب اللہ بکم ولجا بقوم یذنبون فیستغفرون اللہ

انیغفرلہم (رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں: فرمایا رسول اللہ ﷺ نے: اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر تم لوگوں نے گناہ نہ کئے ہوتے تو اللہ تمہیں ہٹا کر دوسری قوم کو لے آتا جو گناہ کرتی اور اللہ سے استغفار کرتی اور اللہ ان کو معاف کرتا۔

(۴) عن شداد بن اوس قال قال رسول اللہ ﷺ سید الاستغفار ان تقول اللهم انت ربی لا اله الا انت خلقتنی وانا عبدک وانا علی عهدک ووعدک ما استطعت اعوذ بک من شرما صنعت ابوء لك بنعمتك علی وابوء بذنبي فاغفر لی فإنه لا یغفر الذنوب الا انت..... (رواہ البخاری)

ترجمہ: حضرت شداد بن اوس روایت کرتے ہیں: فرمایا رسول اللہ ﷺ نے: سید الاستغفار یہ ہے کہ تم کہو: اللهم انت ربی لا اله الا انت خلقتنی..... (۵) عن عائشہ رضی اللہ عنہا قالت: کان رسول اللہ ﷺ یكثر ان یقول قبل موته: سبحان اللہ وبحمدہ، استغفر اللہ واتوب الیہ۔ (متفق علیہ)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت کرتی ہیں: آپ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ اپنی وفات سے قبل اکثر کہا کرتے تھے: سبحان اللہ وبحمدہ، استغفر اللہ واتوب الیہ۔

(۶) قال الہیثمی عن عائشہ رضی اللہ عنہا: قال فکان رسول اللہ ﷺ بعد ذلک لا یاکل مکتئاً یقول: آکل کما یاکل العبد وایجلس کما یجلس العبد ()

ترجمہ: حضرت ہیشمی عن عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں: کہا کہ رسول اللہ ﷺ اس کے بعد نہیں کھاتے تھے ٹیک لگا کر: وہ فرمایا کرتے تھے: میں اس طرح کھاتا ہوں جیسے کوئی غلام کھاتا ہے۔ اور میں اسی طرح بیٹھتا ہوں جیسے کوئی غلام بیٹھتا ہے۔

(۷) عن ابن مسعود ان رسول اللہ ﷺ قال من کثر همہ نلیقل اللہ انی عبدک وابن عبدک وابن امتک وفي قبضتک ناصیتی بیدک انی حکمک عدل فی قضاوک استئک بکل اسم هولک..... (رواہ رزین)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
جس کو پریشانیوں کی کثرت ہو وہ کہے (یعنی اس طرح دعا کرے): اے اللہ میں آپ
کا غلام ہوں۔ اور آپ کے غلام کا بیٹا ہوں اور آپ کی لونڈی کا بیٹا ہوں اور تیری مٹھی
میں میری پیشانی کے بال ہیں۔ تیرے حکم سے ہر کچھ ہوتا ہے۔ تیرے فیصلے میں عدل
ہے مگر تیرے تمام ناموں سے جو تیرے ہیں تجھ سے طلب کرتا ہوں.....

چنانچہ رائے زمین پر اللہ کے انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین نے یہی بات ثابت کی
ہے۔ ان کی پوری زندگی دو باتوں سے عبارت ہے:

(۱) پہلی بات یہ کہ یہ تمام اشخاص محسنین رہے اور صرف اور صرف اللہ کی جانب متوجہ
رہے اور ان کا شیوہ رہا: ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب الغلمین۔
ترجمہ: اے اللہ بیشک میری نماز، میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا اللہ رب العالمین
کے لیے ہیں۔

(۲) دوسری بات یہ کہ سارے اشخاص اس بات کا اقرار کرنے والے رہے کہ اے اللہ ہم
آپ کا، آپ کے احکامات کا اور اس کے تقاضوں کا حق ادا کرنے سے قاصر رہے ہم اپنی کوتاہیوں
کے لیے آپ سے، مغفرت طلب کرتے ہیں۔ ہمیں آپ معاف کر دیجئے۔

یہ عمل حضرت آدم علیہ السلام سے بلا فصل جاری رہا۔ یہاں تک کہ زمین پر اللہ تعالیٰ نے
اپنے آخری نبی اور رسول اور نبی آخر الزماں آنحضور ﷺ کو مبعوث فرمایا اور آپ نے نہ صرف اپنی
بعثت کا مشن پورا کیا بلکہ اس روئے ارض پر رسالت کے کل مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ چنانچہ
جب اس روئے ارض پر جاری معرکہ حق و باطل میں وہ آخری مرحلہ شروع ہوا جب نفس رسالت
اپنے مشن کے واقعی (Virtual) تکمیل کے آخری مرحلے میں قدم رکھنے لگی اور روئے زمین پر
حق کے لیے آخری ہجرت ہو رہی تھی تو اللہ تعالیٰ نے اس کا آغاز اس ادب آموزی سے کیا:

فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ

وَاللَّهُ يَعْلَمُ مُتَقَلِّبَكُمْ وَمُتَوَكِّمًا (محمد: ۱۹)

ترجمہ: سوائے رسول! آپ جان لیجئے کہ کسی کی بندگی نہیں سوائے اللہ کے
اور معافی طلب کیجئے اپنے گناہ کی اور اہل ایمان مردوں اور عورتوں کے گناہوں کی
اور اللہ خوب جانتا ہے چلت پھرت تم سب کی اور یہ کہ تم سب کو کہاں ٹھکانہ ہے۔

اور روئے ارض پر نفس رسالت کا مشن اپنے پایہ تکمیل کو پہنچ گیا اور اس کی تکمیل ہو گئی اور زمین پر اللہ کی حجت ابلیس پر ہر طرح سے قائم ہو گئی تو پھر اس ادب آموزی کی تکرار ہوئی۔ واضح ہو کہ یہ تکرار اس وقت ہوئی جب باضابطہ مشن کے کماحقہ پورا ہونے کی تصدیق خود باری تعالیٰ نے کر دی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

(۱) انا فتحنا لك فتحاً مبيناً. (الفتح : ۱)

ترجمہ: بے شک ہم نے فیصلہ کر دیا آپ کے لیے کھلا فیصلہ۔

(۲) اليوم ينس الذين كفروا من دينكم فلا تخشوهم واخشون

(المائدہ: ۲)

ترجمہ: آج مایوس ہو گئے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تمہارے دین سے سوان

سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو۔

(۳) اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتي ورضيت

لكم الاسلام ديناً. (المائدہ: ۳)

ترجمہ: آج میں پورا کر چکا تمہارے لیے دین تمہارا اور پورا کیا تم پر میں نے

احسان اپنا اور پسند کیا میں نے تمہارے واسطے اسلام کو دین۔

اور اسی طرح یہ بھی ایک ادب آموزی ہی تھی:

اذا جله نصر الله والفتح ورايت الناس يدخلون في دين الله

افواجاً. فسبح بحمديك واستغفره انه كان تواباً. (النصر)

ترجمہ: جب اللہ کی مدد (نصر اللہ) اور فتح پہنچ جائے اور آپ دیکھیں لوگوں

کو کہ وہ اللہ کے دین (دین اللہ) میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں تو آپ پاکی بیان

کریں اپنے رب کی اور استغفار کریں اس سے۔ بے شک وہ معاف کرنے والا ہے۔

(۲) الشیطان :

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ شطن کے معانی ہیں رکاوٹ ڈالنا، دور کرنا، اور اسی سے شیطان

مشتق ہے جس کے لغوی معنی رکاوٹ ڈالنے والا اور دور ہٹانے والا ہے اور اصطلاحی معنی خیر کا

مخالف۔ یہ دونوں معنوں میں رائج ہے۔ پہلے معنی میں یہ ابلیس کا موجودہ لقب ہے۔ یعنی الشیطان

اور دوسرے معنی میں یہ ان تمام مخلوقات کے لیے بولا جاتا ہے خواہ ان کا تعلق انواع نور سے ہو یا

انواع نار سے یا انواع ارض سے جو انسانوں کو باری تعالیٰ اور خیر کے قریب آنے سے روکیں یا ان

سے دور کر دیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ عزائیل اور ابلیس دونوں ہی ایک مخصوص جن یا بنی نار کے فرد کے القاب ہیں۔ اس کا اصلی یا ذاتی نام صرف اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے۔ پہلے اس جن یا بنی نار کے فرد کا لقب عزائیل تھا۔ جب اس نے اللہ کے حکم اور دیگر ملائکہ کی مدد سے مفسد جنوں کا خاتمہ کر دیا تو اس کا لقب ابلیس دیا گیا۔ الشیطان اس کا تیسرا لقب ہے جو ابلیس کے بعد دیا گیا۔ یہ ایک نہایت دقیق نکتہ ہے جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے۔

جس وقت خلافت آدم کا اعلان اور سجدہ آدم کا حکم ہوا اس وقت تک یہ جن ابلیس کے لقب سے موسوم تھا جو اس کے پہلے عمل سے متعلق تھا۔ آدم کو سجدہ کرنے سے انکار اور اپنی خلافت ارضی کا مطالبہ کرنے کے بعد جب اسے مہلت دے دی گئی اور اس نے تزکیہ اور اغواء کا عمل شروع کر دیا تو اس کو اللہ تعالیٰ نے الشیطان کا لقب دیا۔

چنانچہ اس تبدیلی اور اس کے موقع و محل کی طرف بڑا ہی لطیف اشارہ قرآن نے کیا ہے: البقرہ آیت: ۳۴ میں اللہ تعالیٰ نے اس جن کو جب کہ اس نے انکار اور استکبار نہیں کیا تھا ابلیس کہہ کر پکارا ہے۔ جو فی الواقع اس وقت تک اس کا لقب تھا لیکن اس کے معا بعد آیت: ۳۶ میں اس کا ذکر اس طرح کیا گیا:

فازلہما الشیطان عنہا فاخرجہما مما کانا فیہ۔ (البقرہ: ۳۶)

ترجمہ: پس ہلا دیا ان دونوں کو شیطان نے وہاں سے اور نکال باہر کیا جہاں وہ دونوں تھے

وہاں سے۔

چنانچہ ابلیس کا موجودہ لقب الشیطان ہے جو مکمل طور پر "الشیطان الرجیم" کہا جاتا ہے۔ ابلیس کا لقب قرآن میں کم و بیش گیارہ بار اور الشیطان اڑسٹھ بار استعمال کیا گیا۔ اور یہی وہ شخص ہے جس کا ذکر "اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم" میں کیا گیا ہے۔ یہی وہ شخص ہے جس کو قرآن نے "عدو اللہ اور انسان کے لیے 'عدو مبین' کہا ہے۔ یہی الشیطان موجود حیات میں قواۓ شر کا قلب ہے۔ اس لیے اس حیات یعنی عالم عصر میں اللہ تعالیٰ نے اس کے تعلق سے انسان کو اپنے بنیادی موقف سے آگاہ کیا جو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

ان الشیطان لکم عدو فلتخذوہ عدوا۔ (الفاطر: ۶)

ترجمہ: بے شک شیطان تم لوگوں کا دشمن ہے پس تم لوگ بھی اسے دشمن بنالو۔
یہی لفظ شیطان عام معنی میں ان تمام لوگوں کے لیے بولا جاتا ہے جو خیر سے روکیں یا باری
تعالیٰ سے لوگوں کو دور کریں۔

(۳) الشیاطین :

قرآن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فرد جو ملائکہ میں سے تھا اور جس نے اپنی
خلافت کا مطالبہ کیا تھا وہ بلاشبہ ابلیس تھا لیکن وہ اکیلا شخص نہیں تھا جو اس خیال کا حامل ہو۔ ممکن
ہے اس وقت غیر ملائکہ جنوں کی ایک تعداد اس کے ساتھ ہو گئی ہو۔ یا بعد میں ابناء نور، ابناء نار
اور ابناء ارض کی ایک بڑی تعداد اس کے ساتھ ہو گئی ہو۔ اور اس طرح وہ کبھی مردود قرار دیے
گئے ہوں۔ یہی سبب ہے کہ قرآن نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے:

(۱) وکان من الکافرین (البقرہ: ۳۴)

ترجمہ: اور ہو گیا وہ ان میں جنہوں نے نافرمانی کی۔

(۲) ولقد جعلنا فی السماء بروجاً وزیننا للنظرین وحفظناها

من کل شیطن رجیم۔ (الحجر: ۱۷)

ترجمہ: اور تحقیق ہم نے بنائے ہیں آسمان میں قلعے اور اس کو سجایا ہے ان کو

دیکھنے والوں کے لیے۔ اور محفوظ رکھا ہے ہم نے اس کو ہر شیطان مردود سے۔

چنانچہ یہ تمام لوگ اب شیاطین کہلاتے ہیں۔ ان کی موجودہ صورت حال اور معرکہ
خیر و شر کی وضاحت اور اسکی آنے والی تفصیلات و نزاکتوں کے لیے ضروری ہے کہ ان کی مختصر
تشریح کر دی جائے۔

(الف) طائف من الشیطان :

شیاطین کا یہ ایک مخصوص گروہ ہے جس میں نظم پایا جاتا ہے۔ اور یہ اجتماعی منصوبہ بندی
میں شامل ہیں تاکہ ابلیس کے مشن کو کامیاب کریں۔ اس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورہ اعراف میں
اس طرح فرمایا ہے:

ان الذین اتقوا اذا مسهم طائف من الشیطان تذکروا فاذا هم

مبصرون۔ (اعراف: ۲۰۱)

ترجمہ: جن کے دل میں ڈر ہے جہاں پڑ گیا ان پر شیطان کا گزر چونک گئے پھر

اسی وقت ان کو سوجھ آ جاتی ہے۔
ممکن ہے یہ ابلیس کی مجلس شوریٰ ہو۔

(ب) الشیاطین الرجیم :

ایسے 'شیاطین جو مردود ہوں' کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں:

(۱) پہلا مفہوم: وہ خاص الخاص ملائکہ اور غیر ملائکہ کے گروہ جو واقعہ سجدہ آدم کے وقت موجود ہوں (اور جو ظاہر ہے یا تو ابناء نور یعنی ملک سے ہوں گے یا ابناء نار سے یعنی جن سے) اور ابلیس کے ساتھ ساتھ انہیں بھی مردود قرار دیا گیا ہو۔

(۲) دوسرا مفہوم: وہ خاص شیاطین جو اتباع ابلیس میں اتنے آگے بڑھ گئے ہوں کہ ان کا شمار بطور خاص کیا گیا ہو قطع نظر اس کے کہ وہ اس وقت موجود ہوں جب واقعہ سجدہ آدم ہوا یا اس کے بعد پیدا ہوئے یا شیاطین میں شمار ہوئے۔

قرآن نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے:

وحفظنہا من کل شیطان رجیم۔ (الحجر: ۱۷)

ترجمہ: اور محفوظ رکھا ہم نے اس کو ہر شیطان مردود سے۔

(ج) ذریۃ الشیطان :

قرآن کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابلیس کی اولاد ہیں۔ یہاں دونوں صورت ممکن ہے یا تو ابلیس کے صرف ایک بیٹا یا بیٹی ہے یا ایک سے زائد بیٹے بیٹیاں ہیں۔ یہاں ذریۃ سے کم از کم ایک بات واضح ہے کہ اس میں ابلیس کی معنوی اولاد کا شمار نہیں بلکہ وہ اولاد شامل ہے جو گویا صلبی ہے۔ قرآن نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے:

واذقلنا للملائکۃ اسجدوا لآدم فسجدوا إلا ابلیس کان من

الجن ففسق عن امر ربہ افتتخذونہ وذریۃ اولیاء من دونی وہم لکم

عدو بئس للظالمین بدلاً۔ (الکہف: ۵۰)

ترجمہ: اور جب کہا ہم نے ملائکہ کو سجدہ کر آدم کو تو سجدہ میں گر پڑے مگر

ابلیس۔ تھا جن کی قسم ہے۔ سو نکل بھاگا اپنے رب کے حکم سے سو کیا اب تم ٹھیراتے ہو

اس کو اور اس کی اولاد کو رفیق میرے سوائے اور وہ تمہارے دشمن ہیں۔ برا ہاتھ لگا

ظالموں کے بدلہ۔

(د) قبيلة الشيطان :

قرآن کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابلیس کے گھرانے کے لوگ ہیں۔ (اس کی کچھ تفصیل ان شاء اللہ بعد میں آئے گی) یعنی ابناء نار میں سے وہ قبیلہ جس سے خود ابلیس تھا اس کے وہ لوگ جو اس عذاب سے بچ گئے اور پھر بعد میں جو غیر ملائکہ ہونے کے باوجود ابلیس کے موقف کے حمایتی ہو گئے۔ چنانچہ یہ تمام لوگ اس کا قبیلہ کہلائے خواہ اس میں وہ لوگ ہوں جو اس وقت سے موجود ہوں یا وہ لوگ ہوں جو بعد میں ان کی اولاد ہوئے۔ قرآن نے ان کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

يٰۤاٰدَمُ لَا يَفْتِنَنَّكَ الشَّيْطَانُ كَمَا اَخْرَجَ اٰبَوَيْكَ مِنَ الْجَنَّةِ

يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْءَ تَعْمَالِهِمْ اِنَّهٗ يَرٰكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَٰهُمْ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيَاطِيْنَ اَوْلِيَاءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ۔ (الاعراف: ۲۷)

ترجمہ: اے اولاد آدم فتنہ میں نہ ڈالے تم کو شیطان جیسا کہ اس نے نکال دیا

تمہارے ماں باپ کو بہشت سے۔ اتروائے ان سے ان کی پوشیدگی تاکہ ظاہر کروادے

ان کے جسم۔ وہ دیکھتا ہے تم کو اور اس کا قبیلہ جہاں سے تم ان کو نہیں دیکھتے۔ ہم نے کر دیا

شیطانوں کو رفیق اور ان لوگوں کو جو ایمان نہیں رکھتے۔

(ه) جنود ابلیس :

قرآن کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس نے ایک فوج ترتیب دے رکھی ہے۔ (اس کی تفصیلات بھی ان شاء اللہ بعد میں آئیں گی) ظاہر ہے یہ فوج ہر طرح کی مخلوقات پر مشتمل ہو سکتی ہے۔ لیکن یہاں ان سے ابناء ارض یعنی انسانوں کے علاوہ مخلوقات جس میں بطور خاص ابناء نور یعنی ملک اور ابناء نار یعنی جن شامل ہیں افواج کا اطلاق ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کسی ایک نسل کا ذکر نہیں اس نوع میں جتنے ذیلی انواع (Species of a large genus) ہو سکتے ہیں سب ہی شامل ہیں۔ اسی طرح اس میں وہ اسلحے (Arms & Weapon System) اور طریقہ جنگ (War Strategies & Maneuvers) سب ہی کچھ شامل ہیں جو ان الگ الگ انواع اور ان کے ذیلی انواع کا خاصہ ہوں گے۔ قرآن نے ان کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح بیان کیا ہے:

فَكَبِكُوا فِيْهِلَهُمُ وَالْغَاوِيُوْنَ وَجُنُوْدُ اٰبٰلِیْسَ اٰجَمْعُوْنَ۔ (الشعراء: ۹۳-۹۵)

ترجمہ: پھر اوندھے ڈالیں اس میں انہیں اور عتق اور جنودا ملیں سمجھوں کو۔
یہاں مذکور الفاظ کا نہایت صحیحہ مسئلہ ہے ممکن ہے اس کا ذکر اس کتاب میں نہ آ سکے

(و) وَاٰخِرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ :

اللہ تعالیٰ نے معرکہ خیر و شر کی مصلحت کا لحاظ رکھتے ہوئے نہایت مبہم طریقے سے شیطانوں کی ایک خاص قسم کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔ قرآن کے الفاظ و بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ جنگجو ہیں۔ (ان شاء اللہ اس کی تفصیل بھی بعد میں آئے گی)۔ قرآن نے ان کا ذکر کرتے ہوئے بیان فرمایا ہے:

وَاٰخِرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ۔ (الانفال: ۶۰)
ترجمہ: اور ان کے علاوہ جو دوسرے ہیں جنہیں تم لوگ نہیں جانتے مگر اللہ ان کی خبر رکھتا ہے۔

(ز) شِیَاطِیْنِ :

قرآن کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں تینوں قسم کے شیطین شامل ہیں یا کبھی شامل تھے۔ یعنی شیطین نور، شیطین نار اور شیطین ارض۔ ہر چند کہ اب ان میں سے زیادہ تر شیطین — نار اور ارض سے تعلق رکھتے ہیں۔

(ا) شِیْطَانِ جِنِّ :

یہ وہی شیطین ہیں جن کا ذکر ابھی شیطین نار کے نام سے ہوا ہے۔ اور یہ وہی شیطین جن ہیں جن کا ذکر قرآن نے اس طرح کیا ہے:

(۱) وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شِیَاطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ۔

(الانعام: ۱۱۲)

ترجمہ: اور اس طرح ہم نے ہر نبی کے لیے شیطین انس و جن دشمن۔

(۲) الَّذِیْ یُوسَّوْسُ فِیْ صُلُوْدِ النَّاسِ مِنَ الْجَنَّةِ وَالنَّاسِ۔ (الناس: ۶)

ترجمہ: وہ جو دوسوے ڈالتے ہیں لوگوں کے سینوں میں جنوں اور انسانوں میں سے۔

ان شیطین نور اور شیطین جن کی (جن میں شیطین نور یا تو خال خال ہیں یا اب بالکل نہیں ہیں) چھ بڑی قسمیں ہیں۔ اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں کہ یہ شیطین انہیں تین قسموں پر

مشتمل ہوں۔ یہ چھ قسمیں اپنی تفصیل میں خود بڑی ہیں جن کا ذکر یہاں ضروری نہیں۔ یہ تین قسمیں ہیں:

(۱) غواص :

یہ وہ لوگ ہیں جن کا ذکر قرآن نے اس طرح کیا ہے:

(۱) وَمِنَ الشَّيَاطِينِ مَنْ يَغُوصُونَ لَهُ. (الانبیاء: ۸۲)

ترجمہ: اور شیاطین میں سے جو اس کے لیے غواصی کرتے ہیں۔

(۲) وَالشَّيَاطِينِ كُلِّ بَنَاءٍ وَغَوَاصٍ. (ص: ۳۷)

ترجمہ: اور شیاطین ہر وہ جو بناء ہے اور غواص۔

(۲) بناء :

یہ وہ لوگ ہیں جن کا ذکر قرآن نے اس طرح کیا ہے:

(۱) وَالشَّيَاطِينِ كُلِّ بَنَاءٍ. (ص: ۳۷)

ترجمہ: اور شیاطین جو ہر وہ جو بناء ہے۔

(۳) ملقی شیاطین :

یہ وہ لوگ ہیں جن کا ذکر قرآن نے اس طرح کیا ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّى أَلْقَى

الشَّيْطَانُ فِي أَمْنِيَّتِهِ. (الحج: ۵۲)

ترجمہ: اور جو رسول بھیجا ہم نے آپ سے پہلے یا نبی سوجب بھی انہوں نے

تمنی کیا تو شیطان نے ڈال دیا ان کی تمنائیں۔

(۴) الخناس :

یہ وہ لوگ ہیں جن کا ذکر قرآن نے اس طرح کیا ہے:

مِنَ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ. (الناس)

ترجمہ: الخناس کے وسوسوں کے شر سے۔

(۵) نزاع :

یہ وہ لوگ ہیں جن کا ذکر قرآن نے اس طرح کیا ہے:

فلما ينفذ غفك من الشيطان نزع (الاعراف: ۲۰۰)
ترجمہ: اور جب آپ کو شیطان نزع کا شکار بنانے کی کوشش کرے۔

(۶) شیاطین فی الاصفاد:

یہ وہ لوگ ہیں جن کا قرآن میں اس طرح تذکرہ کیا گیا ہے:

وآخرین مقرنین فی الاصفاد (س: ۳۸)

ترجمہ: بہت سے اور جو باہم جکڑے ہوئے ہیں بیڑیوں میں۔

(۲) شیاطین انس:

یہ وہ شیاطین ہیں جن کا ذکر ابھی شیاطین ارض کے نام سے ہوا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ شیاطین ارض میں بھی شیاطین انس نہیں لیکن چونکہ اصل شیاطین انس ہیں اس لیے اس طبقے میں ان کا ذکر بھی شیاطین ارض کے مترادف ہے۔ قرآن نے ان کا ذکر اس طرح کیا ہے:

(۱) وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ بَشَرٍ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنْسِ (الانعام: ۱۱۲)

ترجمہ: اور اسی طرح کر دیا ہم نے ہر نبی کے لیے دشمن شیاطین انس کو۔

(۲) الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ

(الناس: ۵-۶)

ترجمہ: جو دوسوہ ڈالتے ہیں لوگوں کے سینوں میں جنوں اور انسانوں میں سے۔

(ح) اولیاء الشیطان:

قرآن کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عام حالات میں اس اصطلاح کا اطلاق تمام ہی شری لوگوں پر ہوتا ہے لیکن بطور خاص یہ ان غیر شیطان مخلوقات کے لیے استعمال ہوا ہے جو ابلیس کے موقف سے یا تو اتفاق رکھتے ہیں یا کسی طرح سے اس کے موید ہیں۔ کوئی ضروری نہیں کہ یہ تمام لوگ شیاطین میں ہوں۔

(۱) فَاقْتُلُوا أَوْلِيَاءَ الشَّيْطَانِ إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا

(النساء: ۷۶)

ترجمہ: سو لڑو تم شیطان کے اولیاء سے بے شک چال شیطان کی کمزور ہے۔

(۲) إِنَّمَا ذَلِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ (آل عمران: ۱۷۵)

ترجمہ: یہ جو ہے سو شیطان ہے کہ ڈراتا ہے اپنے اولیاء کو۔

(ط) قرین الشیطان :

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی غفلت یا کمزوریوں یا برائیوں کے سبب ایسے ہو جاتیں کہ ابلیس ان پر اپنا کوئی خاص شخص مسلط کر دے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے کہ جیسا کہ کوئی انسان اپنی کمزوریوں کے سبب کسی شخص کے ذریعہ بلیک میل ہوتا ہے یا کسی مافیا میں پڑ جاتا ہے جس سے ٹکنا یا پیچھا چھڑانا مشکل ہوتا ہے۔ قرین کا اطلاق دونوں پر ہوتا ہے۔ اس انسان یا جن پر بھی جس پر ابلیس اپنا کوئی آدمی مسلط کر دے یا وہ جن یا انسان جو شیطان ہے جسے اس جن پر یا انسان پر مسلط کر دیا جائے۔ قرآن نے اس کا ذکر اس طرح کیا:

(۱) ومن یعش عن ذکر الرحمن نقیض له شیطاناً فہولہ قرین
واذہم لیصدونہم عن السبیل ویحسبون انہم مهتدون۔ (الزخرف: ۳۶)
ترجمہ: اور جو کوئی آنکھیں چرائے رحمان کی یاد سے ہم اس پر مقرر کر دیں
گے ایک شیطان وہ رہے اس کا ساتھی۔ اور وہ ان کو روکتے رہتے ہیں رہو سے اور یہ سمجھتے
ہیں کہ ہم راہ پر ہیں۔

(۲) الذین یبخلون ویأمرؤن الناس بالبخل ویکتُمون ما اٰتٰہم
اللہ من فضلہ واعتدنا للکافرین عذاباً مہیناً والذین ینفقون اموالہم
رذٰلہ الناس ولا یؤمنون باللہ ولا بالیوم الآخر ومن یکن الشیطان لہ
قریناً فسلہ قریناً (النساء: ۳۸)

ترجمہ: وہ لوگ جو بخل کرتے ہیں اور سکھاتے ہیں لوگوں کو بخل اور چھپاتے
ہیں جو ان کو دیا اللہ نے اپنے فضل سے اور تیار کر رکھا ہے ہم نے کافروں کے لیے عذاب
ذلت کا۔ اور وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال لوگوں کو دکھانے کو اور ایمان نہیں
لا تے اللہ پر نہ قیامت کے دن پر اور جس کا ساتھی ہو شیطان تو وہ بہت برا ساتھی ہے۔

(ی) اخوان الشیطان :

یہ وہ لوگ ہیں جو خود شیطان نہیں ممکن ہے ان کا شمار عام حالات میں اولیاء الشیطان میں
بھی نہ ہو لیکن یہ اپنے قول اور عمل کے ذریعہ راست یا بالواسطہ ابلیس کے مقاصد میں مددگار ہوتے
ہیں۔ خواہ یہ محرک نہ ہوں لیکن متحرک ضرور ہوتے ہیں۔ یعنی ان میں ابلیس کے لیے حرکت
(Pro-activity) تو نہیں پائی جاتی لیکن یہ خود متحرک (Active) ضرور ہوتے ہیں۔ ان کا

ذکر قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے:

إِن الْمُبْذَرِينَ كُلُّنَا اخْوَانُ الشَّيَاطِينِ. (نہی اسرائیل: ۲۷)
ترجمہ: بے شک اسراف کرنے والے ہو گئے ہیں بھائی شیطین کے۔

(ک) متبعون الشیطان :

یوں تو اس کا اطلاق ان تمام ہی لوگوں پر ہوتا ہے جو ابلیس کا اتباع کرتے ہیں لیکن ان کا اصلی اطلاق ان پر ہوتا ہے جو خواہ ابلیس کے لیے متحرک بھی نہ ہوں بلکہ اسے ایجابی یا سلبی طور پر قبول کرنے والے ہوں۔ تمام ابناء نور، ابناء نار اور ابناء ارض اس میں شامل ہیں۔ یہی وہ بات ہے جن کا ذکر قرآن نے اس طرح کیا ہے:

لَا مَلَأَن جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّن تَبَعَكَ مِنْهُمْ أَجْمَعِينَ. (ص: ۸۵)
ترجمہ: تو میں ضرور بھر دوں گا جہنم کو تجھ سے اور جو تیری پیروی کریں گے

ان میں سے سب سے۔

یوں تو مختلف ناموں کے شیاطین کا ذکر احادیث میں آیا ہے لیکن وہ اسم خاص ہے۔ طبقات کے اسم نہیں۔ لہذا ان کا ذکر اس ذیل میں نہیں آتا۔ یہ طبقات وہ ہیں جو ابلیس کے ساتھ ہیں۔ ہر چند کہ یہ ذکر یہیں ختم ہو جانا چاہئے تھا لیکن چونکہ احادیث میں تین اور باتوں کا ذکر آیا ہے جو دجال مسیح کے علاوہ ہیں لہذا دجال کے تفصیلی ذکر سے قبل ان کا ذکر کیا جانا گزیر ہے۔ اور یہ ذکر اس لیے بھی ضروری ہے کہ ان کے اثرات کا بطور خاص ذکر کیا گیا ہے :

(ا) یاجوج وماجوج :

یاجوج وماجوج کی حقیقت کیا ہے؟ سرد سب ہمیں اس سے یہاں بحث نہیں۔ ابلیس کے اعموان و انصار میں چونکہ بطور خاص اس کا ذکر کیا گیا ہے اور اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس کے ظہور سے قبل ہی اس کے روئے زمین اور مومنین پر اثرات کے پڑنے اور زمین پر شر کی قوتوں کے تقویت پانے کا ذکر کیا گیا ہے اس لیے یہاں اس حوالے سے یاجوج وماجوج کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اللہ کے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ام المؤمنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ ایک دن میرے ہاں گھبرائے ہوئے شریف لائے اور فرمایا: لا الہ الا اللہ! خرابی

ہے، عرب کے لیے اس آفت سے جو قریب آگئی ہے۔ آج یا جوج و ما جوج کے بند میں اتنا
 شکاف پڑ گیا ہے یہ فرماتے وقت آپ نے اپنے انگوٹھے اور اس کے ساتھ والی انگلی کو ملا
 کر حلقہ بنایا (یعنی مقدار بتائی کہ اتنا شکاف پڑ گیا ہے) ام المؤمنین حضرت زینب کہتی
 ہیں: میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا ہم اس کے باوجود ہلاک ہو جائیں گے کہ ہم
 میں نیک لوگ موجود ہوں گے؟ آپ نے فرمایا: ہاں! جب فسق و فجور کی کثرت
 ہو جائے گی (تو نیکوں کی موجودگی بھی ہلاکت سے نہ بچا سکے گی)۔ (البخاری
 کتاب الانبیاء، باب قصہ یاجوج و ماجوج)

(۲) الشیطان الملجمہ :

محمد الحاکم نیشاپوری نے 'المستدرک علی الصحیحین' میں ایک حدیث نقل کی ہے:
 "حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں: ہمارے سامنے
 ایک شخص آیا اور اس نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: یا رسول اللہ! آپ کی امت کی امید
 کی مدت کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: سو سال۔
 اس نے پوچھا: اس کی کوئی امارت یا آیت یا علامت؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! دوزنی
 ہیزوں کا آسمان سے زمین پر گرنا (القذف) اور زمین کا دھنسا (الخسف) اور زمین کا
 لرزنا (الرجف) اور (اب تک) انسانوں کو بچانے کے لیے لگام ڈالے ہوئے شیطانوں
 کا آزاد ہو کر زمین پر انسانوں کے بچ بھیجا جانا۔ (ارسال الشیاطین الملجمہ عن
 الناس)۔^۶

(المستدرک: کتاب الفتن والملاحم، حدیث ۱۸۲۹۳)

(۳) الشیاطین المجلبہ :

ایک اور حدیث احمد اور طبرانی نے نقل کی ہے جس میں انسانوں پر ایسے شیاطین کے
 چھوڑے جانے کا ذکر ہے جو فوج در فوج ہوں گے اور جن کو ہانک کر لایا جائے گا۔ میں یہاں اس
 حدیث کے متن کو حافظ نور الدین علی بن ابی بکر البیہقی کے حوالے سے نقل کرتا ہوں:
 "سائل نے پوچھا: یا رسول اللہ اس کی کوئی امارت، آیت یا علامت؟ آپ ﷺ نے
 جواب دیا: ہاں! الخسف، والرجف وارسال الشیاطین المجلبہ علی الناس۔^۷

نوالہ: بغیة الرائد فی تحقیق مجمع الزوائد ومنبع الفوائد للحافظ نور

الدين على بن ابي بكر الهيثمي (المتوفى ۸۰۷ھ) كتاب الفتن: باب ما جاء في
المسخ والقذف وارسال الشياطين والعواقب حديث: (۱۲۵۸۵)

اس حدیث کے متن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شیاطین لاکھوں کی تعداد میں انسانوں پر
ہانک دیئے جائیں گے۔ جیسے چھوٹے چھوٹے بچوں پر کوئی پھاڑ کھانے والے کتوں کے غول کے
غول کو چھوڑ دے۔

تاہم غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ الشیاطین الملجعة اور الشیاطین
الملجبة ایک ہی ہیں۔ ممکن ہے پہلی ترکیب میں ان کے اس پہلو سے گفتگو کی گئی ہو کہ وہ اس وقت
مقید ہیں لیکن قرب ظہور دجال کے وقت وہ انسانوں پر چھوڑ دیئے جائیں گے۔ اور دوسری حدیث
کی ترکیب میں اس پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہو کہ اس وقت انسانوں اور مومنین پر ان کا چھوڑا جانا کس
نوعیت کا ہوگا۔

حقیقت سوم : معرکہ خیر و شر

آغاز :

کائنات میں معرکہ خیر و شر کے آخری مرحلے کا باضابطہ آغاز اسی لمحے ہو گیا جب اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو یوم وقت، معلوم تک اجازت دے دی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قُلْ فَلَنْكَ مِنَ الْمُنْظَرِينَ اِلٰی یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ (الحجر ۳۷-۳۸ و ص: ۸۰-۸۱)

ترجمہ: کہا پس تم مہلت دیئے جانے والوں میں سے ہوئے وقت معلوم کے دن تک۔

اور ابلیس نے اس کا جواب دیا تھا: قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَا غَوِيْنَهُمْ اَجْمَعِيْنَ (ص: ۸۲)

ترجمہ: کہا: تو تیری عزت کی قسم! میں ضرور برباد کروں گا سب کو سوائے تیرے مخلص بندوں کے۔ اور اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا:

لَا مُلْكُ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمَعْنُ تَبْعِكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ۔ (ص: ۸۵)

ترجمہ: تو میں ضرور بھردوں گا جہنم کو تجھ سے اور جو تیری پیروی کریں گے ان میں سے

سب سے۔

اس جواب کے تین شق ہیں:

(۱) پہلی شق: لَا مُلْكُ جَهَنَّمَ مِنْكَ: میں جہنم کو تجھ سے ضرور بھردوں گا۔ ظاہر ہے اس کا تعلق اس نافرمانی سے ہے جس کے نتیجے میں یہ سارا قضیہ اٹھ کھڑا ہوا۔ یعنی ابلیس کا اللہ کا حکم ماننے اور آدم کو سجدہ کرنے سے انکار اور اپنے لیے خلافت کا دعویٰ۔

(۲) دوسری شق: (لَا مُلْكُ جَهَنَّمَ) مَعْنُ تَبْعِكَ: میں جہنم کو ان سے ضرور بھردوں گا جو تیری پیروی کریں گے۔ ظاہر ہے اس کا تعلق ان تمام لوگوں سے ہے جو اس مرحلے میں معرکہ خیر و شر میں ابلیس کا ساتھ دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ ایسے تمام لوگوں سے جہنم کو بھردیں گے۔

(۳) تیسری شق: مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ: ان میں سے تمام لوگوں کو۔ ظاہر ہے اس کی تعیین کرنے کے لیے، یہ دیکھنا ہو گا کہ اس معرکہ خیر و شر کا دائرہ کتنا وسیع ہے اور اس میں براہ راست اور

بالواسطہ کون کون شریک ہیں؟ اور کون کون ابلیس کا ساتھ دے سکتے ہیں؟ اور اسے معلوم کرنے کا ایک ہی ذریعہ ہے یعنی وہ مکالمہ جو حضرت باری تعالیٰ اور ابلیس کے مابین ہوا۔ چنانچہ اس مکالمے میں ابلیس نے کہا:

لاغوينهم اجمعين إلا عبادك المخلصين . (ص: ۸۲)

ترجمہ: میں ضرور ان سب کو برباد کر دوں گا سوائے تیرے مخلص بندوں کے۔

اگرچہ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اس سے مراد صرف انسان ہیں۔ لیکن جہاں اس کا کوئی قرینہ نہیں کہ اس میں انسانوں کے علاوہ کوئی شامل نہیں وہیں اس کا بھی کوئی قرینہ نہیں کہ اس میں حصر ہو یعنی یہ کہ صرف انسان ہی شامل ہیں اور کوئی دوسرا نہیں۔ اور خاص طور پر اس صورت میں کہ سورہ ہود آیت: ۱۱۹ اور السجدہ آیت: ۱۳ میں اس حصر کو رفع کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(۱) وتمت كلمة ربك لا ملأن جهنم من الجنة والناس اجمعين

(ہود: ۱۱۹)

ترجمہ: اور یوں ہوئی بات تیرے رب کی کہ البتہ بھر دوں گا دوزخ جنوں سے

اور آدمیوں سے اکٹھے۔

(۲) ولكن حق القول مني لأملأن جهنم من الجنة والناس

اجمعين (السجدہ: ۱۳)

ترجمہ: لیکن ٹھیک پڑ چکی میری کہی بات کہ مجھ کو بھرنی ہے دوزخ جنوں سے

اور آدمیوں سے اکٹھے۔

ایسی صورت حال میں 'لاغوينهم اجمعين' میں وہ ساری مخلوقات جو دائرہ ارتقاء اعلیٰ

میں شامل ہیں اس میں شمار ہو سکتی ہیں یعنی ملک، جن اور انسان۔ اور بالصراحت جن اور انسان۔

اس طرح اس معرکہ خیر و شر کے دائرے کا مرکز انسان ضرور ہے لیکن اس بڑے دائرے

میں ابناء نور یا ملک، ابناء نار یا جن اور ابناء ارض یا انسان تینوں شامل ہیں۔ اس معرکہ خیر و شر کی کم از کم تین صورتیں ہو سکتی تھیں:

(۱) سارے انسان غیر متحرک ہوتے اور ابلیس تنہا انہیں گمراہ کرتا۔

(۲) سارے انسان غیر متحرک مگر صاحب اختیار ہوتے اور ابلیس تنہا انہیں گمراہ کرتا۔

(۳) سارے انسان، ایہام نور اور ایہام نار متحرک اور صاحب اختیار ہوتے اور ابلیس ان میں جس کی مدد لے سکتا لے کر انسان کو گمراہ کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے بنیادی طور پر سب سے مناسب اور عادلانہ اعتبار سے سب سے مناسب یعنی تیسری راہ اختیار کی۔ اس لیے سابقہ آیات میں لاغویہم اجمعین إلا عبادك مخلصین (ص: ۸۲) میں سب ہی شامل ہیں۔ خواہ وہ ملک ہوں یا جن یا انسان۔

عام طور پر جو یہ خیال پایا جاتا ہے کہ ملائکہ گناہ کرنے پر قدرت نہیں رکھتے، قرآن سے بنیادی طور پر ٹکراتا ہے۔ گناہ کی بنیاد اختیار ہے۔ اور اگر اختیار ملائکہ میں پایا جاتا ہے تو قدرت سے گناہ بھی پائی جاتی ہے۔ اور اگر اختیار ملائکہ میں نہیں پایا جاتا تو پھر اللہ تعالیٰ کا یہ حکم دینا:

(۱) وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَدْنَكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ۔

(الاعراف: ۱۱)

ترجمہ: اور ہم نے تم کو پیدا کیا ہم نے پھر تم کو صورت والا بنایا پھر ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو۔

(۲) اِنْقَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ فَاِذَا سُوِّیْتَهُ

وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَہٗ سَاجِدِیْنَ۔ (ص: ۷۱-۷۲)

ترجمہ: جب کہا تیرے رب نے ملائکہ کو میں بناتا ہوں بشر گارے سے پس جب میں اس کا ڈھانچہ بنالوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تو گر پڑو اس کے آگے سجدہ میں۔ بے معنی ہو جائے گا۔ جب ملائکہ کو قدرت گناہ ہی نہیں تو ان کو اختیار دینا کیا معنی اور اس سے آگے معاملہ کہ انہوں نے اس پر سوال کیا:

قَالُوْا اَتَجْعَلُ فِیْہَا مِنْ یُّفْسِدُ فِیْہَا وَیُفْسِدُ الدَّمْلَہُ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ

بِحَمْدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ۔ (البقرہ: ۳۰)

ترجمہ: کہا (ملائکہ نے): کیا آپ قائم کرتے ہیں اس کو جو فساد کرے اس میں اور خون بہائے اور ہم آپ کی حمد اور تسبیح اور آپ کے لیے تقدیس کرتے رہتے ہیں۔

اور اس پر مستزاد یہ کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان پر حجت پوری کر دی تو انہوں نے اپنی غلطی کا اقرار فرمایا۔ چنانچہ قرآنی بیان میں 'سبحانک' سے زیادہ واضح کوئی بیان نہیں جو اقرار غلطی کے لیے عند اللہ استعمال کیا جائے۔ یعنی اے اللہ صرف اور صرف تو ہی ہر نقص سے پاک ہے!

یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے غلطی واضح ہونے کے بعد نہ صرف یہ کہ اللہ کا ہر حکم انسانوں کے لیے مان لیا۔ اب جہاں تک اس آیت کا سوال ہے جہاں فرمایا گیا ہے:

”عليها ملئكة غلاظ شداد لا يعصون الله ما أمرهم ويفعلون ما يؤمرون۔ (التحریم: ۶)“

ترجمہ: اس پر مقرر ہیں ملائکہ شد خوزیر دست نافرمانی نہیں کرتے اللہ کی جو حکم دے۔ ان کو اور وہی کام کرتے ہیں جو ان کو حکم ہو۔

تو پھر اگر اسے عام معنی میں لیا بھی جائے یعنی یہ کہ سارے ملائکہ اس حکم کے بجالانے میں کبھی نافرمانی اور کوتاہی نہیں کرتے اور جو حکم دیا جاتا ہے تو بجالاتے ہیں۔ جب بھی درج ذیل معنی میں کسی ایک کلیاسب کا اطلاق ہوگا:

(۱) وہ حکم بجالانے میں کوئی کوتاہی یا نافرمانی نہیں کریں گے۔

(۲) وہ عام طور پر یا بالاکثر کبھی کوتاہی یا نافرمانی نہیں کرتے۔

یہ الگ بات ہے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ ملائکہ عام طور پر گناہ نہیں کریں گے مگر خلاف حق بات اگر ان سے صادر ہو بھی جائے تو اس پر فوراً متنبہ ہو کر رجوع کر لیں گے۔

دوسری بات یہ کہ ملائکہ نے عام طور پر اور مقرب ملائکہ نے بطور خاص اس کا عہد کیا ہو کہ نہ صرف یہ کہ وہ شر کا ساتھ نہیں دیں گے بلکہ اب تاقیامت اللہ اس کے رسول اور مومنین کا ساتھ دیں گے۔ چنانچہ درج ذیل آیات سے اس کا اندازہ ہوتا ہے:

(۱) من كان عدوا لله وملئكته ورسوله وجبريل وميكال فان الله عدو للكافرين۔ (البقرة: ۹۸)

ترجمہ: جو کوئی ہوا دشمن اللہ کا اور اس کے ملائکہ کا اور اس کے رسولوں کا اور جبریل اور میکال کا تو اللہ دشمن ہے ان کافروں کا۔

(۲) هو الذي يصلي عليكم وملئكته ليخرجكم من الظلمات إلى النور وكان بالمؤمنين رحيماً۔ (الاحزاب: ۴۳)

ترجمہ: وہی ہے جو رحمت بھیجتا ہے تم پر اور اس کے ملائکہ تاکہ نکالے تم کو ظلمات سے النور میں اور ہے ایمان والوں پر مہربان۔

اور سب سے اہم آیت اسے اس طرح بیان کرتی ہے:

(۳) ان الله وملئكته يصلون على النبي۔ (الاحزاب: ۵۶)

ترجمہ: بے شک اللہ اور اس کے ملائکہ رحمت بھیجتے ہیں بالقی پر۔

لیکن ان میں سے کسی بھی آیت سے یہ بات نہیں معلوم ہوتی ہے کہ اس میں تمام ملائکہ یعنی ملائکہ اور ملائکہ غیر ملائکہ سبھی شامل ہیں۔ حتیٰ کہ اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ سارے ملک بیک وقت ملائکہ بھی ہیں جب بھی۔ اس لیے اگر ایک نفس نوع کا ذکر کل کے اعتبار سے بھی ہو اور کوئی ایسا قرینہ موجود نہ ہو جس میں اس کی صراحت ہو کہ اس کا ایک ایک فرد اس میں شامل ہے وہ کل عام طور پر اکثر کے معنی میں ہی لیا جائے گا۔ قرآن میں آتا ہے:

کل نانس ذائقۃ الموت۔ (آل عمران: ۱۸۵)

ترجمہ: ہر نفس چکھنے والا ہے موت۔

یہاں محض نفس اگر ہوتا تو اس سے لازم نہ آتا کہ اس میں ایک ایک نفس شامل ہے۔ لیکن اب جبکہ آل — نفس کے ساتھ ہے اس میں ایک ایک نفس شامل ہو گیا۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو تو محض نوع کا ذکر جبکہ اس نوع میں کثرت پائی جاتی ہو صرف اکثر ہی شامل ہوں گے۔ مثلاً:

(۱) ان الذین کفروا ملتوا وہم کفلا اولئک علیہم لعنة اللہ

والملئکۃ والناس اجمعین۔ (البقرہ: ۱۶۱)

ترجمہ: بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور مر گئے کافر ہی انہیں پر لعنت ہے

اللہ کی اور ملائکہ کی اور لوگوں کی سب کی۔

(۲) اولئک جزاؤہم ان علیہم لعنة اللہ والملائکۃ والناس

اجمعین۔ (آل عمران: ۸۷)

ترجمہ: ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر لعنت ہے اللہ کی اور ملائکہ کی

اور لوگوں کی سب کی۔

ان دونوں جگہوں پر اجمعین کا یہ معنی تو لیا جائے گا کہ 'اللہ ملائکہ اور انسانوں سب کی لعنت' لیکن اگر یہ مفہوم لیا جائے کہ اللہ اور تمام ملائکہ کی لعنت ہے تو پھر یہ بھی مفہوم لینا ہو گا کہ تمام انسانوں کی لعنت۔

چنانچہ اس معرکہ خیر و شر کی وسعت اور دائرہ کار کے تعلق سے کئی باتیں واضح ہوتی ہیں:

(۱) اس معرکہ خیر و شر کی بنیادی وجہ خلافت آدم ہے اور ابلیس اس کا فریق ثانی ہے۔

(۲) معرکہ کی بنیادی بات انسان کو خلافت کے لیے نااہل ثابت کرنا ہے۔

(۳) اس معرکے میں ابلیس کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ایسا نور یعنی ملک، ایسا نار یعنی جن اور ایسا ارض یعنی انسانوں کو اپنے گروہ میں شامل کرے، ان کی مدد لے، ان کو آلہ کار بنائے اور ان سب کی مدد سے اپنا مقصد حاصل کرے۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے دوسری طرف انسانوں کو متحرک، محرک یعنی فاعل اور مختار بنایا ہے۔ یعنی وہ خیر و شر کے انتخاب اور اس کے لیے کام کرنے کے تعلق سے نہ صرف فاعل ہے بلکہ متحرک بھی ہے اور چاہے تو محرک کی طرح بھی کام کر سکتا ہے۔

(۵) اللہ تعالیٰ نے جہاں شیطان کو آزادی (Free hand) دی ہے وہیں اس نے تمام انسانوں کے لیے ہدایت، اور انبیاء و رسل بھیجے اور حکم دیا کہ حق کو قائم رکھیں اور اگر ابلیس اسے منہدم کر دے تو اس کی اقامت کریں۔

(۶) اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو خبردار کیا کہ ابلیس یعنی شیطان دراصل اس خلافت کا مدعی ہے جو انسانوں کو عطا کی گئی ہے اور وہ ان کا کھلا دشمن ہے اور ان سے یہ منصب چھین لینا یا کم از کم انسانوں کو اس منصب سے ہٹا دینا چاہتا ہے لہذا انسان اسے اپنا دشمن بنالے اور اس سے نہ صرف یہ کہ بچے بلکہ اس کے خلاف ہر طاقت استعمال کر کے اس کے منصوبے کو ناکام کر دے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(۱) فقلنا یٰآدم ان هذا عدوك ولزوجك فلا یخرجنكما من الجنة فتشقی (طہ: ۱۱۷)

ترجمہ: پس کہا ہم نے اے آدم! یہ تمہارے اور تمہارے جوڑے کے لیے دشمن ہے۔ پس نہ نکال باہر کرے تم دونوں کو الجنت سے اور تم پڑ جاؤ مشقت میں۔

(۲) ان الشیطان لکم عدو فاتخذوه عدوا۔ (فاطر: ۶)

ترجمہ: تحقیق شیطان تمہارا دشمن ہے تم لوگ بھی اسے دشمن بناؤ۔

ان تمام باتوں سے کئی امور سامنے آتے ہیں:

(۱) یہ معرکہ خیر و شر کا کائناتی (Cosmic) ہے۔ ہر چند کہ معرکے کا کارزار زمین ہے۔

(۲) اس معرکہ خیر و شر میں تمام کائناتی عامل طاقتوں (All Cosmic Active

Forces) یعنی ملک، جن اور انسان شریک ہیں جہاں خیر و شر کا فریق مومن انسان ہے جس کے

ساتھ اللہ تعالیٰ اور تمام مقرب ملائکہ، تقریباً تمام ملائکہ، مومن ملک اور مومن جن ہیں جب کہ

شر کا فریق ابلیس یعنی موجودہ شیطان، تمام شیاطین یعنی شیاطین ملک، شیاطین جن اور شیاطین انسان اور تمام قبائین شیاطین ملک، انس و جن ہیں۔

(۳) یہ معرکہ الجنتہ میں شروع ہوا اور وہاں سے منتقل ہو کر اس روئے ارض پر آگیا جو اس معرکہ کا بنیادی اصل حصہ ہے اور یہ معرکہ قیامت تک جاری رہے گا۔

(۴) ظاہر ہے کہ جب یہ معرکہ کائناتی ہے اور اس میں ابلیس نے ابناء نور، ابناء نار اور ابناء ارض سب کو اپنا ہوا بنانے یا ان کا استعمال لینے یا ان کو اپنے لیے کام کرنے پر مجبور کرنے کی کوشش کی ہو تو اس معرکہ کی وسعت کتنی بڑھ سکتی ہے اور اس معرکہ میں استعمال ہونے والی طاقت اور اسلحوں (Force & Weapons) کی حقیقت کتنی ہولناک ہو سکتی ہے، اس میں کتنی ہلاکتیں (Casualties) ہو سکتی ہیں اور اس میں کیسے کیسے ہولناک انقلابات آسکتے ہیں۔

خليفة

معرکہ خیر و شر کی حقیقی صورت حال سمجھنے کے لیے ’خليفة‘ کا مفہوم سمجھنا ضروری ہے۔ عام طور پر اس کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ انسان زمین میں اللہ کا خلیفہ ہے۔ جب کہ یہ مفہوم اس تعبیر کے ساتھ درست نہیں۔ اس مفہوم کے لینے میں دو قباحتیں ہیں:

(۱) اگر زمین پر انسان اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے تو پھر اس کا اعلان عالم عصر میں کیا جانا، تسویہ یعنی تصویر کے بعد آدم کا الجنتہ میں رہنے کو کہنا اور اسے تنبیہ کرنا کہ ”اے آدم یہ (ابلیس) تمہارا اور تمہاری زوجہ کا دشمن ہے پس کہیں یہ تم دونوں کو الجنتہ سے باہر نہ کر دے اور تو تکلیف میں نہ پڑ جائے۔“ (طہ: ۱۱) اور جب ان دونوں سے غلطی ہو گئی تو انہیں کہنا کہ اب ”تم سبھی الجنتہ سے اترو اور زمین پر جاؤ وہاں تمہارے لیے ٹھکانا اور ایک وقت تک کے لیے متاع ہے۔“ (البقرہ: ۳۶) کیا مطلب رکھتے ہیں؟ اگر آدم کو زمین پر اللہ اپنا خلیفہ ہی بنانا چاہتا تھا تو اسے تصویر و تسویہ کے بعد سیدھے الارض پر ہی بسا دینا چاہئے تھا اور اگر کسی مصلحت سے ایسا نہ بھی کیا گیا تو ایسا کہنے کا کیا مفہوم ہے کہ زمین پر تمہارے لیے ایک وقت تک ہی متاع ہے۔

(۲) اگر انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے اور واضح ہو کہ زمین کو اسی مفہوم میں لیا جاتا ہے یعنی وہ خطہ زمین جو ایک سیارہ ہے اور نظام شمسی کا حصہ ہے اور زہرہ (Venus) اور مریخ

(Mars) کے درمیان سورج کے چاروں طرف گردش کر رہا ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ زمین کے علاوہ بقیہ پوری کائنات میں اللہ کا خلیفہ کون ہے۔

اگر غور کیا جائے تو ان سوالات کا اس طرح جواب دینا کہ ”انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے“ کی تقریر ہو جائے چند در چند پیچیدگیاں پیدا کرے گا۔

اس عاجز کی رائے میں ’فی الارض خلیفہ‘ سے مراد ”اہل زمین میں سے“ ہے اور اہل زمین سے مراد وہ مخلوق جو اپنی نوع کے اعتبار سے نہ نور سے بنائے گئے ہیں نہ نار سے بلکہ از قسم ارض ہیں۔ اور ارض سے مراد یہ زمین نہیں بلکہ نفس ارض ہے۔^۱

اس کا مفہوم یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ پوری کائنات میں کسی کو اپنا خلیفہ بنانا چاہتا تھا۔ یہ خلیفہ ممکن ہے ابناء نور سے بنتے یا ابناء نار سے یا ابناء ارض سے۔ یہ علم صرف اللہ رب العزت کو تھا کہ وہ کس میں سے اپنا وہ خلیفہ بنائے گا۔ ابناء نور اپنی امید لگائے بیٹھے تھے اور ابناء نار اپنی، اس لیے کہ اس وقت تک یہی دونوں مخلوقات ’عالم بریہ‘ سے عالم عصر ہوتے ہوئے عالم اشیاء تک سفر کر چکے تھے۔ اور ابناء ارض اس وقت کچھ عالم اشیاء میں اور کچھ عالم عصر میں اور آدم تو عالم بریہ میں ہی تھے۔ چنانچہ جب یکایک اللہ تعالیٰ نے آدم کو کائنات تخلیق کے دائرے میں لا کر عالم بریہ سے عالم عصر اور پھر عالم اشیاء میں جلوہ گر فرمایا تو ابناء نور اور ابناء نار حیرت زدہ رہ گئے۔ اس پوری تدریج پر غور کیا جائے تو درج ذیل امور سامنے آتے ہیں:

(۱) اِذَا قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَہٗ ۙ مَّجْمَل اعلان ہے۔ اس کے بعد قالوا میں ایک طویل فصل ہے جس کی تفصیلات یہاں محذوف ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ اعلان تقدم کے اعتبار سے تو کتنا ہی پہلے ہو سکتا ہے لیکن تاخر کے اعتبار سے اس وقت ہوا ہو گا جب آدم ابھی عالم بریہ میں ہوں گے یا زیادہ سے زیادہ عالم عصر میں آچکے ہوں گے۔ لیکن آدم کا عالم عصر میں ہونا بھی ان کی حقیقت کو ابناء نور اور ابناء نار کی سمجھ سے باہر رکھنے کے مترادف ہو گا۔ چنانچہ ایک عرصے کے بعد جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دوسرا اعلان سنا ہو گا تو اس وقت تک آدم عالم عصر سے عالم اشیاء میں آچکے تھے لہذا ابناء نور اور ابناء نار کو ان کی حقیقت سمجھنے اور اس کے ادراک کرنے میں دیر نہ لگی ہو گی کہ خلیفہ اصلاً کون بنایا جا رہا ہے اور جسے بنایا جا رہا ہے اس کی حقیقت کیا ہے۔ یہی وہ دوسرا اعلان ہے جس کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے:

(۱) لقد خلّٰناکم ثم صورناکم ثم قلنا للملائکۃ اسجدوا لآدم (الاعراف: ۱۱)

ترجمہ: اور تحقیق کہ ہم نے تم کو پیدا کیا پھر تمہیں صورت والا بنادیا پھر ہم نے کہا ملائکہ: کو کہ آدم کو سجدہ کرو۔

(۲) فاذا سويته ونفخت فيه من روحي فقعوا له سجدین (الحجر: ۲۹ اور ص: ۷۲)

ترجمہ: پھر جب ڈھانچہ بنادوں اس کو اور پھونک دوں اس میں اپنی روح میں سے تو گر پڑو اس کے آگے سجدہ میں۔

چنانچہ غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ البقرہ آیت ۳۰ کا پہلا حصہ اس اعلان پر مشتمل ہے جن میں دو باتیں واضح تھیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کائنات میں اپنا خلیفہ بنانا چاہتا ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کائنات میں اپنا خلیفہ السماء یا السموات اور الارض میں سے الارض میں بنانا

چاہتا ہے۔

لیکن اس وقت تک ملک اور جنوں کو یہ قطعاً معلوم نہ تھا کہ یہ خلیفہ الارض یعنی اس مٹی سے بنایا جائے گا جو نور اور نار کا نقیض ہے۔ وہ یہی گمان کیے ہوئے تھے کہ ممکن ہے اس خلافت کے لیے ان کا انتخاب ہو جائے۔ جو نہیں ہوا۔ چنانچہ اس پر انہیں اعتراض ہوا۔ 'ماکان وما یكون' میں نے لکھا:

”آدم نے اپنا سفر خلافت فی الارض سے شروع کیا۔ اس کی اس برتری پر پہلا

اعتراض اس کی ترکیب و ساخت کو مد نظر رکھ کر کیا گیا..... آدم کی فضیلت پر

دوسرا اعتراض بھی اس کی ترکیب اور ساخت کو مد نظر رکھ کر کیا گیا۔ ہر چند کہ پہلے اور

دوسرے اعتراض میں نوعی فرق تھا۔“ (صفحہ: ۱۷)

بعض اہل علم فرماتے ہیں کہ پہلا سوال از قسم اعتراض نہیں تھا، جو اس عاجز کے نزدیک

درست نہیں۔ دراصل ان حضرات کا یہ قول اس نقطہ نظر کی وجہ سے ہے جو وہ یہاں لفظ ملائکہ

کے تعلق سے رکھتے۔ جبکہ قرآن نے کہیں بھی ملائکہ کو ان معنوں میں لینے کا پابند نہیں کیا جسے

گزشتہ صفحات میں واضح کر دیا گیا ہے۔ ملائکہ تو ایک منصب ہے۔ جو اس اعلان کے وقت تک

بنیادی طور پر دو انواع پر مشتمل تھا۔ پہلی نوع نور یعنی ملک تھے اور دوسری نار یعنی جن۔ قرآن

کے بیان سے ایسا متبادر ہوتا ہے کہ اس وقت ابناء نار میں سے صرف ایک یعنی ابلیس ہی ملائکہ تھا

حمد کی تسبیح کرتے ہیں کیا یہ تسبیح خلافت کے کام نہیں اور کیا ہم اس کے اب مستحق نہیں کیونکہ اب جن بحیثیت نوع تو فساد کر کے اس کے اہل نہیں رہے۔ یعنی جنوں کے فساد ہی فساد کے برخلاف ہم تسبیح ہی تسبیح میں مشغول ہیں۔ اس لیے کیا اس کے مستحق ہم نہیں؟

(۲) ونقدس لك : یعنی اے اللہ تعالیٰ ہم لوگوں نے اپنی افزائش بالکل روک دی ہے اور ہر شے سے یکسو ہو کر ہم صرف آپ کی طرف متوجہ ہو چکے ہیں اور ہمیشہ آپ کی طرف ہی متوجہ رہتے ہیں اور اس طرح آپ کی پاکی بیان کرتے ہیں۔ کیا ایسا کرنا خلافت کا اہل نہیں بناتا اور کیا ہم اس کے مستحق نہیں؟

یہاں مزید واضح ہو کہ ابلیس کا اعتراض صرف اپنی ذات کے لیے تھا۔ پوری نسل نار کے لیے نہیں تھا۔ خواہ اس کی وجہ یہ ہو کہ صرف وہی ملائکہ میں سے تھا اور خود کو ہی اس کا اہل سمجھتا تھا یا اس وقت تک بیشتر جن اسی کے ذریعہ تباہ ہو چکے تھے۔ تاہم چونکہ کچھ یقیناً زندہ تھے اس لیے یہ بات حتمی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ وہ نسل جن کے لیے خلافت کا مدعی نہیں تھا بلکہ صرف اپنی ذات کے لیے تھا۔ جب کہ ملائکہ کا کہنا شمول رکھتا ہے۔ وہ پوری نوع نور کے تعلق سے یا کم از کم ملائکہ کے تعلق سے یہ بات کہہ رہے تھے۔

یہاں ایک اور بات قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ جو حضرات ملائکہ کے اس سوال کو اعتراض نہیں قرار دیتے وہ قرآن کے ایک خاص طرز بیان پر غور نہیں کرتے۔ اور وہ ہے:

(۱) فاذا سويته ونفخت فيه من روحي فقعوا له سجدین ۔

(الحجر: ۲۹) اور (ص: ۷۲)

ترجمہ: پھر جب ڈھانچہ بنا دوں اس کو اور پھونک دوں اس میں اپنی روح میں سے تو گر پڑو اس کے آگے سجدہ میں۔

چنانچہ حکم یہ تھا کہ جب اللہ تعالیٰ آدم کو درست کر دے اور اس میں اپنی روح پھونک دے تو ملائکہ فوراً سجدہ ریز ہو جائیں اس میں قابل غور نکتے درج ذیل ہیں:

(۱) بات اس کی نہیں کہ کیا حکم دیا گیا — یعنی سجدہ کرنے کا یا سلام کرنے کا، کہاں کا

حکم دیا گیا — یعنی آسمان میں یا زمین میں، اور کس کے لیے حکم دیا گیا — یعنی آدم کو سجدہ

کرنے کے لیے یا کسی روح یا پتھر کو۔ بات یہ ہے کہ حکم اللہ نے دیا لہذا اگر لایصھون اللہ کا مطلب

جب کہ باقی سارے ملائکہ ابناء نور سے ہی تھے۔ چنانچہ پہلا اعتراض ان ملائکہ کی طرف سے تھا جو ابناء نور تھے اور دوسرا ابلیس کی جانب سے جو ابناء نار میں سے تھا اور اکیلا تھا۔ غور کیا جائے تو پہلا اعتراض پیچیدہ اور دوسرا پیچیدہ تر تھا۔

پہلا اعتراض :

یہ کتاب اس اعتراض کی تفصیلات میں جانے کی قطعاً متحمل نہیں، اس لیے نہایت مختصر طور پر اور صرف ضروری حد تک اس کی وضاحت کی جاتی ہے۔

ملائکہ کا اعتراض جن ملائکہ سے یقیناً مختلف تھا۔ ملائکہ نے جو کچھ کہا اس میں — ایک استفسار یا استفادہ، دو اعتراضات، اور دو افادہ، مشورہ یا اظہار خیال تھے۔ آخری دو افادے، مشورے یا اظہار خیال بالواسطہ اعتراضات ہی تھے۔ اس طرح ملائکہ کے اعتراضات میں کل پانچ امور موجود تھے جو درج ذیل ہیں:

(۱) استفادہ : اتجعل فیہا : اے اللہ کیا آپ جس خلافت کو قائم فرمانے والے ہیں اس کا خلیفہ اور اس کی خلافت کا مرکز 'الارض' ہوگا؟ کیا وہ خلافت زمین پر قائم کی جائے گی؟ کیا وہ خلیفہ زمین میں ہوگا؟

(۲) اعتراضات :

(۱) من یفسد فیہا : یہ آدم جسے ابھی آپ نے درست کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی ہے وہ اس میں فساد کرے گا یعنی کیا یہ فساد نہیں کرے گا؟ اس لیے کہ زمین پر اس سے پہلے جنوں نے فساد کیا تھا جسے آپ نے ابھی ختم کروایا ہے۔

(۲) ویسفک الدماء : یہ آدم جسے ابھی آپ نے درست کیا ہے اور اس میں اپنی روح پھونکی ہے وہ اس میں اسی طرح نہیں بڑھے گا جیسے جن بڑھے اور کیا اسی طرح وہ خون نہیں بہائے گا۔ جیسے جنوں نے بہایا ہے۔

(۳) افادہ، مشورہ یا خیال :

(۱) ونحن نسبح بحمدك : یعنی اے اللہ تعالیٰ ہم ان جنوں کی بات نہیں کرتے جنہوں نے فساد کیا تھا اور جنہیں ابھی ابھی ختم کیا گیا لیکن ہم جو عموماً فساد نہیں کرتے اور آپ کے

وہی لیا جائے، نوعام طور پر لیا جاتا ہے تو انہیں صرف اس بات سے بحث ہوتی کہ اللہ نے کیا حکم دیا لہذا انہیں فوراً سجدہ ریز ہو جانا چاہئے تھا۔ اس صورت میں مَسْجُود، مَسْجِد اور مَسْجِد سب بے معنی ہیں اصل بات صرف حکم الہی ہے۔

(۲) دوسری بات یہ کہ نکتہ یہ نہیں کہ حکم کے ایک ثانیہ کے بعد سجدہ کیا گیا یا ایک لاکھ سال بعد بلکہ نکتہ یہ ہے کہ حکم کے فوراً بعد سجدہ کیوں نہیں کیا گیا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ آدم کو درست کر دے اور اس میں روح پھونک دے تو ملائکہ سجدہ ریز ہو جائیں۔ فوراً سجدہ نہ کرنا خواہ تحفظات میں سے ہو یا عذر یا اعتراض یا مخالفت کچھ بھی ہو وہ حکم عدولی ہی تھی جس کا جواب ”سبحانک“ ہے۔ اب کوئی کہہ سکتا ہے کہ البقرہ آیت: ۳۴ میں ”وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا“ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حکم تیسرے مرحلے میں دیا گیا اور یہ کہ جب حکم دیا گیا تو ملائکہ نے فوراً عمل کیا اور کوئی خلاف ورزی نہیں ہوئی۔ تو اس صورت میں یہ بتانا ضروری ہو گا کہ سورہ النجر آیت: ۲۹ اور سورہ ص آیت: ۷۲ میں جو حکم دیا گیا تھا وہ اس سلسلے میں دوسرا اعلان تھا۔ اس لیے پہلا اعلان البقرہ آیت: ۳۰ کا پہلا حصہ، اور تیسرا اعلان البقرہ آیت: ۳۴ کا پہلا حصہ تو لازماً النجر و ص کا اعلان دوسرا ہو گا لیکن اسے تخلیق و تسویہ اور انفاخ سے پہلے کا اعلان ہونا چاہئے۔ اس صورت میں یہ بتانا ہو گا کہ البقرہ آیت: ۳۱ تا ۳۳ کا واقعہ کب ہوا؟ اس لیے کہ یہ آیتیں کھول کر بتا رہی ہیں کہ آدم بنائے گئے، انہیں اسماء کا علم دیا گیا پھر ان اسماء کے تعلق سے، کوئی شے ملائکہ کے سامنے پیش کی گئی جس کا وہ جواب نہ دے سکے۔ پھر آدم کو حکم ہوا کہ وہ انہیں ملائکہ کو بتائیں اور انہوں نے بتادیا۔ اس پورے معاملے میں آدم کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ اور یہ حالت تسویہ اور انفاخ کے بعد کی ہے۔ لہذا بات یہ نہیں کہ اعلانات دو تھے یا تین اصل بات یہ ہے کہ حکم الہی کے مطابق آدم کے تسویہ اور انفاخ کے فوراً بعد ملائکہ نے آدم کو سجدہ نہیں کیا۔ تا وقتیکہ ان پر حجت پوری نہ ہو گئی اور ان پر ان کی غلطی واضح نہ کر دی گئی۔

بظاہر ایسا لگتا ہے کہ استفادہ، اعتراضات اور مشورے کے اس پورے لائحہ سوال کا جواب اللہ تعالیٰ نے نہیں دیا لیکن حقیقت برعکس ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ہر ایک چیز کو کافی حد تک واضح کر دیا اور ان پر اپنی رحمت پوری فرمادی۔

واقعہ یہ ہے کہ ملائکہ کا لائحہ سوال نہایت دقیق، بھرپور اور اہم ہے۔ اس میں اس پوری

کائنات کے سارے اہم سوالات اور بطور خاص خلیفہ اور خلافت کی حقیقت سے بنیادی بحث ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے بھرپور طریقے سے ان پر اپنی حجت پوری فرمائی۔ جو اس وقت ہمارے لیے بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ چنانچہ ہم اللہ تعالیٰ کی حجت کے تجزیے سے قبل لائحہ سوال کی تفسیح کرنا ضروری سمجھتے ہیں:

- (۱) پہلا سوال : خلیفہ الارض پر ہی کیوں بنایا جا رہا ہے۔ السماء میں کیوں نہیں؟
 (۲) دوسرا سوال : کائنات کی خلافت الارض میں کیوں قائم کی جا رہی ہے اور کائنات کا خلیفہ الارض میں کیوں بنایا جا رہا ہے جس کے ایک ٹکڑے یعنی ارض (Earth) میں ابھی فساد پیدا ہو چکا ہے اور خون بہایا گیا ہے اور یہ بھی فساد کر سکتا ہے اور خون بہا سکتا ہے۔
 (۳) تیسرا سوال : کائنات کا خلیفہ الارض کے ایک ٹکڑے میں کیوں بسایا جا رہا ہے خواہ وہ الجنت ہی کیوں نہ ہو (اور بعد میں اسے وہاں سے منتقل کر کے دوسرے ارضی ٹکڑے پر ہی کیوں نہ ہی بھیج دیا جائے جو یہ ارض ہے) بحیثیت مجموعی وہ السماء میں کیوں نہیں بسایا جا رہا ہے۔
 (۴) چوتھا سوال : چنانچہ کیوں نہ جنوں اور آدم کے بجائے ملائکہ کو خلافت دی جائے۔

(۵) پانچواں سوال : ہماری سمجھ کے مطابق خلافت کی اہلیت جنوں میں نہیں جو کلی حکم عدولی اور فساد کرتے ہیں بلکہ وہ اہلیت دراصل ہم ملک ملائکہ میں ہے جو کلی طور پر اتباع کرتے ہیں اور پوری طرح اللہ تعالیٰ کی جانب ہی متوجہ ہیں اور اس کے علاوہ کسی شے سے تعارض نہیں کرتے۔

(۶) چھٹا سوال : ہماری سمجھ میں خلافت کی اہلیت یہ ہے کہ کوئی مخلوق ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہے اور اس کی تسبیح اور تقدیس کرے۔

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے جو حجت قائم کی وہ نہایت دقیق تھی جس نے ملائکہ پر ثابت کر دیا کہ ان کے سارے سوالات یا تو بے جا قیاس کا نتیجہ ہیں یا مبنی پر غلط۔ اس پورے واقعہ کو قرآن نے اس طرح پیش کیا ہے:

”اور سکھلا دیئے اللہ نے آدم کو سب نام۔ سامنے کیا ان سب کو ملائکہ کے اور فرمایا: بتاؤ مجھے ان کے اگر تم سچے ہو۔ بولے پاک ہے تو ہمیں علم نہیں مگر جتنا تو

نے ہم کو سکھلایا ہے بیشک تو ہی ہے اصل جاننے والا حکمت والا۔ فرمایا: اے آدم
بنادے ملائکہ کو ان کے نام پھر جب بتادیے اس نے ان کے نام فرمایا کیا نہ کہا تھا میں نے
تم کو کہ میں خوب جانتا ہوں چھپی ہوئی باتیں آسمانوں کی اور زمین کی اور جانتا ہوں جو تم
ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو۔“

— ”ان آیات کے تعلق سے عام طور پر مفسرین کی تاویل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے
آدم کو تمام اشیاء کے نام سکھلا دیے اور اس کے بعد ملائکہ کے سامنے ان اشیاء کو پیش کر کے پوچھا
کہ ان کے نام مجھے بتاؤ۔ چنانچہ ملائکہ چونکہ ان اشیاء کو نہیں جانتے تھے لہذا بتانے سے عاجز ہوئے
اور اپنے عجز کا اظہار اس طرح کیا کہ اے اللہ تعالیٰ آپ پاک ہیں۔ ہمارے پاس تو صرف اتنا ہی علم
ہے جتنا آپ نے ہم کو دیا ہے۔ ہم اس سے زیادہ نہیں جانتے اور ان چیزوں کا علم تو نے ہمیں نہیں دیا
اس لیے ہم اس کے بتانے سے عاجز ہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آدم سے کہا کہ ان اشیاء کے نام
ملائکہ کو بتادو چنانچہ آدم نے بتادیے۔ چنانچہ جب آدم نے ملائکہ کو یہ بتادیے تو اللہ تعالیٰ نے کہا کہ
دیکھو میں نہ کہتا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کے غیب کا علم زیادہ رکھتا ہوں اور میں ان باتوں کو زیادہ
جانتا ہوں جو تم لوگ ظاہر کرتے ہو اور جو تم لوگ چھپاتے ہو۔“

اگر مفسرین کی یہ تاویل مان لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ملائکہ کا سوال درست تھا اور
اللہ تعالیٰ نعوذ باللہ اپنی حجت پوری کرنے میں ناکام رہے۔ اس تاویل کی تنقیح درج ذیل ہے:
(۱) اللہ تعالیٰ نے آدم کو ان اشیاء کے نام سکھلا دیے۔ مثلاً یہ کہ گھر کے کس بکس میں
روپیہ رکھا ہے یا لائبریری کی کون سی کتاب ’حجۃ اللہ البالغہ‘ ہے یا میدان میں جمع لوگوں میں کون
صدر مملکت ہے؟

(۲) اب اللہ تعالیٰ نے اس گھر کو یا اس لائبریری کو یا اس میدان میں جمع بھیڑ کو ملائکہ کے
سامنے پیش کیا اور پوچھا بتاؤ کہ روپیہ کہاں ہے یا روپیہ والا بکس کون سا ہے؟ اور حجۃ اللہ البالغہ کون
سی کتاب ہے؟ یا کون اس مجمع میں صدر مملکت ہے؟

(۳) چونکہ ملائکہ یہ سب نہیں جانتے تھے اس لیے وہ عاجز رہے اور کہا کہ اے اللہ تعالیٰ
ہم یہ سب بتانے سے قاصر ہیں۔ ہم تو صرف وہی جانتے ہیں جس کا آپ نے علم دیا ہے۔

(۴) اب اللہ تعالیٰ نے آدم سے کہا کہ اے آدم ملائکہ کو بتادو کہ روپیہ والا بکس کون سا

ہے؟ اور کون سی کتاب حجۃ اللہ البالغہ ہے؟ اور کون اس مجمع میں صدر مملکت ہے؟ چنانچہ آدم نے یہ سب بتلا دیئے۔

غور کیا جائے کہ اس تاویل سے حجت ملائکہ پر قائم ہوتی ہے یا ملائکہ کی حجت اللہ تعالیٰ پر۔ اس تاویل میں آدم کی خوبی اس علم پر قائم ہے جسے اللہ تعالیٰ نے آدم کو بتا دیا تھا۔ اور ملائکہ کا نقص اس علم سے تعلق سے ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو نہیں بتایا تھا۔ اس میں اس قول کی کیا گنجائش ہے کہ: میں نہ کہتا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کے غیب کا سب سے زیادہ علم رکھنے والا ہوں۔ اسی طرح اس بات کی کہ ملائکہ کیا ظاہر کر رہے تھے اور سب سے زیادہ اس بات کی کہ ملائکہ کیا چھپا رہے تھے۔

اس عاجز کے نزدیک یہ پورا معاملہ — یہ سوالات — اور اس پر اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حجت اتنی آسان نہیں کہ اس کی تاویل اس طرح سرسری طور پر کی جائے۔ جیسا کہ میں نے کہا کہ اسی حجت میں خلافت کائنات کے سارے حقائق پوشیدہ ہیں۔ اس لیے اس طرح کی تاویل کرنا کمال سادگی کا ہی نتیجہ ہو سکتا ہے۔ اب ہم اس کی حقیقی تاویل تک رسائی کے لیے اس کا تجزیہ کرتے ہیں:

(۱) وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ : سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے آدم کو سارے اسماء سکھا دیئے۔ اشیاء کی قید لگانا زائد ہے۔ تاہم اگر یہ بھی مان لیا جائے تو کوئی حرج نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سارے اشیاء کے نام آدم کو سکھا دیئے۔ مثلاً: لوہا، نمک، گھر۔

(۲) كُلُّهَا : اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ (۱) ساری اشیاء کے نام یعنی دنیا کی تمام اشیاء کے نام (۲) اشیاء کے اجمالی نام مثلاً: لوہا معدن ہے۔ نمک مزہ دار ہوتا ہے۔ گھر میں رہا جاتا ہے۔

(۳) ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ فَقَالَ أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَؤُلَاءِ :

اب اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے سامنے لوہا، نمک اور گھر حقیقی صورت میں پیش کیے۔ اور ان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ مجھے ان کے نام بتاؤ یہ کیا کیا ہیں؟

(۴) أَنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ : اگر تمہارا یہ کہنا درست ہے کہ فساد قطعانہ کرنا اور خون قطعانہ بہانا اور ہمہ دم بارگاہ رب العزت میں متوجہ رہ کر اس کی تسبیح و تقدیس کرنا ہی وہ عظیم ترین

خوبی ہے جو اس کی مستحق ہے کہ ایسی خوبی رکھنے والوں کو خلافت دی جائے۔ اور یہ کہ اس سے نہ عظیم الشان کوئی خوبی ہو سکتی ہے اور نہ کوئی مخلوق اس سے عظیم الشان خوبی سے ملائکہ کے علاوہ متصف ہے۔ — تو ثابت کر دے سب پر فائق ہو۔

(۵) قَالُوا سُبْحٰنَكَ — اِنَّكَ اَنْتَ الْحَكِيْمُ : ملائکہ اس سوال پر حیرت زدہ اور عاجز رہ گئے۔ ان کو کچھ بھی علم نہیں تھا کہ یہ اشیاء جو سامنے ہیں یہ فی الواقع کیا ہیں؟ انہوں نے کبھی انہیں دیکھا نہیں تھا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں بتایا نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے اظہارِ عجز کرتے ہوئے اپنی حقیقت کا اظہار کیا اور کہا: اے اللہ! ہم صرف وہی جانتے ہیں اور اتنا ہی جانتے ہیں جتنا آپ نے ہمیں بتایا ہے۔ چونکہ آپ نے ان کا علم ہمیں نہیں دیا اس لیے ہم یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ یہ سامنے نظر آنے والی چیزیں کیا ہیں۔ اور ان سب کا علم اور اس کی حکمت تو صرف آپ جانتے ہیں۔

(۶) قَالَ يٰۤاٰدَمُ اَنْبِئْهُمْ بِاَسْمَائِهِمْ : یہ ایک نازک بات ہے۔ اور اسے سمجھنے کے لیے شق نمبر ۲، ۱ اور ۳ کا تجزیہ ضروری ہے۔

(۱) شق نمبر ۱ اور ۲ میں جو یہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو سارے اسماء سکھا دیئے اور شق نمبر ۳ میں جو یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو ملائکہ کے سامنے پیش کر کے کہا کہ ان کے نام بتاؤ۔ یہ ایک ہی سکتے کے دورخ ہیں اور اس میں یہ بات نہیں کہ آدم کے ساتھ سکھا کر رعایت کی گئی اور ملائکہ کو نہ سکھا کر ظلم کیا گیا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو صرف اسماء سکھائے اور اشیاء نہیں دکھلائیں اور ملائکہ کو اشیاء دکھلا دیں اور نام پوچھا۔

چنانچہ جب ملائکہ کو اس آزمائش سے گزارا تو ان کے سامنے اشیاء کی حقیقت پیش کی اور نام پوچھا اور وہ بتانے سے قاصر رہے اور اس کا سبب بتایا کہ اے اللہ تعالیٰ آپ نے تو نام نہیں بتایا تھا۔ اب دوسرے مرحلے میں اللہ تعالیٰ نے آدم کے سامنے ان چیزوں کو مخفی رکھا جن کے صرف نام اسے بتائے تھے اور حکم دیا کہ جاؤ اس نام کی چیز ان کے سامنے پیش کرو۔ آدم نے لوہا یا نمک یا گھر کا نام تو سن رکھا تھا لیکن اس نے کبھی انہیں دیکھا نہیں تھا۔ اس نے اپنی عقل کا سہارا لیا اور غور و فکر کے بعد اور ان کے خواص کے تجزیے کے بعد انہیں پہچان لینے اور لا کر پیش کر دینے پر قادر ہو گیا جن کا اس سے مطالبہ کیا گیا تھا۔

اس کے لیے ایک مثال دینی ضروری ہے:

دو یکساں درجے کے دیہاتی جنہوں نے نہ تو کوئی علم سیکھا ہو، نہ دنیا دیکھی ہو لائے جائیں اور ایک کمرے میں رکھے جائیں۔ دونوں کو دو طرح کی آزمائشوں سے گزارا جائے۔ پہلے کو الگ بلا کر کہا جائے دیکھو ایک چیز انٹرنیٹ ہوتی ہے لیکن اسے نہ تو اس کی تفصیل بتائی جائے نہ دکھلایا جائے۔ اب دوسرے کو بلا کر ایک جگہ کھڑا کیا جائے اور اس کے سامنے انٹرنیٹ رکھ دیا جائے اور اس سے پوچھا جائے بتاؤ یہ کیا ہے۔ وہ جواب دے میں نہیں بتا سکتا۔ اب انٹرنیٹ کو پھر چھپا دیا جائے۔

اب پہلے کو بلا کر کہا جائے کہ جا کر کمرے میں سے انٹرنیٹ اٹھا لاؤ۔ وہ کمرے میں جائے۔ کمرے میں لاکھوں چیزیں رکھی ہوئی پائے جن کو اس نے کبھی نہیں دیکھا صرف نام سنے ہیں لہذا وہ نہیں جانتا کون سی چیز کیا ہے؟ لیکن وہ اپنی عقل سے کام لے اور چیزوں کے رنگ، شکل اور ان رنگوں اور شکلوں کے خواص پر غور کرے اور اپنی عقل سے یہ معلوم کر لے کہ اچھا فلاں چیز لوہا ہے اور فلاں چیز نمک اور فلاں انٹرنیٹ اور اس طرح انٹرنیٹ کو باہر لا کر پیش کر دے کہ لیجئے یہ انٹرنیٹ ہے چنانچہ آدم نے یہی کیا۔

ملائکہ کو نام نہیں بتائے گئے تھے لہذا وہ ان کے نام نہیں جانتے تھے لیکن وہ اشیاء بعینہ ان کے سامنے پیش کی گئیں اور وہ انہیں دیکھ کر یا چھو کر یا ان پر غور کر کے صرف یہ جان نہ سکے کہ ان اشیاء کا کیا نام ہے۔ اس کے برخلاف آدم نے صرف نام سنا تھا اور کبھی نہ شکل دیکھی تھی نہ حقیقت لیکن اس کے باوجود اس نے عقل سے کام لیا، شکل، رنگ اور بناوٹ پر غور کیا اور حقیقت پالی۔ غور کیا جائے تو پہلا سوال کمتر درجے کا ہے اور آسان ہے۔ دوسرا سوال پیچیدہ تر ہے اور مشکل۔

(۷) فلما انبأهم باسماءهم..... غیب السموات والارض : ظاہر ہے جب آدم نے ملائکہ کے مقابلے میں مشکل آزمائش میں کامیابی حاصل کر لی اور ملائکہ ناکام ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے کہتا تھا کہ میرا فیصلہ درست ہے کہ آدم ہی خلافت کائنات کے لائق ہے اور یہ کہ تم لوگ جو یہ خیال رکھتے ہو کہ فساد نہ کرنا اور خون نہ بہانا اور ہمہ دم بارگاہ رب العزت میں متوجہ رہ کر اس کی تسبیح و تقدیس کرنا ہی وہ عظیم ترین خوبی ہے جو اس کی مستحق ہے کہ ایسی خوبی رکھنے والوں کو خلافت دی جائے اور یہ کہ اس سے نہ عظیم الشان خوبی ہو سکتی ہے نہ کوئی اس سے زیادہ عظیم الشان خوبی سے ملائکہ کے علاوہ متصف ہے تو یہ بات غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں آسمانوں اور زمین کے غیب سے سب سے زیادہ باخبر ہوں۔ چنانچہ آدم تم سے بھی زیادہ عظیم الشان

صلاحیتوں کا الگ ہے۔

(۸) واعلم ما تبدون وما كنتم تكتمون : یہ فقرہ سب سے زیادہ غور طلب ہے خاص طور پر ان حضرات کے لیے جو ملائکہ کے سوال کو اعتراض تسلیم نہیں کرتے۔ اس کا ترجمہ عام طور پر یہ کیا جاتا ہے:

”اور جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو۔“

اگر یہ فقرہ اس معنی میں ہوتا تو اس کا متن یوں ہوتا:

”واعلم ما تبدون وما كنتم تكتمون“

جیسا کہ سورۃ النور آیت: ۲۹ میں ہے:

”والله يعلم ما تبدون وما كنتم تكتمون“

یا پھر اس کا متن ایسے ہوتا ہے!

”واعلم ما كنتم تبدون وما كنتم تكتمون“

جیسا کہ سورۃ آل عمران میں ہے:

”بما كنتم تعلمون الكتاب وبما كنتم تدرسون۔“

اس کا درست ترجمہ اس عاجز کے نزدیک یہ ہے:

”اور جانتا ہوں جو تم (اس وقت) ظاہر کر رہے ہو اور جو تم (عرصے سے اپنے

دلوں میں) چھپاتے چلے آ رہے ہو۔“

چنانچہ اس وقت ظاہر کرنا یہ ہے کہ الارض میں کیوں خلافت قائم کی جا رہی ہے اور اصلِ ارض آدم کو کیوں خلیفہ بنایا جا رہا ہے، اور یہ کہ کیا اس سے فساد سرزد نہ ہو گا اور خوں ریزی نہ ہو گی اور یہ کہ ہم تو آپ کی تسبیح اور تقدیس کر رہے ہیں۔ اور (عرصے سے اپنے دلوں میں) چھپاتے چلے آنا یہ ہے کہ اے کاش ہم ملائکہ کو خلیفہ بنایا جاتا۔

خلافت کائنات کی حقیقت

اللہ تعالیٰ نے ملائکہ پر یہ بات واضح کر دی کہ فساد اور ایسی خوں ریزی جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں ہو جہاں اس قابل نہیں کہ اس کی تحسین کی جائے بلکہ ایسا کرنے والے سزا کے مستحق ہوئے وہیں یہ بات بھی واضح کر دی کہ فساد و خوں ریزی سے دور ہونا اور ہر طرح کے علائق سے کنارہ کش ہو کر صرف تسبیح و تقدیس کرنا بھی قابل تحسین تو ہے مگر یہ وہ مطلوبہ صلاحیت نہیں جو خلافت کائنات کے شایان شان ہو۔ پہلی صورت میں نافرمانی ہی نافرمانی اور فساد ہی فساد کار حجان ہے اور دوسری صورت میں فرمانبرداری ہی فرمانبرداری اور کلیئاً توجہ الی اللہ کار حجان ہے۔ اس مقام پر چند امور کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے جو درج ذیل ہیں:

عالم خلق :

رب العالمین کا ایک نام — النور ہے۔ لیکن النور ہونا کیا ہے کہ اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔ اس النور کا اس مخزن نور سے صرف اتنا تعلق ہے کہ النور خالق کا ایک نام ہے اور مخزن نور مخلوق۔ چنانچہ اللہ رب العالمین نے تین مخازن سے تین انواع پیدا فرمائے۔ نور سے نوری انواع، نار سے ناری انواع اور ارض سے ارضی انواع۔ نوری انواع سے ملک ہیں، جن پر غلبہ فرمانبرداری اور کلیئاً متوجہ الی اللہ ہوتا ہے۔ عام طور پر ان کی طبیعت نہ نافرمانی کی طرف مائل ہوتی ہے نہ کسی اور بات کی طرف۔ وہ صرف اور صرف متوجہ الی اللہ ہوتے ہیں۔ ناری انواع سے جن ہیں۔ جن پر غلبہ نافرمانی اور فساد ہے۔ عام طور پر ان کی طبیعت فرمانبرداری کی طرف مائل نہیں ہوتی بلکہ نافرمانی، فساد اور قتل و غارتگری کی طرف عام رجحان ہوتا ہے۔ چنانچہ ملک عموماً اللہ تعالیٰ کے مطیع ہوتے ہیں اس طرح بیشتر مقربین ملائکہ ملک یعنی انواع نور سے ہی ہوتے ہیں۔ چنانچہ تمام ملائکہ کے سردار اور سب سے مقرب حضرت جبرئیل ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت میکال (قرآن نے صراحۃً صرف حضرت جبرئیل اور میکال کا نام لیا ہے)، حضرت اسرافیل اور حضرت عزرائیل ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایسے ملک جنہوں نے سرتابی اور نافرمانی کی ہو صرف ہاروت و ماروت ہیں۔ (ہر چند کہ قرآن اس پر خاموش ہے کہ وہ دونوں ملک جو انسانوں کے مابین آئے وہ کیوں آئے تھے اور پھر ان کا کیا انجام ہوا؟ لیکن اس امر کا یہاں تذکرہ بے محل ہوگا)

دوسری طرف انواع نار میں صرف ابلیس ہی فرمانبرداری، تقویٰ اور عبادت میں آگے بڑھایاں
تک کہ ملائکہ اور مقرب ہو گیا۔ چنانچہ ایسے ابناء نار جو فرمانبردار ہوئے نافرمانوں کے مقابلے میں
بہت ہی تھوڑے تھے اور مقرب تو غالباً صرف ایک ہو سکا۔

ان دونوں کے برخلاف اللہ رب العالمین نے ارض سے آدم کی تخلیق کی۔ آدم میں
دونوں مخلوقات یعنی ابناء نور اور ابناء نار کے مقابلے میں اعتدال تھا۔ یہ ارضی نوع فرمانبرداری بھی
کر سکتی تھی اور نافرمانی بھی۔ یہ دونوں کا مجموعہ تھی۔ اگر انواع نور میں خیر و شر کے تناسب کو ۹۹ اور ۱
قرار دیا جائے اور انواع نار میں ۱ اور ۹۹ تو گویا انواع ارض میں آدمی میں یہ تناسب ۵۰ اور ۵۰
تھا۔ اور اس کا سبب اس کے اندر پائی جانے والی دو اضافی قوتیں ہیں۔ یعنی (۱) عقل اور (۲) قوت
تمیز و تخیل۔ اس اعتبار سے اگر انواع نور یعنی ملک اور انواع نار یعنی جن کو مخلوق مضطرب یعنی انتہا
پسند مخلوق کہا جائے تو بیجا نہ ہو گا یعنی ملک مخلوق مضطرب للخیل اور جن مخلوق مضطرب للشر۔ جب
کہ ان دونوں کے مقابلے میں ابناء ارض مخلوق معتدل تھے۔ مخلوق معتدل تو وہ بنیادی طور پر نور اور
نار کے بجائے ارض کے ہونے کی وجہ سے تھے لیکن یہ بجائے خود کوئی خوبی نہ تھی۔ ابناء ارض کے
پاس اس اعتدال پر مستزاد و اور خوبیاں تھیں۔ جن کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو تھا۔ نہ اس سے ملک
وائف تھے نہ جن۔ چنانچہ ابناء ارض کی ان دو میں سے ایک خوبی اسے ابناء نور سے ممتاز کرتی تھی اور
دوسری ابناء نار سے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں مخلوقات یعنی ملک اور ابلیس پر آدم کی یہی خوبیاں
منکشف کیں۔ چونکہ ملک اور جن الگ الگ طبیعت کے مالک تھے اس لیے ان کے رویے الگ الگ
ہوئے جو درج ذیل ہیں:

(۱) ملک پر اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح کر دی کہ ان کے پاس کوئی آزاد عقل نہیں اور وہ
کلی طور پر مزدود و محروس عقل (Recorded & Regulated Intuition) سے متصف
ہیں۔ جب کہ آدم آزاد عقل رکھتا ہے۔

جب یہ بات ملک پر واضح کر دی گئی تو وہ حسب عادت فوراً نہ صرف اطاعت کی طرف
راجع ہو گئے بلکہ انہوں نے آدم کی خلافت کو کلی طور پر تسلیم کر لیا اور اب بحیثیت خلیفہ خلافت کی
تمام ذمہ داریوں میں آدم کا ساتھ دینے کا عہد کیا۔

(۲) جن یعنی ابلیس کا رویہ ملک سے بالکل مختلف تھا اس نے اپنا مسئلہ دوسری طرح سے

پیش کیا۔ اس نے استفادہ یا استفار حتیٰ کہ اعتراض کرنے کے بجائے ترمذ اسب سے پہلے سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنی خلافت کا دعویٰ اس طرح پیش کیا جس کا ذکر گزر چکا ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے ان دونوں نافرمانیوں کے بعد بھی اس سے کلام فرمایا اور پوچھا کہ آخر اس نے ایسا کیوں کیا تو اس کا جواب تکبر سے بھرا ہوا اور سرکشی پر مبنی تھا۔ یہ پورا مکالمہ غیر معمولی ہے اور دقیق نکات بیان کرنے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے پوچھا: قال ما منعك الا تسجدا اذا امرتك. (الاعراف: ۱۲)

ترجمہ: کہا! کس چیز نے تجھ کو روکا کہ تو سجدہ نہ کرے جب کہ میں نے تجھ کو حکم دیا تھا۔ بات اگر صرف یہ ہوتی یعنی 'ما منعك الا تسجد' تو کوئی بات نہیں تھی۔ بات غیر معمولی اس لیے ہو گئی کہ اس قول میں اصل زور 'الا تسجد' پر نہیں بلکہ اس کے بعد کے فقرے پر ہے۔ یعنی 'اذا امرتك'۔ خلاف معمول اور اب تک اپنے ریکارڈ کے برعکس اس کا جواب ابلیس نے دیا: 'قال انا خیر منه' (اس نے کہا میں اس سے بہتر ہوں) اور اس پر مستزاد — خواہ اللہ نے پوچھا ہو کہ کیسے خواہ نہ پوچھا ہو — اس نے اس کا سبب بتایا:

خلقتنی من نار وخلقته من طین۔ (آپ نے مجھے آگ سے بنایا اور اے مٹی سے)

(الاعراف: ۱۲)

چونکہ ملک کی طرح اس نے اللہ تعالیٰ سے حقیقت کے جاننے کی کوشش نہیں کی نہ ہی کچھ ایسا اعتراض کیا کہ جس کے بعد اس کی غلط فہمی یا غلطی اس پر واضح کی جاتی بلکہ اس کے بجائے اس نے اللہ تعالیٰ پر ان کی غلطی واضح کرنے کی کوشش کی کہ وہ آگ سے بنا ہے اور آدم مٹی سے آگ والا اس مٹی والے سے افضل ہے بھلا اللہ نے افضل کو مفضل اور مفضل کو افضل کیسے بنادیا؟ ظاہر ہے اس ترمذ کی اسے سزا ملتی چنانچہ اس سے کہہ دیا گیا:

قال فاهبط منها فما یكون لك ان تتکبر فیها فاخرج انک من الصاغرين۔

(الاعراف: ۱۳)

ترجمہ: کہا اتر یہاں سے — تو اس لائق نہیں کہ تکبر کرے یہاں — پس باہر نکل۔

تو ذلیل ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اس عتاب پر نادم ہو کر تائب ہونے کے بجائے اس نے اللہ تعالیٰ کو اس

طرح چیلنج دیا:

قال انظرني الى يوم يبعثون۔

ترجمہ: کہا مجھے اٹھائے جانے کے دن تک مہلت دے دیجئے۔

گویا اس نے کہا ذرا مجھے ایک موقع تو دیجئے پھر میں ثابت کر دوں گا کہ آپ غلط ہیں یا میں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کو موقع عنایت فرمادیا:

قال فانك من المنظرين۔

ترجمہ: کہا: تحقیق تو مہلت دیئے جانے والوں میں سے ہو گیا۔

یہاں غور طلب بات آدم کی وہ خوبی ہے کہ جو اسے ابناء جن سے ممتاز کرتی ہے۔ جسے اگر ابلیس موقع دیتا تو اللہ تعالیٰ اس پر اسی وقت واضح کر دیتا جیسا کہ اس نے ملک کے ساتھ کیا تھا۔ لیکن اب صورت بدل چکی تھی لہذا اب ابلیس کو اجازت مل گئی اور عند اللہ یہی بات ہے کہ بالآخر آدم ابلیس پر اپنی وہ برتری ثابت کر کے رہے گا۔ جنوں کے مقابلے میں آدم کی وہ خوبی خیر و شر میں قوت تمیز ہے۔ یہی وہ قوت ہے جس کا نقد ان ابناء نار کو فساد اور خونریزی اور نافرمانی کی طرف لے جاتا ہے اور یہی وہ قوت ہے جو آدم کے پاس بطور خاص ہے۔ اس اعتبار سے خلیفۃ اللہ کی آزمائش عقل اور تخمیر ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ خلیفۃ اللہ کا اصلی منصب کیا ہے اور اس کی منجہ کیا ہے؟

رب کائنات کی ربوبیت کے منصوبے میں ایک ایسی خلقت کا ظہور تھا جو خلقت اس رب کائنات کی ربوبیت کی مظہر اتم ہوتی اور وہی خلقت اس کی مستحق ہوتی کہ وہ خلافت اللہ کی حامل ہوتی اور اسی میں وہ ذات ہوتی جو اپنی ذات میں خلیفۃ اللہ ہوتی۔^۹

چنانچہ وہ خلقت جو خلافت اللہ کی مستحق ہوتی دراصل وہ لوگ ہیں جو بحیثیت مجموعی اپنے نفس کو روح اور روح کو نفس مطمئنہ بنانے میں کامیاب ہو جائیں۔ اور جو لوگ اس کامیابی کو پالیں وہی اس مقام کے مستحق ہیں جسے قرآن نے 'مقعد صدق عند ملیک مقتدر' کہا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ان المتقين في جنات ونهر في مقعد صدق عند مليک مقتدر (القمر: ۵۴-۵۵)

ترجمہ: بے شک متقین جنت اور ندی میں ہیں۔ سچی بیٹھک میں نزدیک ہمیشہ قائم بادشاہ

کے جس کا سب پر قبضہ ہے۔

میں نے 'بحیثیت مجموعی' کا جو ذکر کیا ہے اس کی کہہ یہ ہے کہ ہر چند کہ مطلوب اور محبوب یہی ہے کہ سارے انسان المتقین ہو کر مقعد صدق کا حصول کریں۔ لیکن عملاً ایسا نہیں ہوگا۔ بلکہ ان میں سے کچھ کفر کر کے ناکام ہو جائیں گے اور جہنم کی طرف چلے جائیں گے۔ اب باقی بچے وہ انسان جنہوں نے کفر نہیں کیا۔ تو مطلوب تو یہی ہے کہ وہ سارے کے سارے مقعد صدق کا حصول کر لیں۔ لیکن عملاً ایسا بھی نہیں ہوگا۔ بلکہ ان میں سے کچھ شرک کے علاوہ گناہ کبیرہ و صغیرہ کر کے اور توبہ کے بغیر زندگی گزار کر ناکام ہو جائیں گے اور جہنم کی طرف چلے جائیں گے۔ اور ایک مدت تک وہاں سزایاب ہوں گے۔ اب باقی بچے وہ انسان جو فی الواقع المتقین کی طرح اپنے نفس کو روح تک اور روح کو نفس مطمئنہ تک لے جانے میں اسی دنیا میں کامیاب ہوں گے اور وہ یوم الدین کے بعد سیدھے مقعد صدق تک چلے جائیں گے۔ اگر کہا جائے تو بہت سے ایسے نفوس قدسیہ ہیں جو اسی حیات میں اپنے نفس کو روح تک اور روح کو نفس مطمئنہ تک لے جانے میں کامیاب ہوتے ہیں اور اسی حیات میں مقعد صدق تک پہنچ جاتے ہیں۔ چونکہ کوئی نفس بشر اسی حیات میں مقعد صدق کا عملاً حصول نہیں کر سکتا اس لیے کہ اس کے حصول میں موت، برزخ اور یوم الدین خارج ہیں اور اس لیے وہ عملاً کے بجائے ان دروازوں سے گزرنے سے قبل صرف حکماً ہی مقعد صدق کا حصول کر پاتے ہیں۔ چنانچہ یہی لوگ عشرہ مبشرہ ہیں اور ان سے اوپر حضرات انبیاء کرام۔

یہ تو مقام ہے اس گروہ کا جو خلافت اللہ کا حامل ہے۔ لیکن اس مقام کا صدر نشین وہ فرد ہے جو فی الواقع ذات کے اعتبار سے خلیفۃ اللہ ہے۔ اور اس صدر نشین کا ایک منصب ہے جو دراصل خلیفۃ اللہ کا ذاتی منصب ہے۔ اور اسی منصب کا نام مقام محمود ہے۔ مقام محمود نام ہے اس مقام کا جو اس پورے منصوبہ کائنات کا حاصل ہے۔ اور اس مقام پر جاگیر ذات ہی فی الواقع خلیفۃ اللہ کائنات ہے۔

اور یہی وہ مقام ہے جس پر سردار کون و مکان، اشرف الناس، اشرف الانبیاء، خاتم النبیین، حضرت محمد ﷺ فائز ہونے والے ہیں۔

یہ سمجھنا قطعاً مشکل ہے کہ یہ مقام کیا ہے؟ لیکن ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ اس مقام پر

آنحضور ﷺ کا فائز ہونا صرف ذات اقدس کا فائز ہونا نہیں بلکہ:

(۱) تمام نفوس کی طرف سے فائز ہونا ہے جو پہلے درجے کے المتقین ہیں۔ اور اس دنیا سے سیدھے الجنۃ میں جانے کے مستحق ہیں۔

(۲) تمام ان نفوس کی طرف سے فائز ہونا ہے جو دوسرے درجے کے المتقین ہیں اور اس دنیا کے بعد گناہوں کے سبب جہنم میں جائیں گے اور پھر الجنۃ میں جانے کے مستحق ہوں گے۔

(۳) تمام ان نفوس کی طرف سے فائز ہونا ہے جو تیسرے درجے کے المتقین ہیں اور اس دنیا میں ہی مقام المتقین سے اٹھنے کے بجائے کفر و شرک کر کے نیچے گر گئے اور اس سبب سے جہنم میں جائیں گے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آگ میں رہیں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ صورت حال دراصل مقام محمود پر آنحضور ﷺ کو عملاً فائز کرانے سے پہلے کی ہے۔ اس وقت آپ کی دعا فرمائیں گے اس کا علم اللہ تعالیٰ کو ہی ہے اس لیے بعض علماء کا یہ خیال ہے کہ اپنے مقام سے کفر و شرک کرنے کی وجہ سے گر جانے والے ایسے المتقین کے لیے قرآن میں بیان کردہ، فی نار جہنم خالدین ابدآ سے مراد محض زمان و مکان کی موجودہ اصطلاح میں دوام ہے۔ (ورنہ اس کی حقیقت اللہ ہی جانتے ہیں۔)

(۴) تمام ان نفوس کی طرف سے فائز ہونا ہے جو کسی درجے میں مخلوقات مختار ہیں یعنی ابناء نور، ابناء نار اور ابناء ارض۔

(۵) حتیٰ کہ اس مقام محمود پر آنحضور ﷺ کا فائز ہونا دراصل پورے ماکان و مایکون کی طرف سے فائز ہونا ہے۔

اور یہی مقام محمود ہے۔ اور یہی خلافت کبریٰ ہے۔ مقام محمود اس مقام کا نام ہے۔ اور اس مقام کے حامل کے انعامات یا اختیار کو اللہ تعالیٰ نے ایک اور لفظ سے واضح کیا ہے اور وہ لفظ ہے:

الکوثر

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

انا اعطیناک الکوثر۔ (الکوثر: ۱)

ترجمہ: بے شک اے محمد! ہم نے آپ کو الکوثر عطا کر دیا۔

یہ الکوثر کا عطا کیا جانا خیر کثیر کا عطا کیا جانا نہیں جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے بلکہ یہ وہ عظیم ترین اعلان ہے جو دراصل منصوبہ کائنات کی تکمیل کا اعلان ہے! اس اعلان کا مفہوم ہے:

(۱) اے محمد! ہم نے آپ کو مقام محمود عطا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

(۲) اے است محمدیہ! ہم نے تم کو خلیفہ بنانے کا جو فیصلہ کیا تھا وہ درست تھا میں —

اللہ — اس کی توثیق کرتا ہوں۔

(۳) اے بنی آدم! ہم نے تم کو خلیفہ بنانے کا جو فیصلہ کیا تھا وہ درست تھا میں — اللہ —

اس کی توثیق کرتا ہوں۔

(۴) اے میری کائنات! ہم نے تجھے کائن کر کے اپنی ربوبیت کا جو اظہار کرنا چاہا تھا میں —

اللہ — اس کی توثیق کرتا ہوں۔

چونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ بشارت اس دنیا میں اور آپ ﷺ کے عالم اشیاء یعنی نفس کی حالت

میں ہونے کی صورت میں دی اور ابھی اس کے اصل تک پہنچے (Realise or Actualise)

ہونے میں موت، برزخ اور یوم الدین کے پردے حائل تھے اس لیے یہ الکوثر یعنی مقام محمود کی

خوش خبری ہی نہیں بلکہ حکما اس کا حصول تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

عسیٰ ان یبعثک ربک مقاما محمودا۔ (اسری: ۷۹)

ترجمہ: قریب ہے کہ تیرا رب تیری بعثت کر دے مقام محمود میں۔

واضح ہو کہ یہی سبب ہے کہ سورہ الکوثر کے نزول کے تعلق سے یہ اختلاف ہے کہ یہ سورہ

مکی ہے یا مدنی۔ دراصل جب سے کائنات بنی اور پھر جب سے اس میں معرکہ خیر و شر کا آغاز ہوا

کائناتی سطح (Macro Cosmic Plane) پر یہ وہ آخری مرحلہ تھا جب اللہ تعالیٰ اپنے

کائنات کے خلیفہ اصل کو عالم اشیاء کے مراحل سے گزار رہا تھا اور اب کائناتی سطح پر وہ گھڑی آگئی

تھی جب اس کا فیصلہ کیا جاتا اور اس کی توثیق کی جاتی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیفہ کو جنت ماویٰ

کے قریب بلایا۔ اور بلانے سے قبل ان کی تمام انبیاء کی ارواح سے توثیق کرائی کہ وہ ان کے سردار

ہیں اور یہ کہ وہ انبیاء ان کی قیادت میں مطمئن ہیں۔ پھر انہیں ایک مقام پر لے جا کر اپنا نور میں سے

سب سے مقرب حضرت جبرئیل سے یہ کہلایا کہ اب آپ آگے تشریف لے جائیں اس کے آگے

جانے کی تاب کسی بنی نور میں نہیں۔ اسی دوران بلکہ اس سے قبل اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس متعدد

صدق اور اس الجنة اور اس نہر کا مشاہدہ کر دایا۔ واپسی میں بشارنا چند ہی ونوں کے اندر اس سورۃ کے ذریعہ تسلی دی جس کا ذکر حضرت عائشہ، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن زبیر نے کیا ہے۔ اسی طرح مزید تسلی کے لیے اور اس وقت جب آنحضور ﷺ عالم اشیاء میں خلافت کبریٰ کے حصول کی آخری کارروائی کا مرحلہ شروع کر چکے تھے یعنی الفتح اور بدر سے قبل ہجرت تو اللہ تعالیٰ نے مزید تسلی دی۔ (ان شاء اللہ ان کی تفصیلات آئندہ آئیں گی) اور فرمایا:

عسى ان يبعثك ربك مقاماً محموداً۔ (اسرئ: ۷۹)

جو حضرات قرآن میں روخ رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ کتنی غیر معمولی، سنگین اور فیصلہ کن (Critical) گھڑی تھی۔ پوری کائنات کی تاریخ میں شاید ہی کائنات — معرکہ خیر و شر شروع ہونے کے بعد کبھی ایسی قیامت کی گھڑی سے گزری ہو اور ایسے وقت میں پوری کائنات میں جو طوفان برپا تھا اس میں آپ ﷺ کے لیے اس کی شدید ضرورت تھی کہ ان کی تسلی کی جاتی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ومن الیل فتھجد به نافلة لك۔ (اسرئ: ۷۹)

ترجمہ اور رات کے تھوڑے حصے میں بیدار رہ قرآن کے ساتھ یہ تمہارے لیے اللہ کی توجہ اترنے کا سبب ہو گا۔

اگرچہ اس کی تفہیم کے لیے یہ مثال شایان نہیں تاہم تقریب فہم کے لیے یہ مثال دینی ضروری سمجھتا ہوں تاکہ اس صورت حال کا نقشہ عام لوگوں کی سمجھ میں بھی آجائے:

پوری کائنات میں ایک کائناتی جنگ کے آثار ہیں۔ یہ کائناتی جنگ دراصل وہ جنگ ہے جس میں سارے ملائکہ اور مومنین ایک جانب ہیں اور سارے نافرمان ابناء نور، ابناء نار اور ابناء ارض ابلیس کے ساتھ ہیں۔ ابلیس ہر طرح کے ہتھیار جس میں جوہری اور کیمیائی ہتھیاروں سے بھی اربوں گناہ زیادہ خطرناک ہتھیاروں سے اور پوری کائنات میں لڑنے کے لیے حملہ کرنے ہی والا ہے۔ اس جنگ میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کے لیے کائنات میں کسی رسول کے ذریعہ کی جانے والی آخری ہجرت کا فیصلہ کیا اور اس طرح اسے بعض مصالح کے سبب ملائکہ کے ذریعہ ایک محفوظ مقام سے دوسرے محفوظ مقام میں منتقل کرنے کا فیصلہ لے چکا ہے یا لینے والا ہے۔ کسی بھی وقت وہ بھیانک لڑائی چھڑ سکتی ہے اور کائنات تہہ و بالا

ہو سکتی ہے۔ ٹھیک ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو مطلع کرتا ہے اور تسلی دیتا ہے کہ سارے انتظامات ٹھیک ٹھیک ہیں۔ ابلیس اپنی فوج کے ساتھ چاہے جدھر سے حملہ کرے ملائکہ مومنین کی مدد کریں گے۔ اور یوں تو اس جنگ میں فتح اے رسول آپ کی ہی ہوگی اور ابلیس آپ کو مقام محمود کے پانے سے روکنے میں ناکام ہو جائے گا۔ اور یہ کہ ملائکہ اور مومنین سب ٹھیک ٹھیک تیار ہیں اب آپ سارے کاموں کے ساتھ اس کا بھی التزام کریں کہ ہمہ وقت Hot Line پر مجھ سے ربط رکھیں۔ یہ ہے وہ پوری مثال جو اس آیت کی تفہیم کے لیے ضروری تھی۔

اور پھر چند سالوں کے بعد بدر کا واقعہ ہوا جس میں مومنین آنحضرت ﷺ کی قیادت میں خلافت کبریٰ کی راہ میں آنے والی اس ہولناک آزمائش میں کامیاب رہے تو اللہ تعالیٰ نے مقام محمود کی توثیق کر دی۔ اور اس طرح سورہ الکوثر نازل ہوئی جس کی روایت حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کی ہے۔

باب چہارم

معرکہ خیر و شر کی تاریخ

تازہ مرے ضمیر میں معرکہ کہن ہوا
عشق تمام مصطفیٰ عقل تمام بولہب
اقبال

معرکہ خیر و شر کی اس تاریخ کو جو فائنظر نی الی یوم یبعثون کے جواب میں فائدہ من المنظرین سے شروع ہوتی ہے تفہیم کی آسانی کے لیے — ہم دس حصوں یا مرحلوں میں منقسم کرتے ہیں اور پھر ان میں سے ہر حصے میں نہایت مختصر طور پر جائزہ لیں گے کہ معرکہ کی کیا صورت حال رہی۔ ان دس مرحلوں کا ہم آٹھ پہلوؤں سے جائزہ لیں گے۔ یہ آٹھ پہلو ہیں:

(۱) مرکزی میدان کار (۲) تفریقین (۳) وسعت دائرہ معرکہ (۴) حکمت عملی: طریقہ کار (۵) اسلحہ: قوت (۶) ہلاکت و نقصان (۷) نتیجہ (۸) مابعد اثر (Post Effect)۔

چنانچہ یہ دس مرحلے درج ذیل ہیں:

(۱) مرحلہ اوّل : آدم قدیم

جس وقت سجدہ آدم کا حکم ہوا اور ملائکہ نے آدم کو سجدہ کیا اور ابلیس نے انکار۔ اس وقت آدم عالم عصر سے نکل کر عالم اشیاء میں آچکے تھے۔ لیکن یہ وہ آدم نہیں تھے جو دوسرے مرحلے میں وہ ہو گئے۔ اس کے پہلے مرحلے میں وہ آدم قدیم تھے۔ آدم قدیم آدم کی وہ حالت تھی جب حضرت حوا کا جسم ان سے جدا نہیں ہوا تھا اور وہ بیک وقت اپنی ذات میں آدم اور حوا دونوں تھے۔ چنانچہ ملائکہ نے جس آدم کو سجدہ کیا اور ابلیس نے جس کا انکار وہ آدم و حوا دونوں بیک جان تھے۔ یہی وہ دور ہے جسے قرآن نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

خلق منها زوجھا۔ (النساء : ۱)

اس میں منہا کی ہا جس کی طرف راجع ہے وہ وہی آدم اور ان کا جسم ہے۔ چنانچہ اسی جسم کو کہا گیا کہ وہ الجنة میں جا کر رہے۔ قرآن نے کہا:

و قلنا یا ادم اسکن انت۔ (البقرہ : ۳۵)

ترجمہ: اور ہم نے کہا اے آدم! بس جاؤ تم۔

اس وقت الجنة میں صرف آدم قدیم تھے۔ اور کوئی نہ تھا۔ یہی پہلا مرحلہ تھا۔ اللہ ہی جانتا ہے یہ مرحلہ کتنے سالوں یا کتنے ہزار سالوں پر مشتمل تھا۔ تمام تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مرحلے میں ابلیس جو اب شیطان ہو چکا تھا اپنی تدبیروں میں کلیتہاً ناکام رہا اور وہ آدم قدیم کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکا۔ اس طرح یہ مرحلہ شیطان کی کلی ناکامی پر منتج ہوا۔ اس ناکامی نے شیطان کو باور کرایا کہ وہ طریقہ کار جس پر وہ اب تک عامل رہا ہے بے سود رہا لہذا اسے اس حکمت عملی کو وسعت دینی چاہئے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس وقت تک ابلیس نے تنہا کوشش کی تھی۔ اور آدم قدیم بمقابلہ ابلیس کا معاملہ تھا اور طریقہ جنگ محض ایک قوی کوشش تھی جس کا آدم قدیم نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔

(۲) مرحلہ دوم : آدم و حوا

الجنة کا دوسرا دور وہ ہے جب اللہ تعالیٰ نے آدم کے جسم سے حوا کو الگ کر دیا۔ قرآن کا بیان ہے: خالق منها زوجها۔ (النساء: ۱)

ترجمہ: اور اس سے پیدا کیا اس کا جوڑا۔

اس 'زوجہا' میں آدم قدیم کے دو حصے کیے گئے اور ہر حصہ دوسرے کا زوج قرار پایا۔ چنانچہ سورہ البقرہ میں 'وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ مَعَ الْبَرِّ' میں 'و' کو عطف سمجھنا درست نہیں۔ بلکہ فصل زمانی ہے۔ جب آدم کو الجنة میں بسایا گیا تو وہ تنہا تھے۔ اس لیے 'اسکن' کا اطلاق صرف آدم قدیم پر ہو گا حوا پر نہیں۔ اس وقت تک حوا پیدا ہی نہیں ہوئی تھیں۔ لہذا اس آیت میں 'و' کا مفہوم وہ نہیں جہاں اذهب انت واخوك (طہ: ۳۲) میں 'و' کا ہے۔ ممکن ہے یہاں یعنی طہ: ۳۲ میں بھی فصل زمانی ہی ہو۔ چنانچہ پہلے مرحلے میں شیطان کی کوششوں کے باوجود اس کے ناکامی اور اس کے ذریعہ نئے طریقہ کار، نئی قوت اور نئی حکمت عملی کے اختیار کرنے کا علم اللہ تعالیٰ کو تھا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس مرحلے میں آدم و حوا کو پوری رہنمائی عطا کر دی کہ شیطان کیا کچھ کر سکتا ہے اور اسے ناکام بنانے کے لیے آدم و حوا کو کیا کرنا اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔ چنانچہ اس حکمت عملی کے تحت اللہ تعالیٰ نے دو تجویزیں دیں۔ ایک معروف اور دوسری منکر۔

• معروف: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وکلا منها رغدا حیث شئتما۔ (البقرہ: ۳۵)

ترجمہ: اور کھاؤ اس میں جو چاہو جہاں کہیں سے چاہو۔

منکر: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ولا تقربا هذه الشجرة۔ (البقرہ: ۳۵)

ترجمہ: اور پاس مت کرنا اس الشجرہ کو

چونکہ دوسرے مرحلے کا مرکزی دائرہ کار الجنة تھا۔ جس میں شیطان کا داخلہ ممکن نہ تھا۔ اس لیے اس نے قوت کار اور طریقہ جنگ میں تبدیلی کی جو دو باتوں پر مشتمل تھی۔ اس نے پہلی کوشش کی اور اپنے ساتھ ایک ملک کو ملانے میں کامیاب ہو گیا جس کا داخلہ الجنة میں ممکن تھا۔ اور دوسری کوشش تدبیری تھی اور اب اس نے اپنی توجہ کامرکز آدم و حوا کی ساخت کو بنایا۔

چنانچہ اس نئی تدبیر سے وہ پہلی بار ایک عظیم کامیابی سے ہم کنار ہوا۔ قرآن نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے:

فازلہما الشیطان عنہا۔ (البقرہ: ۳۶)

ترجمہ: پھر ہلا دیا شیطان نے ان کو اس جگہ سے۔

ابلیس کی یہ عظیم ترین کامیابی آدم کی بدترین ناکامی تھی۔ اس کا نتیجہ ابلیس کے لیے نہایت مفید ثابت ہوا۔ اس کا معمول (آدم) اب اس کی دسترس سے دور الجنتہ میں محفوظ و مامون نہیں رہ گیا وہ اپنے شکار کو اس محفوظ و مامون جگہ سے ایسے کھلے میدان میں لانے میں کامیاب ہو گیا جہاں اس کی رسائی بلا واسطہ تھی۔ دوسری طرف آدم کے لیے اس کا نتیجہ تباہ کن (Disastrous) ہوا جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱) آدم و حوا نے اللہ کی نافرمانی کی۔

(۲) الشجرۃ کے قریب ہو گئے اور اس کا مزہ لے لیا۔ چنانچہ اس کے قریب ہونے اور مزہ لینے کا جو نتیجہ برآمد ہوا وہ ایک فساد عظیم تھا جو آدم و حوا میں پیدا ہو گیا۔ قرآن نے اس پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے جس سے ابلیس کے طریقہ جنگ، حکمت عملی، اسلحہ، مقصد، نتیجہ اور فساد عظیم سب پر روشنی پڑتی ہے۔ قرآن نے فرمایا:

فوسوس لہما الشیطان لیبدی لہما ماوری عنہما من سواتہما

(الاعراف: ۲۰)

ترجمہ: اس نے ان دونوں کے اندر دوسوہ ڈلوایا تاکہ کھلوادے ان پر وہ جو ان

کی نظر سے پوشیدہ ہے ان کے جسم میں۔

اس کا یہ ترجمہ جو عام طور کیا جاتا ہے اس عاجز کے نزدیک درست نہیں:

”پھر بہکایا ان کو شیطان نے تاکہ کھول دے ان پر وہ چیز کہ ان کی نظر سے

پوشیدہ تھیں ان کی شر مگاہوں سے۔“

الشیطان کی رسائی الجنتہ تک اب نہیں رہ گئی تھی۔ اس لیے وہ آدم و حوا کو راست بہکا نہیں سکتا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی ساری تدبیریں پہلے مرحلے میں ناکام ہو گئی تھیں۔ اس لیے الشیطان کی اب اس دوسرے مرحلے میں پہلی ترجیح تھی آدم و حوا کو الجنتہ سے باہر نکالنا۔ اس لیے کہ الشیطان الجنتہ میں بلا واسطہ دوسوہ نہیں ڈال سکتا تھا۔ بلا واسطہ دوسوہ کے لیے — فی یا ب — آتا

ہے۔ ل یا اہلی نہیں۔ (ملاحظہ ہو طہ: ۱۲۰ اور الناس: ۵ اور ق: ۱۶)

یہاں ان تمام امور کی تفصیل کے بیان کرنے کا موقع نہیں بہر حال اس نے ایسی حکمت عملی اپنائی کہ آدم و حوا اس الشجرۃ کو قریب کر بیٹھے اور انہیں اس کا مزہ مل گیا۔ جس سے ان کے جسم میں تبدیلی ہو گئی۔ اور یہ ایک فساد عظیم تھا۔ اور الشیطان یہی چاہتا تھا۔ اس نے اس کا تو علم حاصل کر لیا تھا کہ الجنۃ کی میکا نکیت کیا ہے؟ آدم کی میکا نکیت کیا ہے؟ چنانچہ الجنۃ سے آدم کو باہر لانے کی ایک سی صورت اسے سمجھ میں آئی اور وہ یہ تھی کہ ان دونوں کی میکا نکیت میں ایسی تبدیلی کر دی جائے کہ یہ دونوں یعنی آدم و حوا اور الجنۃ ایک دوسرے کو Accomodate نہ کر سکیں۔ ظاہر ہے وہ الجنۃ کی میکا نکیت کو تباہ نہیں کر سکتا تھا اور آدم و حوا کی میکا نکیت کو آدم و حوا کے تعاون کے بغیر تباہ نہیں کر دیا جاسکتا تھا۔ اس لیے اس نے ایک الگ طرح کی راہ نکالی۔ اور اس میں کامیاب ہو گیا۔

(۳) آدم و حوا کو فوراً علم ہو گیا کہ انہوں نے غلطی کر ڈالی ہے۔ لہذا وہ تائب ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی نافرمانی کے گناہ کو معاف کر دیا۔ لیکن وہ طبعی اور روحانی فساد جو الشجرۃ کے مزہ لینے سے پیدا ہوا تھا۔ اس کے اثرات نے آدم و حوا کو الجنۃ کے لیے غیر مناسب (Unsuitable) بنا دیا۔ چنانچہ مغفرت کے باوجود آدم و حوا کو الجنۃ سے باہر جانے اور زمین پر بسنے کا حکم ہوا۔ اس طرح اب وہ اپنے دشمن کے بلا واسطہ ضرب کے لیے کھلے میدان میں اس کے سامنے تھے۔

(۴) غور کرنے سے ایسا لگتا ہے کہ الجنۃ میں اللہ تعالیٰ نے آدم و حوا کے اندر Internal Evolution یا (Closed-Circuit External Evolution) کی سنت جاری فرمائی تھی۔ یعنی ممکن ہے کہ الجنۃ میں سارے انسان پیدا ہوتے جن کو آدم سے قیامت تک پیدا ہونا تھا لیکن وہ آدم و حوا سے باہر نکل کر الگ الگ پیدا نہ ہوتے بلکہ ممکن ہے کہ ہر چند لمحوں کے بعد آدم و حوا کا جسم ہی ان لوگوں کے جسم میں بدل جاتا۔ یہ Internal Evolution ہے۔ اس کی حقیقت ایک مثال سے اس طرح سمجھی جاسکتی ہے کہ ایک آدمی کے جسم میں دس طرح کے عناصر آج بھی ایسے پائے جاتے ہیں جو الگ الگ مدت میں بدل جاتے ہیں یا فنا ہو جاتے ہیں جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) وہ عنصر یا عناصر جو ہر سکند پیدا ہو کر مرتے رہتے ہیں۔ مثلاً بعض سیل Cell وغیرہ

- (۲) وہ عنصر یا عناصر جو ہر منٹ پیدا ہو کر مرتے رہتے ہیں۔ مثلاً بعض سیل وغیرہ
 (۳) وہ عنصر یا عناصر جو ہر ہفتے یا پندرہ روز میں پیدا ہو کر مرتے رہتے ہیں۔ مثلاً بال وغیرہ
 (۴) وہ عنصر یا عناصر جو ہر مہینے پیدا ہو کر مرتے رہتے ہیں۔ مثلاً ناخن وغیرہ
 (۵) وہ عنصر یا عناصر جو پانچ سال سے دس سال میں مر جاتے ہیں۔ مثلاً جسم کے بعض حصے اور بعض دانت

- (۶) وہ عنصر یا عناصر جو پچیس تیس سال میں مر جاتے ہیں مثلاً بعض دانت یا جسم کے بعض حصے
 (۷) وہ عنصر یا عناصر جو پچاس سال میں مر جاتے ہیں مثلاً بعض غدود
 (۸) وہ عنصر یا عناصر جو سات سات نسلوں کے بعد ہی مرتے ہیں مثلاً بعض جین یا سیل
 (۹) وہ عنصر جو بیس بیس نسلوں کے بعد مرتے ہیں۔ مثلاً بعض جین یا سیل
 (۱۰) وہ عنصر یا عناصر جو پہلے آدم سے آخری آدم تک مسلسل برقرار رہیں گے جسے آدم کا بنیادی زریعہ (Seed) کہتے ہیں۔

اب اگر اجنتہ کے میکانزم کو Seed میکانزم مان لیا جائے جو صرف ایک بار پیدا ہوتا اور صرف ایک بار مرتا ہے اور اس دوران صرف جسم بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی اس Seed پر نوح کا جسم ہوتا ہے تو ہزاروں سال کے بعد ابراہیم کا یہی Internal Evolution ہے۔

Closed-Circuit External Evolution اس کی تھوڑی سی توسیع ہے۔ یعنی اجنتہ میں آدم و حوا کے جسم قائم ہوتے ہوئے اندرونی طور پر بدلنے کے بجائے اور تناسل کے بجائے استساخ کے طریقے پر بدلتے رہیں۔ یہ وہی طریقہ ہے جس سے حضرت آدم سے حضرت حوا برآمد کی گئی تھیں۔ اور اس طرح اجنتہ میں اولادیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور ان ولادتوں میں صرف اور صرف صالحین ہی پیدا ہوتے۔ اور ان صالحین کے علاوہ جتنے غیر صالحین کی سینکڑوں قسمیں اب پائی جاتی ہیں۔ وہ پیدا ہونے کے بجائے اندرونی طور پر پیدا ہو کر مرتے ہیں مثلاً۔ جیسے یہاں کے جسم کے کسی زخم میں وہ پیپ جو خون ہی ہے مگر غیر صالح ہے وہ بنا ضرور لیکن وہ جسم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا بلکہ نقصان ہی پہنچاتا ہے۔ اب اگر کوئی اسے افزائش (Culture) سے گزارے تو ممکن ہے کہ اس سے خطرناک قسم کے ذی روح پیدا ہوں۔ اس طرح اجنتہ کے اس Closed Circuit External Evolution میں ممکن ہے صرف انبیاء اور صالحین پیدا ہوتے اور یہ جو کھربوں

غیر سعید انسان پیدا ہوئے یہ پیدا ہو کر اندرون میں ہی مر جاتے اور الجنتہ میں صرف سعید لوگ ہی ہوتے۔

الشیطان نے آدم و حوا کے الشجرہ کو باہم قریب کرا کے اس پورے میکا نزم کو دھماکے (Blast) سے اڑا دیا۔ چنانچہ اب آدم و حوا میں نتیجتاً جو تبدیلی آچکی تھی الجنتہ اسے Accomodate نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے کہ اس فساد کے ظہور کے بعد آدم کا Evoluton — Internal Evolution — یا Closed-Circuit External Evolution کے بجائے Free External Evolution میں ہی نہیں بلکہ Unrestrained External Evolution میں بدل گیا۔

ان تفصیلات سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ دوسرے مرحلے میں الشیطان کو کس طرح کھلی فتح نصیب ہوئی اور آدم و حوا کو شکست۔ اور یہ شکست آدم و حوا کے لیے کتنی تباہ کن (Disastrous) تھی اور الشیطان کے لیے کتنے دور رس فوائد کی حامل بعد کے حالات کے تناظر میں اس کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

چنانچہ آدم و حوا کو الجنتہ سے باہر چلے جانے کا حکم ہو گیا۔ یہاں ایک اہم اور بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر آدم و حوا کے باہر چلے جانے کا فوری سبب کیا ہو سکتا ہے؟ اس تعلق سے مفسرین کی قابل ذکر رائیں دو ہیں:

(۱) چونکہ الشجرۃ کے کھانے سے جہاں ایک طرف شرمگاہیں کھل گئیں وہیں دوسری طرف بول و براز کی ضرورت بھی پیش آنے لگی لہذا الجنتہ سے باہر چلے جانے کا حکم ہو گیا۔ تقریباً بیشتر مفسرین یہی رائے رکھتے ہیں۔

(۲) چونکہ الشجرۃ کے کھانے سے جہاں شرمگاہیں کھل گئیں اور بول و براز کی ضرورت پیش آنے لگی وہیں ولادت کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا اور ان اولادوں کے لیے الجنتہ غیر مناسب (unsuitable) ہو گئی اس لیے انہیں حکم ہوا کہ وہ الجنتہ سے باہر چلے جائیں۔ یہ رائے مولانا شبیر ازہر میرٹھی صاحب کی ہے۔ مولانا اس کی دلیل میں قرآن کی یہ آیت پیش کرتے ہیں:

(۱) قلنا اہبطوا منها جميعا۔ (البقرہ: ۳۸)

ترجمہ: ہم نے حکم دیا نیچے جاؤ یہاں سے تم سب۔

اس عاجز کے نزدیک پہلی رائے سرے سے قابل اعتناء نہیں۔ دوسری رائے ہر چند کہ مجمل اور گنجلک ہے لیکن پہلے کے مقابلے میں بہر حال قابل اعتناء ہے۔ لیکن اس رائے کے تسلیم کرنے میں کئی قباحتیں ہیں جو درج ذیل ہیں:

(۱) جب الشجرة کے کھانے سے شرمگاہیں منکشف ہو گئیں، بول و براز کا سلسلہ بھی شروع ہی ہو گیا حتیٰ کہ اولاد بھی — وہ بھی کئی کئی — ہو ہی گئیں — (مولانا متعدد اولاد کے پیدا ہونے کو مستبعد نہیں سمجھتے) تو پھر اب الجنة سے نکلنے کی مجبوری کیا ہو سکتی ہے؟ ان تمام مجبوریوں کو صرف دو شقوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔

(۱) الجنة اپنی وسعت اور وسائل کے اعتبار سے تنگ ہو چکی ہو یا ہونے کا اندیشہ ہو۔
(۲) آدم و حوا کو ان کے گناہ کے نتیجے میں تادیباً بطور سزا الجنة سے باہر جانے کا حکم ہوا ہو۔ ظاہر سی بات ہے کہ قرآن کی صراحت کے بعد شق نمبر دو کی گنجائش قطعاً باقی نہیں رہتی۔ اور شق نمبر ایک کا ہونا محال ہے اور وہ اس لیے کہ الجنة نقیض ہے تنگی کی۔

اور پھر اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ آدم و حوا جنت سے کوئی ایک یا ایک سے زائد مولود اولاد لے کر اس رائے زمین پر آئے۔ اور نہ ہی اس کا کوئی ثبوت ہے کہ الجنة یا کہیں اور وہ اپنی کوئی ایک یا ایک سے زائد اولاد چھوڑ کر آئے ہیں۔

در اصل اس ساری الجھن کی گرہ اس میں ہے کہ الجنة سے باہر جانے کا سبب کون سی مجبوری تھی۔ اس عاجز کی رائے میں سب سے پہلے حضرت آدم و حوا سے جو نافرمانیاں ہوئیں — ان کی پیچیدگی کا سمجھنا ضروری ہے۔ یہ وہی پیچیدگی ہے کہ توبہ کے بعد ہر چند کہ تمام نافرمانیوں سے مغفرت مل گئی لیکن اس کے طبعی اور روحانی نتیجے وہ مجبوری بن گئے جن کے سبب آدم و حوا کو الجنة سے باہر جانے کا حکم ہوا۔

(۱) آدم و حوا نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور الشجرة سے قریب ہو گئے:
”الشجرة۔ سے قریب ہونا اور الشجرة کو چکھنا“ کیا ہے؟ قرآن کی اس عبارت سے یہ مراد لینا جیسا کہ بیشتر مفسرین نے لیا ہے کہ وہاں کوئی پھل یا اناج کھانے کی کوئی چیز تھی قرآن کی زبان اور بیان کے خلاف ہے۔ (جس کی تفصیلی تقریر کا یہاں موقع نہیں) اس عاجز کے نزدیک نہ حضرت آدم اور حضرت حوا نے کوئی پھل یا اناج کھایا نہ کوئی ایسا پھل یا اناج کھانے کی ممانعت تھی۔ بلکہ

انہوں نے وہ عمل کر لیا جسے موجودہ انسانی معاشرہ میں 'جماع' کہتے ہیں۔ لیکن اس عمل کی صورت سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ دو باتیں واضح ہو جائیں۔ پہلی بات یہ کہ (۱) الجنۃ میں آدم و حوا کا ایک دوسرے کے لیے زوج ہونا کیا تھا؟ اور دوسری بات یہ کہ الجنۃ میں حضرت آدم اور حضرت حوا کی جسمانی ساخت اور اس کی شکل کیسی تھی؟ جہاں تک پہلی بات یعنی زوج کا تعلق ہے تو عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ حضرت آدم اور حضرت حوا الجنۃ میں موجودہ انسانی سماج کے میاں بیوی کی طرح تھے اور اسی طرح زندگی گزار رہے تھے جیسے کوئی میاں بیوی اس دنیا میں زندگی گزارتا ہے۔ جب کہ ایسا قطعاً نہیں تھا۔ تقریب فہم کے لیے مثلاً وہ اس طرح زوج تھے جس طرح بجلی کے مثبت اور منفی تار یا ٹیلی فون میں الگ کردہ رسیور اور ٹرانسمیٹر یا جو توں کا ایک جوڑا۔ دوسری بات یہ کہ اللہ تعالیٰ نے الجنۃ میں جو سنت تولید جاری فرمائی تھی وہ استساخ (Cloning) تھی۔ خود آدم الجنۃ کی پیداوار نہ تھے۔ حضرت آدم الجنۃ سے باہر بنے۔ الجنۃ کی پیداوار تو صرف اور صرف حوا تھیں۔ جو دراصل آدم کا استساخ (Cloning) تھیں۔ اور یہی الجنۃ میں اللہ تعالیٰ کی جاری کردہ سنت معلوم ہوتی ہے۔ زمین میں جس طرح زواجین کے اتصال سے ولادت کی سنت عادیہ قائم ہے وہ الجنۃ میں مفقود تھی بلکہ ممنوع تھی۔ اور اسی سے آدم و حوا کو روکا گیا تھا۔

(۲) زوج کی صورت حال اور حضرت آدم اور حضرت حوا کے عمل کو سمجھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ الجنۃ میں ان دونوں حضرات کی جسمانی اور طبعی حالت اور ان کی شکل کو سمجھا جائے۔

فرض کر لیا جائے کہ حضرت آدم اور حضرت حوا دونوں کے جسم ظاہر میں کلیتہً ایک جیسے تھے۔ عام طور پر دیکھا جاسکتا ہے کہ اس زمین پر مرد اور عورت میں دو فرق وقوع پذیر ہوتے ہیں جن سے وہ مرد اور عورت سمجھے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ فرق ہے جو پیدائش سے لے کر دونوں کے جوان ہونے تک دونوں میں واقع ہوتا ہے۔ مثلاً مردانہ اور زنانہ اعضا کا بڑھنا۔ دوسرا فرق وہ ہوتا ہے جو عین پیدائش کے وقت ہی موجود ہوتا ہے۔ اب غور کیا جائے کہ خود یہ فرق جو پیدائش کے وقت ہوتا ہے وہ تقریباً چار ماہ قبل یعنی پانچ ماہ کے حمل میں نہیں کے برابر ہوتا ہے۔ اور اس وقت باطن میں چاہے، دو الگ الگ صنف بن رہی ہوں لیکن ظاہر میں ان کے اشکال یکساں معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہاں وجہ ہے کہ بعض لوگ جن کے ان اعضا کی دوران حمل افزائش نہیں ہو پاتی

ہے یا تو دونوں میں سے شمار ہوتے ہیں یا عمل جراحی کے ذریعہ یا دواؤں کے ذریعہ انہیں افزو دہ بنا کر کسی ایک صنف کی طرف جن کا غلبہ ہوتا ہے لایا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ حضرت آدم اور حضرت حوا الجنتہ میں اس طرح زوج ہوں کہ بس دو ہوں۔ ان کا باطن یقیناً الگ الگ ہو گا لیکن ان کے ظاہر میں کوئی فرق نہ تھا۔ بلکہ قرآن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ انہیں باہم یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ دونوں دو الگ الگ صنف ہیں۔ جیسے بعض اوقات دو صنف کے چھوٹے بچوں کو اس کا احساس نہیں رہتا جبکہ اس دنیا میں وہ پیدائش ہی سے ظاہری طور پر بھی الگ ہو جاتے ہیں۔ ممکن ہے دونوں کی صورت یہ ہو کہ دونوں کے جسم ہوں اور ان دونوں کے دو جانب دو یعنی اوپر اور نیچے دو دوسو ران ہوں۔ یا یہ کہ صرف اوپر کے دو سو ران کھلے ہوں اور دونوں کے نیچے کے دو سو ران تو ہوں مگر اس پر کوئی بندش، پتہ یا پردہ لگا ہوا ہو۔

اللہ تعالیٰ نے دراصل یہ حکم دیا تھا کہ دیکھو تم دونوں اپنے جسم کے ان دونوں نیچے کے حصوں کو مت ملانا۔ اور الشیطان نے اس ملک کے ذریعہ اسی میں کامیابی حاصل کر لی اور ان دونوں نے اپنے دونوں حصوں کو ملا لیا۔ یہی وہ بات ہے جسے قرآن نے 'ذاقوا الشجرة' سے موسوم کیا ہے۔ چنانچہ حضرت آدم اور حضرت حوا کا یہ عمل نہ صرف ایک عمل تھا بلکہ ایک ایسا عمل تھا جس نے الجنتہ کے پرے نظام کو Blast کر دیا۔ جس طرح بجلی کے دو تاروں کا آپس میں مل جانا۔ اگر دو تار اس بجلی کے قاعدے سے ملیں یعنی اس کی سنت عاریتہ کے مطابق تعین شدہ نتیجہ برآمد ہو اور بلب روشن ہو جائے یا چولہا اور استری گرم ہو جائے لیکن خلاف قاعدہ ملیں تو شارٹ سرکٹ ہو جائے اور دھماکہ ہو جائے۔ الجنتہ میں یہی ہوا ہو گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیزی سے دونوں کے جسم دیکھتے دیکھتے اب ظاہری طور پر بھی بڑھ گئے اور ایک دوسرے سے نمایاں طور پر مختلف ہو گئے۔ یہی وہ صورت حال ہے جو دنیا میں بھی نظر آتی ہے اور خاص طور پر ایسے جوڑوں میں جن کی شادی غنفوان شباب میں ہو تو بعض اوقات دو چار دنوں میں ہی دونوں کے جسم میں نمایاں فرق نظر آنے لگتا ہے۔ قرآن نے اس کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

بَدَتْ لَهُمَا سُوَاتُهُمَا (الاعراف: ۲۲)

ترجمہ: اور دونوں کے جسم (مخصوص اعضا) ظاہر ہو گئے۔

اس دنیا میں اس کے مظاہر دیکھے جاسکتے ہیں کہ کسی ہارمون کے انجکشن سے اس عمل کو اتنا

تیز کیا جاسکتا ہے کہ چند گھنٹوں میں کسی جسم میں نمایاں فرق آجائے۔ چنانچہ یہی وہ عمل تھا جس کے ہوتے ہی الجنتہ کی ساری سنتوں کی خلاف ورزی ہو گئی۔ اب اس کا نتیجہ ایک سلسلہ کی طرح ظاہر ہونا شروع ہوا۔ جو درج ذیل ہیں:

(۱) شعور جنس جاگ گیا۔ اور مزید مقاربت کی خواہش ہونے لگی اور نتیجتاً مقاربت ہونے لگی۔

(۲) دانوں کے جسموں کے نیچے کی بندش، پنبہ یا پردہ کا خاتمہ ہو گیا لہذا کئی نئے اعمال صادر ہونے لگے مثلاً بول، براز، احتلام، حیض وغیرہ

(۳) ایسا لگتا ہے کہ حضرت حوا اس یا ان مقاربت سے حاملہ ہو گئیں اور استساخ (Cloning) پر بنائی گئی الجنتہ میں ابزار (Insemination) کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور اب اس کا نتیجہ یہی برآمد ہوتا کہ وہاں استساخ سے تولید کی سنت تو تھی لیکن ابزار سے ہونے والی تولید کا لظم کرنا الجنتہ کی سنت کے خلاف تھا اور نتیجتاً وہاں فساد برپا ہوتا۔

اور اس طرح اس ایک عمل نے پورے الجنتہ کے لظم کو درہم برہم کر دیا۔ اب اگرچہ آدم و حوا نے اللہ تعالیٰ سے اس نافرمانی کے لیے توبہ کر لی اور توبہ واستغفار سے گناہ معاف ہو گئے لیکن اس عمل کا جو طبعی نتیجہ برآمد ہوا وہ دو اعتبار سے آدم و حوا کے لیے تباہ کن ہوا۔

(۱) روحانی اعتبار سے اللہ عالم اشیاء میں پیدا ہونے کے باوجود نیچے گر گیا اور بہیمیت کی سطح پر آگیا جہاں اس کی ضرورتیں بہائم کی طرح ہو گئیں اور بہائم کی طرح ہی پوری کی جاسکتی تھیں۔

(۲) اب آدم و حوا میں جو تبدیلی سنت عارض ہو گئی تھی اس کا لظم کرنے اور اس کی بقیہ زندگی کو اس نئی سنت کے مطابق اس وقت تک آگے لے جانے کی ضرورت آن پڑی جب تک دو میں سے کوئی ایک یا دونوں بات نہ ہو جائے۔

(۱) پہلی بات یہ کہ اب اللہ کو اس کی نئی تبدیل شدہ سنت یعنی عادت بہیمہ کے مطابق 'ایوم الوقت المعلوم' تک ایسی جگہ فراہم کرنا ضرور تھا جہاں وہ اس سنت کے مطابق جی سکے۔

(۲) دوسری بات یہ کہ اس نئی اور تبدیل شدہ سنت کے مطابق قابل رہائش جگہ میں

الیوم الوقت المعلوم تک رہنے کے دوران اگر وہ سابقہ مقام اور منصب کو بحال کر سکے تو اس کو اس کی اجازت ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کو اس کی بھی اجازت ہے بلکہ مطلوب ہے کہ وہ شیطان سے اپنی لڑائی جاری رکھے اور اس ہزیمت کے باوجود اگر وہ مقام محمود حاصل کر سکتا ہے تو کرے۔ چنانچہ حالات کی یہ مذکورہ تبدیلی اور سنگینی ہی ہے جو سبب بنی اس حکم کا جس کے نتیجے میں حضرت آدم اور نوا زمین پر بھیج دیئے گئے۔

یہاں دو اور باتوں کی وضاحت ضروری ہے:

(۱) حضرت آدم اور حضرت حوا کے اس عمل کی شرعی حیثیت کیا تھی؟

غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ حضرت آدم اور حضرت حوا جس الجنتہ میں تھے وہاں کی شرع کے اعتبار سے باہم زوج ہونے کے باوجود ان لوگوں نے خلاف عادت بھی عمل کیا۔ اور خلاف حکم بھی۔ اس لیے وہاں دو مفسدہ پیدا ہوئے۔ پہلا مفسدہ حکم کی خلافت ورزی کرنے کا اور دوسرا مفسدہ تھا الجنتہ میں جاری عادت یا سنت کے خلاف کرنے کا۔ چنانچہ ان دونوں کے تعلق سے حکم ہوا کہ:

اترو!

حالات کی یہی وہ زمانی ترتیب ہے جو اس تعارض کو سلجھاتی ہے جو البقرہ کی آیت: ۳۶ اور ۳۸ میں پایا جاتا ہے: کہ جب آدم و حوا سے نافرمانی ہو گئی تو انہیں حکم دیا گیا کہ اتر جاؤ! اور بعد میں جب کہ انہوں نے توبہ کر لی اور ان کی توبہ قبول بھی ہو گئی تو پھر آیت: ۳۸ کیوں کہتی ہے کہ اترو؟ دراصل بات یہ ہے کہ حضرت آدم و حوا کے عمل سے دو مفسدہ کا صدور ہوا۔ پہلے ان دونوں کے لیے کہا گیا: اترو۔ چنانچہ اس اترو میں فی الواقع دو حکم مستتر تھے۔ پہلا حکم عتاب تھا اور دوسرا تبدیلی مکان کا جس کا سبب اب الجنتہ کا اس صورتحال کے نظم کرنے سے قاصر رہنا تھا۔ چنانچہ جب حضرت آدم اور حضرت حوا نے توبہ کر لی اور وہ قبول ہو گئی تو پہلا حکم تو ختم ہو گیا لیکن دوسرا علیٰ حالہ باقی رہا۔

(۲) دوسری بات یہ کہ ان آیات میں دونوں بار جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا اور کہا گیا:

اهبطوا اور پھر کہا گیا: اهبطوا منها جميعاً۔ تو اس سے کیا مراد ہے؟ اس عاجز کی رائے میں مولانا میرٹھی کا استدلال درست نہیں۔ اس لیے کہ جب الجنتہ میں ولادت ہو ہی جاتی تو پھر نکلنے کی ضرورت ہی ختم ہو جاتی۔ بعض لوگوں کا یہ قول کہ کبھی کبھی تنبیہ کے لیے جمع کا صیغہ بھی استعمال

لیا جاتا ہے بے جا بات ہے۔ اس سے زیادہ تو واحد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ الجنۃ سے باہر آنے کا اصلی سبب الشجرة سے تقارب کا سلسلہ رد عمل (Chain Reaction) ہے جس کی انتہا وضع حمل ہو سکتی تھی جس کے لیے الجنۃ بالکلیہ (Unaccommodative) ہو گئی تھی۔ خاص طور پر ایک منفرد بات کے تعلق سے۔ اور وہ بات یہ ہے کہ جب یہ 'جماع' خلاف سنت عادیہ تھا تو اس حمل اور اس بچہ کا کیا حکم ہو سکتا تھا جو اس کے نتیجے میں حمل میں آیا۔ قرآن کے مطابق جائز عمل سے مگر دیگر کوتاہیوں کے نتیجے میں غیر صالح اولاد کا حمل قرار پا سکتا ہے جو غیر صالح ہو تو ناجائز عمل کے نتیجے میں ایسی اولاد کا حمل قرار پانا زیادہ یقینی ہے۔ لہذا اگر ان تمام اسباب کی بنیاد کو لیا جائے تو الجنۃ سے نکلنے کا بنیادی سبب یہی غیر صالح حمل کے سوا اور کچھ نہیں تھا جسے کسی صورت میں بھی الجنۃ اپنے یہاں پیدا ہونے نہیں دے سکتی تھی۔ دراصل یہ حکم ہی اس وقت دیا گیا جب اللہ تعالیٰ کو معلوم ہوا کہ الجنۃ میں اس کے دیئے گئے حکم کی خلاف ورزی کر دی گئی ہے اور الجنۃ میں قائم اور جاری کردہ سنت کو درہم برہم کر دیا گیا ہے اور اس کے نتیجے میں وہ حمل قرار پا چکا ہے جسے کسی صورت الجنۃ میں رہائش کی حتیٰ کہ ولادت تک کی اجازت نہیں دی جاسکتی اور نہ اب اسکی گنجائش باقی رہ گئی تھی کہ اس سنت کے بجائے دوسری جاری ہونے والی سنت کے بعد آدم و حوا الی الیوم الوقت المعلوم تک الجنۃ میں رہائش پذیر ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ الجنۃ میں واپسی کی اب صرف دو صورتیں تھیں:

(۱) اس مدت میں آدم و حوا ایک ایسی جگہ جا کر رہیں جو ان کی اس نئی سنت کو Accomodate کر سکے۔

(۲) دوسری بات یہ کہ اس دوران وہ طبعاً نہیں بلکہ حکماً اپنی بحالی کی کوشش بھی کرتے رہیں اور اگر وہ اس میں کامیاب ہوئے تو الی الیوم الوقت المعلوم کے ختم ہوتے ہی انہیں جسمنا بھی الجنۃ میں بحال کیا جاسکتا ہے بلکہ اپنے سابقہ سفر میں انہیں آگے ترقی دی جاسکتی ہے۔ یہی مفہوم ہے اللہ تعالیٰ کے اس قول کا:

”ولکم فی الارض مستقر و متاع الی حین۔“ (البقرہ: ۳۶)

ترجمہ: اور تمہارے لیے ہے زمین میں ٹھکانا اور سامان کچھ عرصے تک۔

اس مقام پر ایک دقیق اور نہایت اہم نکتے کی طرف اشارہ کرنا بر محل ہو گا اس لیے کہ

معرکہ خیر و شر کے بعد کے مرحلوں میں اس نکتے کو ہی دراصل محور کی حیثیت حاصل ہے۔ اور اسی نکتے کے فہم پر دین اللہ کا فہم منحصر ہے۔

واضح ہو کہ ابلیس نے معرکہ خیر و شر کو غیر معمولی ذہانت (Superintelligence) کا مسئلہ بنادیا۔ اور اس طرح دین اللہ اور زمین پر جاری ہونے والی شریعتیں اور انبیاء کرام نتیجتاً دراصل اسی Superintelligence کے ربانی مظاہر ہو کر سامنے آئے۔

اس عاجز نے ”ماکان وما یكون“ میں لکھا تھا:

”ایسا لگتا ہے کہ ابلیس نے فرشتوں کے اعتراض اور اس اعتراض کے رفع کیے جانے کی پوری کارروائی دیکھی تھی اس لیے اس نے اپنے اعتراض کو درست ثابت کرنے کے لیے آدم پر اسی حربے کا استعمال کیا جو اب تک آدم کا طرہ امتیاز تھا۔ یہ بات اللہ رب العزت کے علم میں تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اس سے باخبر فرمایا۔ پہلے مرحلے میں جب ابلیس نے آدم پر اسی حربے کا استعمال کیا جو اب تک آدم کے لیے باعث افتخار رہا تھا تو اس بار معترض کی حکمت عملی کے سمجھنے میں آدم سے چوک ہو گئی۔“ (ماکان وما یكون: ادراک کائنات: آغاز معرکہ، صفحہ ۱۷۱)

اس کی تفصیل یہ ہے کہ ملک کے مقابلے میں حضرت آدم نے اپنی برتری اپنی عقل کا استعمال کر کے ثابت کی۔ جیسا کہ علم ہے کہ ملک متعین تفویض اور تفویض کے تعلق سے متعین معلومات کے حامل ہوتے ہیں۔ لہذا آدم نے اپنی عقل کے استعمال سے غیر متعین کو معلوم کی شکل میں لا کر اپنی برتری ثابت کر دی۔

لیکن ابلیس ملک نہیں تھا۔ بلاشبہ وہ ملائکہ کے گروہ کا ایک فرد تھا۔ لیکن اپنی طبع کے لحاظ سے ملک نہیں بلکہ بنی نار —————۔ لجن تھا جس میں ملک کے مقابلے میں عقل (Intelligence) کا زیادہ اختیار پایا جاتا ہے۔

ابلیس نے دھتکارے جانے اور اجازت دیئے جانے کے بعد آدم پر حملے کی حکمت عملی بڑی گہرائی سے اور ممکن ہے سالہا سال کے غور و فکر، مطالعہ تجزیہ، تحقیق اور تفتیش کے بعد وضع کی ہو۔ اس نے کتنی بار یک بنی سے حملے کا منصوبہ بنایا اس کا اندازہ اس پورے معرکہ پر غور کرنے اور اس کا تجزیہ کرنے سے ہو سکتا ہے جو اجتناب میں ہوا۔ ابلیس کی حکمت عملی کے ابھرے ہوئے نکات مندرجہ ذیل ہیں:

- (۱) اس نے اپنے تمام منصوبے کی بنیاد ہی اس بات کو قرار دیا کہ آدم عقل کے اعتبار سے فائق نہیں اور اس طرح عقل بجائے خود فوقیت کا مدار نہیں بن سکتی۔
- (۲) آدم عقل رکھتا ہے لیکن وہ اس کے استعمال پر قدرت نہیں رکھتا۔
- (۳) آدم اپنی عقل کا استعمال کر سکتا ہے لیکن وہ اس اعتبار سے کمزور اور ناقص ہے کہ اس کا غلط استعمال نہ کرے یا استعمال کر کے غلط نتیجے تک نہ پہنچے۔
- اور ظاہر ہے کہ جب یہ سب باتیں اس میں پائی جاتی ہوں تو وہ فائق اور لائق خلافت کبریٰ کیسے ہو سکتا ہے۔
- یہ بات عین ممکن ہے کہ ابلیس نے اس منصوبہ بندی کو ترتیب دینے میں بہت سے امور کا تجزیہ کیا ہو:

- (۱) آدم نے ملائکہ کے سامنے کس طرح یعنی کس منہج اور طریقے کا استعمال کر کے اپنی عقل کا استعمال کیا تھا؟ اس منہج اور طریقے کو ممکن ہے اس نے Slow Speed Projection کر کے آدم کے طریقہ فکر پر غور کیا ہو۔
- (۲) آدم الجنتہ میں کسی بھی پیش آمدہ مسئلے پر کیسے رد عمل (React) کا اظہار کرتا ہے؟
- (۳) اللہ تعالیٰ نے اس کو جو احکامات دیئے ہیں اس میں اس کے مطابق آدم کے ساتھ کیا رعایت (Grace) اور جانبداری (Favour) کی گئی ہے اور اس رعایت اور جانبداری کے پیچھے آدم کی کون سی خصوصیت یا کمزوری چھپی ہوئی ہے؟
- (۴) اس عاجز کی رائے یہ ہے کہ اسے ان میں سے ہر ایک سے کچھ نہ کچھ سراغ ضرور ملے لیکن جو سراغ سب سے زیادہ اہم ملا وہ الجنتہ میں حوا کی پیدائش کے بعد ان دونوں کی ایک دوسرے کے لیے مخصوص رد عمل (Reaction) تھا۔ یعنی ان دونوں میں یکا گمت اور انس کا پایا جانا اور بظاہر یکساں ہونا۔ ان کے بظاہر یکساں ہونے اور پھر باہم مونس ہونے نے اسے اس مقام پر پہنچایا کہ یہ بظاہر یکساں معلوم ہوتے ہیں لیکن ہیں نہیں۔ لیکن اس معرفت سے زیادہ جس بات نے اسے Break through سے ہمکنار کر دیا وہ یہ بات تھی کہ آدم و حوا اندرونی طور پر الگ الگ ہونے کے باوجود باہم اس راز سے بے خبر ہیں۔ اور اس طرح وہ اس راز سے واقف نہیں کہ ان میں باہم یکا گمت اور انس کیوں پایا جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہاں سے ابلیس نے یہ جانا کہ آدم و حوا کی

عقل کامل نہیں بلکہ ناقص (Flawed) ہے۔ اب اس کا چاہے جو سبب ہو لیکن ابلیس نے یہ ضرور معلوم کر لیا کہ جس چیز کو آدم کے لیے طرہ امتیاز بتایا جاتا ہے وہ کامل نہیں بلکہ ناقص (Flawed) ہے۔

اس طرح ایسا لگتا ہے کہ اس کے بعد اس کا دھیان آدم اور حوا کو دیئے گئے اللہ کے احکام کی طرف گیا جس کے تعلق سے اسے پہلے ہی شک تھا کہ اس میں آدم کے ساتھ رعایت اور جانبداری کی گئی ہو گی۔ لیکن اب اس نے اس رعایت اور جانبداری کی کنہ کی تلاش کی۔ اس نے پایا کہ احکام کے دو جز ہیں۔

(۱) پہلا جزء معروف کا ہے۔ یعنی :

وَكَلَّا مِنْهَا رَعْدًا حَيْثُ شِئْتُمَا.

ترجمہ: اور کھاؤ اس میں جو چاہو جہاں کہیں سے چاہو۔

— اور

(۲) دوسرا جزء منہیات کا ہے: یعنی :

وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ.

ترجمہ: اور پاس مت کرنا اس الشجرۃ کو ورنہ تم ہو جاؤ گے ظالموں میں سے۔

اس نے تجزیے سے یہ بات معلوم کر لی کہ یہ احکام اور بطور خاص منہیات دراصل آدم و حوا کی کسی کمزوری کو ڈھانپنے اور انہیں اس سے بچانے کی تدبیر ہے۔ اور اس طرح ابلیس اس نتیجے پر پہنچا کہ آدم اپنی عقل کے اعتبار سے فائق ہو تو ہو لیکن خود اس عقل کے استعمال کے اعتبار سے ناقص ہے اور یہ کہ اس کی عقل کو تو دھوکہ نہیں دیا جاسکتا لیکن اس کی عقل کا غلط استعمال کروایا جاسکتا ہے اور پھر اس غلط استعمال کو بطور حربہ اسی کے خلاف استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اور یہی نتیجہ بنیاد بنا ابلیس کے آدم و حوا کے خلاف پہلی کارروائی کی۔

چنانچہ ابلیس نے آدم و حوا کے خلاف جو سازش کی اور جس میں اس نے ملک کا یا کسی بھی دیگر مخلوق کا سہارا لیا — اس منصوبہ و سازش کی اساس میں دراصل 'عقل' کے استعمال کی آزمائش میں ان دونوں کو مبتلا کرنا تھا۔

چنانچہ اس نے اس منصوبے کو رو بہ عمل لانے کے لیے ایک متعدد السطوح (Multi-Layer)

سازش تیار کی جس میں درج ذیل باتیں مقصود تھیں:

- (۱) آدم و حوا کی عقل کو عند اللہ ناقص ثابت کرنا —
- (۲) آدم و حوا پر واضح کرنا کہ ان کی عقل اس قابل نہیں کہ اپنی ذات کے اندر مستور اپنی الگ الگ حقیقتوں کا ادراک کر سکے۔
- (۳) آدم و حوا پر واضح کرنا کہ ان کی عقل اس قابل نہیں کہ دوست اور دشمن میں فرق کر سکے۔
- (۴) آدم و حوا پر واضح کرنا کہ ان کی عقل اس قابل نہیں کہ اپنے بھلے یا برے میں فرق کر سکے۔
- (۵) آدم و حوا کو الجنتہ کے نظام میں فساد ڈالنے پر اکسانا تاکہ ان کو وہاں سے باہر نکالا جائے۔
- (۶) آدم و حوا کو الجنتہ سے باہر نکال کر اور نیچے گرا کر مقام خلافت کے لائق ہی باقی نہ رہنے دینا۔
- اس منصوبے کی اصلی غایتوں کو پورا کرنے کے لیے اس نے جو ظاہری غایتیں مقرر کرائیں وہ تھیں:

- (الف) (۱) آدم و حوا کے سامنے Multiple Questions رکھ کر اسے کنفیوژ کرنا۔
- (۲) آدم و حوا کے سامنے Misinformation کو رکھ کر اسے کنفیوژ کرنا۔
- (۳) آدم و حوا کو اس کے مقام، مقصد، نصب العین کے تعلق سے کنفیوژ کرنا۔
- (ب) (۱) اس ظاہری منصوبے کی جانب آدم و حوا کی توجہ کو مرکوز رکھنے اور اسے غیر محدود فضا میں کسی حقیقت کا فیصلہ کرنے سے ہٹانے اور اس کے سامنے Conditioned فضا کو مستحکم کرنے کے لیے محدود Input-Output Matrix کار کھنا اور اسے اس کا پابند کرنا کہ وہ اسی Input-output Matrix میں محدود رہ کر ہی غور کرے جسے ابلیس نے اس کے لیے فراہم کیا ہے۔ اور اس سے تجاوز نہ کرے۔
- قرآن کے بیان سے ایسا لگتا ہے کہ اپنی ان تمام باتوں کے لیے آدم و حوا کے سامنے اس نے متعدد Projections، Displays اور Activities کی ہوں گی تاکہ اس

کا نقطہ نظر آدم و حوا پر واضح ہو جائے۔

اور ایسا لگتا ہے کہ آدم و حوا اس دوران عقل کے استعمال میں غفلت کے سبب ناکام ہو گئے۔

غور کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دراصل جس مقام پر ابلیس نے آدم کو اس کی بنیادی قوت عقل کے تعلق سے منحرف (Detract) کیا وہ وہی مقام ہے جسے 'ماکان وما یکون' میں "انفاتی سائنس سے اکتشافی سائنس" کی طرف لے جانا کہا گیا ہے۔

چنانچہ اس ماجزے نے لکھا ہے:

"حیات الجنۃ میں آدم و حوا کو انفاق کا حکم ہوا تھا۔ یعنی علم الاسماء کا استعمال انفاق کے لیے۔ علم الاسماء کا جائز، صالح اور نافع استعمال آدم و حوا کے لیے اگر ہو سکتا تھا تو صرف در صرف انفاق تھا۔ ابلیس نے انہیں اس جانب مائل کیا کہ وہ علم الاسماء کا استعمال انفاق کے بجائے اکتشاف کے لیے کریں۔ چنانچہ جب آدم و حوا نے اس علم کا استعمال انفاق کے بجائے اکتشاف کے لیے کیا تو اسی ابلیس نے اس اکتشاف کا استعمال آدم و حوا کو تباہ و برباد کرنے، اس کی فضیلت کو چھین لینے اور اس پر اعتراض کو درست ثابت کرنے کے لیے کیا۔" (ماکان وما یکون: ادراک کائنات: کامیابی ابلیس: صفحہ ۲۱)

چنانچہ اس پوری ابلیسی کارروائی کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

فوسوس لهما الشیطن لیبدی لهما ماوری عنہما من سواتہما
وقال ما نہکما ربکما عن ہذہ الشجرۃ الا ان تکونا ملکین او تکونا من
الخلدین۔ وقاسمہما انی لکما لمن النصحین۔ فدلہما بغرور فلما ذاقا
الشجرۃ بدت لهما سواتہما وطفقا یخصفن علیہما من ورق الجنۃ
(الاعراف: ۲۰-۲۲)

ترجمہ: پھر بہکایا ان کو شیطان نے تاکہ ظاہر کرے ان پر وہ چیز کہ ان سے پوشیدہ تھی ان کے بدن سے۔ اور وہ بولا کہ تم کو نہیں روکا تمہارے رب نے اس الشجرۃ سے مگر اس لیے کہ کبھی تم ہو جاؤ ملک یا ہو جاؤ ہمیشہ رہنے والے۔ اور اس نے ان کے لیے پوری تفصیل اور اندازے پیش کیے تاکہ ان کو یقین ہو جائے کہ یہ خیر خواہ ہے۔ پھر غلط ثبوت پر ثبوت دیئے اور نظائر پر نظائر پیش کیے۔ پھر جب ان دونوں نے چکھ لیا الشجرۃ کو تو ان کے بدن (کے مخصوص اعضاء) ظاہر ہو گئے ان کے سامنے اور وہ اس ابھرے ہوئے بدن کو لگے جنت کے چوں سے چھپانے۔

غور کیا جائے کہ ابلیس نے پوری منصوبہ بندی نہایت وقت نظر سے کی تھی۔ اور اس کا پورا عمل دراصل یہ ثابت کرتا ہے کہ آدم کی فوقیت عقل کے تعلق سے درست نہیں اور یہ کہ آدم عقل کا حامل تو ہے لیکن عقل کے درست استعمال پر ضابطہ یا مضبوط نہیں۔ دین اللہ کی حقیقت یہی ہے کہ وہ انسانی عقل کو Optimally درجہ کمال پر بھی پہنچاتا ہے اور اسے مضبوط (Regulated) بھی رکھتا ہے اس کے برخلاف موجودہ سائنس دراصل ابلیس کے اسی حربے کی ارضی قسم ہے جس کا استعمال اس نے آدم و حوا پر الجنت میں کیا تھا جس میں عقل کے استعمال کو Maximise کرنے کے اس طریقے پر اکسایا گیا تھا جو غیر مضبوط (Unregulated) ہو اور جس کا بنیادی مقصد اتفاق سے اکتشاف کی طرف لے جانا ہو۔

اس طرح معرکہ خیز و شرکائیہ دوسرا مرحلہ ابلیس کی کلی کامیابی اور آدم کی کھلی ناکامی پر ختم ہوتا ہے۔ لیکن آدم نے اس مرحلے میں ایک ایسا عمل کیا جس نے آدم کی کھلی ناکامی کی بہت حد تک بلکہ کہا جائے تو نوے فیصد تک تلافی کر دی اور آدم و حوا کا وہ عمل تھا گناہ کے بعد ان کا متنبہ ہونا اور رجوع الی اللہ کرنا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آدم و حوا کی اس عاجزی اور بندگی کو نہ صرف یہ کہ قبول فرمایا بلکہ اس کی تحسین کی اور انہیں انعامات سے نوازا۔ اور وہ انعام تھا روئے ارض پر آدم و حوا کو بے یار و مددگار اپنے حال پر چھوڑ دینے کے بجائے انہیں اپنے سے مربوط رکھنے اور اپنی ہدایات سے نوازنے کا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے تسلیحاً، تحسیناً اور انعاماً فرمایا:

فاما يا تينكم من هدى فمن تبع هداى فلا خوف عليهم ولا هم يحزنون۔ (البقرہ: ۳۸)

ترجمہ: پس جب تم لوگوں کے پاس پہنچے میری طرف سے ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے اوپر نہ خوف ہے اور نہ وہ ملول ہوں گے۔
اور آئندہ پھر ایسی غلطی کرنے سے اس طرح ڈرایا:

والذين كفروا وكذبوا بايتنا اولئك اصحاب النار هم فيها خالدون۔ (البقرہ: ۳۹)

ترجمہ: اور جو لوگ کافر بنائے گئے اور جھٹلائیں گے ہماری آیتوں کو وہی ہیں دوزخ والے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔
یہ بات ایسی ہی تھی گویا کوئی کہے:

”اس بار تو ہم نے چھوڑ دیا ہے یا کم سزا دی ہے لیکن اگر آئندہ غلطی ہوگی تو

سخت سزا دوں گا۔ پھر رہنا ہمیشہ عذاب میں۔“

اس طرح معرکہ خیر و شر کا دوسرا مرحلہ ختم ہوا جس میں الشیطان بہر حال کامیاب ہوا۔ اور

آدم و حوا سخت تباہ کن حالات سے دوچار ہوئے۔

مرحلہ سوم: آدم و حوا بر زمین

معرکہ خیر و شر کا تیسرا مرحلہ وہ ہے جب حضرت آدم اور حضرت حوا زمین پر بھیج دیئے گئے اور اس خطہ ارض پر آدمی کی پیدائش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ معرکہ خیر و شر کے اس تیسرے مرحلے کی شروعات ایک انقلاب سے ہوئی جو آدم و حوا کی زندگی میں آیا اور جس نے ان کی نسل کی پوری زندگی پر حتیٰ کہ نفسِ معرکہ خیر و شر پر دور رس اثرات مرتب کیے۔

اس میں پہلی بات تھی آدم و حوا کی الجتہ کے محفوظ و مامون ماحول سے زمین میں معرکہ کے کھلے میدان اور کھلی دھوپ میں آنے۔ گویا الجتہ میں آدم و حوا ہر طرح کے طبعی اور روحانی — روایتی، جوہری، کیمیاوی، الیکٹرونی، حیاتیاتی اسلحوں کی زد سے محفوظ گویا ایسے زیر زمین بنگروں میں تھے جہاں ان ہتھیاروں کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا بلکہ ان کی آواز کی ذرا سی دھمک بھی نہ پہنچتی تھی۔ اب وہ اس سے محروم ہو گئے اور الشیطان کی پارٹی کے سامنے جو ان تمام ہتھیاروں سے لیس تھی اپنے آپ کو کھلے میدان میں پایا۔

دوسری بات جو غیر معمولی ہوئی وہ یہ تھی کہ اب ان کی حیات میں اکل و شرب، نشست و برخاست، تولید و تناسل کی وہ سنت عادیہ جاری ہو گئی جو بہیمیت سے مشابہ تھی۔ اور اس کا الجتہ کے نظام سے کوئی تعلق نہ تھا۔

معرکہ خیر و شر کا تیسرا مرحلہ زمین پر معرکہ خیر و شر کے آخری مرحلے کا پہلا مرحلہ تھا۔ چونکہ یہ پہلا مرحلہ تین ادوار پر مشتمل ہے اس لیے ان کا الگ الگ ذکر کیا جانا زیادہ مناسب ہو گا۔

پہلا دور : آدم کے دو بیٹوں کا دور

یہ وہی دور ہے جس کا قرآن نے اس طرح ذکر فرمایا ہے:

واتل علیہم نبا ابنی آدم بالحق۔ (المائدہ: ۲۷)

ترجمہ: اور (اے رسول!) سنا ان کو حالِ واقعی آدم کے دو بیٹوں کا۔

یہ دور دو حصوں پر مشتمل ہے:

پہلا حصہ: ولادت قابیل: 12000 قبل مسیح

قابیل ایک غیر صالح حمل تھا جو اللہ کی مرضیات کے خلاف آدم و حوا کے اختلاط سے وجود میں آیا۔ زمین پر آدم و حوا کا بھیجا جانا دراصل جہاں اس سبب سے تھا کہ اس حمل کو الجنتہ اپنے یہاں ولادت کی اجازت نہیں دے سکتی تھی یعنی الجنتہ کسی ایسی ولادت کو Accomodate نہیں کر سکتی تھی وہیں اس سبب سے بھی تھا کہ اس غیر صالح حمل کو اس زمین پر ڈالنا (Dump) مقصود تھا۔ زمین اس کے لیے (Dumping Ground) کے حکم میں تھی۔ اور اس کا سبب یہ تھا کہ آدم کی تخلیق سے قبل اس زمین پر جنوں نے اس طرح کے بلکہ اس سے بھی بڑے بڑے فساد کر کے زمین کا ناس کیا تھا۔ چنانچہ عند اللہ زمین پر آدم و حوا کا بھیجا جانا پہلے مرحلے میں اس حمل کو الجنتہ میں قرار پا چکا تھا زمین پر Dump کرنا تھا۔ لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ الشیطان نے یہاں سے اپنے تیسرے معرکے کی حکمت عملی کا آغاز کیا۔ اسے اس حمل سے جو الجنتہ میں قرار پایا تھا دوسری بڑی عظیم الشان کامیابی ملنے کی امید تھی۔ یعنی ان دو تائب لوگوں آدم و حوا کی نسل سے یعنی نسل — آدمی سے جس سے اس کی لڑائی تھی اور اب بھلا ایک ایسے دشمن کے گھر میں — ایک ایسے فرد کی پیدائش ہونے جا رہی تھی جو عند اللہ غیر صالح تھا اور اس طرح یہ اولاد الشیطان کے لیے آئندہ اپنے مقاصد پورے کرنے کے لیے زیادہ آسان نشانہ (Soft Target) ثابت ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے اس کے تعلق سے پوری حکمت عملی (Strategy) تیار کر لی۔

یہاں ایک دقیق بحث کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ ذات جو الجنتہ میں وہاں جاری معتاد سنت کی خلاف ورزی کر کے وجود کی حالت میں آئی اور پھر زمین پر آکر جس کی ولادت ہوئی وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے کیا تھی:

(۱) آدم و حوا کی جنتی عادی اولاد

(۲) آدم و حوا کی جنت میں حمل میں آنے والی مگر زمین پر پیدا ہونے والی اولاد

(۳) آدم و حوا کی جنت میں حمل میں آنے والی مگر زمین پر پیدا ہونے والی غیر آدمی یا نیم

آدمی اولاد۔

قرآن اور دیگر صحائف آسمانی کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ حمل اور اس

سے پیدا ہونے والا بچہ آدم و حوا کا بیٹا تو مانا گیا مگر ان کی جنتی عادی بیٹے کی حیثیت سے یا آدم و حوا کی جنت میں حمل میں آنے والے مگر زمین پر پیدا ہونے والے آدمی بیٹے کی حیثیت سے اسے تسلیم نہیں کیا گیا۔ بلکہ اس کے بجائے اسے ایک ایسا بیٹا مانا گیا جو بیٹا ہوتے ہوئے بھی جنت میں حمل میں آنے والا مگر زمین پر پیدا ہونے والا غیر آدمی یا نیم آدمی تھا چنانچہ یہی سبب ہے کہ قرآن اسے آدم و حوا کی ترتیب کے اعتبار سے پہلی مگر حقیقت کے اعتبار سے اور اس روئے زمین پر اجراء سنت کے مطابق پہلی اولاد نہیں مانتا۔

اس کا اندازہ اس بحث سے ہوتا ہے جو علماء یہود کے یہاں گزشتہ چار ہزار سالوں سے اور علماء نصاریٰ کے یہاں تقریباً انیس سو سالوں سے آدم کی دوسری اولاد کے نام کے معنی کے تعلق سے چلی آرہی ہے۔

ہابیل کے تعلق سے بیشتر علماء یہود کا خیال ہے کہ اس نام کا مفہوم ہے:

(۱) خالی = اس لیے کہ ہابیل نحیف و کمزور اور چھوٹے قد و قامت کا تھا۔

(۲) بے حیثیت، بے وزن، بے مصرف = اس لیے کہ وہ اپنے بڑے بھائی کے ہاتھوں

بڑی بے چارگی سے مارا گیا اور اس کا نام و نشان مٹ گیا۔ اور بڑا بھائی اس پر غالب آ گیا۔

علماء نصاریٰ اور بطور خاص عہد جدید کے اکابر علماء نصاریٰ کا خیال ہے کہ نہیں — ہابیل کا

مفہوم نہ تو خالی ہے، اور نہ ہی بے حیثیت، بے وزن اور بے مصرف — بلکہ اس کا اصل مفہوم ہے:

(۱) سانس = یعنی وہ زمین پر سانس لینے والے نظام کے ساتھ پیدا ہونے والا پہلا بچہ تھا۔

(۲) بھاپ یا بخار = یعنی اس کی تخلیق بھاپ یا بخارات سے ہوئی تھی یا وہ بھاپ یا بخارات

کی طرح ہلکا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ علماء یہود اور علماء نصاریٰ کے یہ سارے خیالات دراصل اندازے ہیں جو

غلط ہیں۔ یا زیادہ سے زیادہ ان میں جزوی حقیقت پائی جاتی ہے۔ اس عاجز کے نزدیک ہابیل کا حقیقی

مفہوم ہے — پہلا — جسے موجودہ عربی میں اول کہا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اور ان کی ہدایت کے مطابق حضرت آدم و حوا نے حضرت ہابیل کو نسل آدم

میں اس روئے زمین پر نئی جاری شدہ سنت کے مطابق پیدا ہونے والی جائز پہلی اولاد مانا ہے۔ (اس

کی تقریر کے لیے علمی اور بطور خاص لسانی بحث کی یہاں گنجائش نہیں لہذا اسے حذف کیا جاتا ہے)

اس سے دو بات سامنے آتی ہے:

پہلی بات یہ کہ ولادت کی ترتیب کے اعتبار سے تو ہابیل آدم و حوا کے یہاں ہونے والی دوسری ولادت تھے لیکن زمین پر پہلی آدم اولاد۔

دوسری بات یہ کہ ہابیل سے پہلے وضع حمل کے نتیجے میں پیدا ہونے والا بچہ قابیل ولادت کے اعتبار سے پہلا ضرور تھا اور اس اعتبار سے وہ بیٹا تو مانا گیا لیکن نہ تو وہ زمین کی سنت عادیہ کے مطابق پیدا ہونے والا بیٹا تھا نہ جنت کی سنت عادیہ کے مطابق لہذا وہ نہ جنتی مخلوق آدمی تھا نہ ارضی مخلوق آدمی۔ لہذا وہ اپنی صفات، قوت، طاقت، ساخت، مزاج ہر اعتبار سے غیر آدمی یا کم از کم نیم آدمی تھا اور اگر گہرائی سے غور کیا جائے تو دراصل قابیل ابلیس کے مکر (Machination) کے تحت اللہ کی سنتوں میں فساد ڈال کر پیدا کیا جانے والا پہلا آدم نما مخلوق تھا جو اپنی طینت یا سرشت میں ابلیس سے مشابہ تھا۔ اس میں آدمی کے صفات بھی تھے اس لیے کہ متلفی حمل اور حاملہ دونوں آدمی تھے، اس میں ملکی صفات بھی تھے اس لیے کہ یہ حمل الجنت میں قرار پایا تھا اور ناری صفات بھی تھے اس لیے کہ سب کچھ ابلیس کے (Machination) کے نتیجے میں ہوا تھا۔ (اس سے زیادہ تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں)

چنانچہ ہابیل کے پیدا ہونے سے قبل ہی شیطان نے پوری حکمت عملی تیار کر لی تھی کہ اس بچے کے تولد ہوتے ہی وہ کس طریقہ کار سے خیر کا خاتمہ کروادے گا۔

ابلیس کو پہلی ضرب اس وقت لگی جب وہ بچہ پیدا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق خود اس کے ماں باپ نے اسے پہلی اولاد ماننے سے انکار کر دیا۔ اس تعلق سے دو باتیں کہی جاتی ہیں جو اس عاجز کے نزدیک سراسر افسانہ ہیں اور اس کی کوئی اصل نہیں:

- (۱) پہلی بات یہ کہ قابیل اور ہابیل جڑواں تھے۔ عام طور پر یہ بات یہودیت کہتی ہے۔
- (۲) دوسری بات یہ کہ اس وقت ولادت کا طریقہ اللہ تعالیٰ نے یہ جاری فرمایا تھا کہ آدم و حوا کے ہر بطن سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی کی پیدائش ہوتی تھی۔ ہم اس وقت جس عہد کی بات کر رہے ہیں اس وقت یہ سنت جاری نہیں ہوئی تھی۔ اس سنت کا اجراء بعد میں ہوا۔

حضرت آدم اور حضرت حوا نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت ابلیس کے سوچے سمجھے منصوبے اور حکمت عملی کو اس مرحلے میں اس طرح خاک میں ملا دیا کہ انہوں نے قابیل کو اپنی جائز

اولاد نہیں مانا بلکہ ایک ایسی ولادت مانا جو ان کی غلطیوں کے نتیجے میں ہوئی تھی۔

ابلیس کا منشا یہ تھا کہ وہ قابیل جیسے آسان شکار (Soft Target) کے ذریعہ اور خود آدم و حوا کی ایک آدمی نما اولاد کے ذریعہ پوری نسل انسانی میں فساد برپا کر دے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی قوت سازش کرے اور کسی بادشاہ کے ولی عہد پر خاموشی سے کام کرے اور اس کے پیش نظریہ ہو کہ لازماً یہ ولی عہد کل بادشاہ ہو جائے گا تو خود اس وقت کے جائز بادشاہ کے ذریعہ فی الواقع ہم مقتدر ہو جائیں گے۔ لیکن وہ بادشاہ ولی عہد بنانا تو دور کی بات اسے اولاد تو مانے مگر ناجائز۔ اور اس کا اعلان بھی کر دے۔ اور اس طرح سازش کرنے والوں کے سارے منصوبے کو خاک میں ملادے۔ ابلیس کی پوری نسل آدم کے تعلق سے اتنی جامع حکمت عملی پہلی بار سامنے آئی تھی۔ جسے حضرت آدم اور حوا نے ناکام بنادیا اور اس طرح تیسرے مرحلے کے پہلے دور کا پہلا معرکہ ابلیس کی ناکامی پر منتج ہوا۔

دوسرا حصہ : ہابیل : 12000 قبل مسیح

دوسرے حصے کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ نے اس زمین پر جاری نئی سنت کے مطابق حضرت آدم اور حضرت حوا کو پہلی اولاد سے نوازا۔ اور آغاز میں ہی انہیں بتادیا کہ یہی تمہاری پہلی جائز اور میری طرف سے صالح اولاد ہے۔ یہاں صالح کی ایک اور دقیق معنویت جان لینے ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا کے بغیر کسی انسان میں محزون صالحیت کے عناصر اس کے نطفے کے ذریعہ اس کی اولاد میں منتقل ہو ہی نہیں سکتے۔ لہذا یہی وجہ ہے کہ جب حضرت آدم اور حضرت حوا نے مقاربت کی تو وہ عناصر قابیل میں منتقل نہیں ہوئے۔ اس تعلق سے اللہ تعالیٰ کی دوسری سنت یہ ہے کہ اگر صالحیت کا ایک سلسلہ کسی سبب سے مفسدہ میں پڑ جائے یا ختم ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس سے ماقبل کے انطباعی نقطے سے کسی دوسرے سلسلے کے اندر پائے جانے والے صالحیت کے عنصر کو متحرک (Reactive) کر دیتا ہے جس کا ذکر ان شاء اللہ بعد میں آئے گا۔

چنانچہ ابلیس نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو ایک صالح اولاد دے دی ہے اور اس میں الجتہ میں وہاں کی سنت کے مطابق تناسل کو زمینی تناسلی نظام میں جاری فرما دیا ہے تو یہ اس کی زمین پر دوسری بڑی شکست تھی۔

اب اس نے ایک نئی حکمت عملی وضع کی۔ اس نے قیاس کیا کہ جب ہابیل آدم و حوا کی پہلی جائز اولاد مانا جا رہا ہے۔ تو یقیناً آدم کی نسل اسی سے آگے جائے گی جس میں لازماً پیدا ہونے والے وہ سارے انبیاء اور صلحاء ہوں گے۔ تو اب جب کہ وہ عنصر ہابیل میں منتقل ہو چکا ہے اگر اس کا ہی خاتمہ کر دیا جائے تو یہ سارا سلسلہ ہی ختم ہو جائے گا۔ اور زمین پر صرف وہ اولاد باقی رہ جائے گی جسے ابھی جائز نہیں مانا جا رہا ہے۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ ہابیل کی موجودگی میں اس غیر صالح اولاد کا قاتل کو وراثت کے لیے قطعاً قبول نہیں کیا جائے گا۔ لہذا اس نے ہابیل کو قاتل کے ذریعہ ہی قتل کر دیا۔ یہ واقعہ بہت پیچیدہ، دور رس نتائج کا حامل اور اس روئے زمین کی بقیہ تاریخ معرکہ خیز و شر پر روشنی ڈالنے والا ہے لیکن ہم طوالت کی مجبوریوں سے اس مرحلے میں اس پر تفصیلی بحث کرنے سے قاصر ہیں۔

واضح ہو کہ ہابیل کی ولادت زمینی سنت کے مطابق پہلی ولادت تھی اس لیے ہابیل پہلی زمینی جائز اولاد تھے لیکن اس وقت تک زمین پر صرف زمینی سنت جاری ہوئی تھی اور ابھی تک مکمل انسانی سنت کا اہراء نہیں ہوا تھا۔ جس کا ذکر بعد میں آئے گا۔ اس لیے حضرت ہابیل جنتی سنت کے بعد جاری ہونے والی زمینی سنت کی پہلی اور جائز سعید اولاد تھے۔ لیکن یہ دور خود ایک عبوری دور تھا جو بالآخر انسانی سنت میں بدل گیا۔ زمینی سنت کا زمانہ اس طرح ولادت اولاد کا زمانہ نہ تھا جیسا کہ آج ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زمینی سنت جنتی سنت سے قریب تر بلکہ اس کی مبدل (Converted) شکل تھی جس میں صرف ایک اولاد ہوتی اور طویل ترین عمر پاتی۔

ممکن ہے اس قتل کے پیچھے ابلیس کی ایک اور چال ہو۔ اس نے اللہ تعالیٰ کی تدبیر کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چند کہ آدم و حوا کو الجنت سے باہر کر دیا ہے اور اب ان پر زمینی سنت جاری فرمادی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ آدم و حوا کے توبہ سے بے حد خوش اور مطمئن ہے اور ان دونوں پر ایک ایسا انعام کرنا چاہتا ہے جس کے ذریعہ آدم و حوا نہ صرف یہ کہ اپنی حالت بحال کر لیں یعنی الجنت کی حالت پر لوٹ جائیں بلکہ عین ممکن ہے کہ وہ چور دروازہ بھی بند ہو جائے جس کے ذریعہ ابلیس نے آدم و حوا کو الجنت میں گمراہ کروایا تھا۔ واضح ہو کہ دوسرے مرحلے میں ابلیس کی حکمت عملی کی بنیاد تھی:

آدم و حوا کی ساخت کی خاص ہیئت — اور اس کا بنیادی سبب تھا مرحلہ اول کے ایک

آدم یا آدم قدیم کا جو ایک میں دو (Two -in-one) تھا ایک جمع ایک (one+one) ہو جانا۔

لہذا اگر اس زمین پر انہیں نہ صرف تبدیل (Convert) کر دیا جائے جواب ان کی ضرورت ہے بلکہ اس تبدیلی کے عمل کو رجعت (Reversion) میں بدل دیا جائے — یعنی دوبارہ آدم و حوا کو جنت کی حالت میں لانے کے بجائے الجنت کی پہلی حالت میں جہاں صرف آدم تھا لادیا جائے۔ یعنی اس ایک جمع ایک کو revert کر کے آدم و حوا کو ایک کر دیا جائے۔ اس لیے کہ Two -in-one آدم پر ابلیس کا مطلق اثر نہیں ہوا تھا۔ ممکن ہے ابلیس نے ہانبل کی پیدائش اور طویل عرصے تک کسی اور اولاد کے نہ ہونے سے اللہ کے ارادوں کے تعلق سے یہی مطلب لیا ہو۔ اور اس نے نتیجہ نکالا ہو کہ اب اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ہانبل ایک جمع ایک (One Plus One) سے ایک میں دو (Two-in-one) ہو چکا ہے اور کسی صورت سے اس کا خاتمہ کر دیا جائے تو ہانبل کا خاتمہ قصہ آدم کا خاتمہ بن جائے گا۔ ایسا سمجھنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ابلیس نے دیکھا کہ آدم کو الجنت سے لا کر باضابطہ طور پر زمین کے نظام کے مطابق آباد کرنے کے بجائے عبوری نظام میں رکھا گیا ہے۔ جیسے نقل مکانی کر کے آنے والے پناہ گزینوں کو اس زمین کے دیگر باشندوں سے الگ۔ کیمپوں میں رکھا جاتا ہے اس لیے کہ خطرہ ختم ہونے کے بعد انہیں پھر اپنے ملکوں میں بھیج دیا جائے گا۔ چنانچہ ابلیس روئے زمین اور زمین کی سنتوں سے واقف تھا۔ اور اس نے دیکھا کہ اس وقت آدم و حوا کی اس اولاد ہانبل میں جاری سنت اس سے مختلف تھی۔ لہذا ابلیس کو اور بھی یقین ہو گیا کہ ضرور اللہ Reversion کا ارادہ رکھتا ہے۔

قائیل و ہانبل کی لڑائی اور اس کے لیے بہن پر جھگڑا یہ سب افسانے ہیں۔ یہ معرکہ حق و باطل تھا بلکہ وہ عظیم معرکہ خیر و شر جہاں خلافت کی کائناتی لڑائی (Cosmic War) چل رہی تھی اور زمین و آسمان تہہ و بالا ہو رہے تھے۔

چنانچہ یہ لڑائی اس بات پر تھی کہ ہانبل نسل آدم اور خلافت آدم اور اس سے آگے جا کر خلافت اللہ کا مستحق ہے یا قائیل۔ اور حضرت آدم و حوا نے اللہ کی مرضیات کے مطابق ہانبل کا انتخاب کر کے اور قائیل کے و عمو کو از سر نو رد کر کے دراصل اللہ کے اس حکم کو قائم فرمادیا تھا کہ آدم خلیفۃ اللہ ہے اور ہانبل ان کا وارث۔ قرآن نے اس پورے واقعے کو اس طرح پیش فرمایا ہے:

”اذ قربا قرباناً فتقبل من احدهما ولم يتقبل من الآخر قال

لاقتلنك قال انما يتقبل الله من المتقين۔“ (المائدہ : ۲۷)

ترجمہ : اور جب نیاز کی دونوں نے کچھ نیاز اور مقبول ہوئی ایک کی اور نامقبول ہوئی دوسرے سے کہا میں تجھ کو قتل کر دوں گا وہ بولا اللہ قبول کرتا ہے تو پرہیزگاروں سے۔

یہاں مذکور تین آیتیں اتنی گہرائی اور معنویت سے لبریز ہیں کہ اگر ان کی یہ عاجز تفصیل بیان کرے تو اس میں بیان کردہ تمام پہلوؤں کا سرسری احاطہ کرنے میں بھی سینکڑوں صفحات صرف ہو جائیں۔ تاہم اس معرکے کی کچھ گہری باتیں ان شاء اللہ اصحاب رسول اللہ ﷺ کے ذکر کے موقع پر آئیں گی۔

یہ معرکہ دو افراد یعنی ہانبل و قانبل کے درمیان نہ تھا۔ نہ ہی یہ معرکہ صرف دو لوگوں کے درمیان تھا۔ یہ ایک کائناتی معرکہ (Cosmic Struggle) تھا جس میں خیر کی ساری فوج — بشمول ملائکہ حضرت حوا اور حضرت ہانبل — حضرت آدم کی قیادت میں اس فوج قاہرہ سے ٹکرائی تھی جس کی قیادت ابلیس کر رہا تھا اور جس میں کائنات کے شیاطین مک، شیاطین جن اور قانبل شامل تھے۔

خیر و شر کا یہ معرکہ خیر کے لیے بڑی تباہی کا باعث ہوا اور اس کا نتیجہ المناک ہوا اور حق کا قافلہ ایک عظیم المآل اور خوفناک بحران کا شکار ہو گیا۔ وہ بحران تھا قانبل کے ذریعہ زمین پر پہلی زمینی آدمی اولاد ہانبل کی شہادت۔ حق کی راہ میں روئے ارض پر یہ پہلا جہاد تھا اور یہ پہلی شہادت تھی۔ اور حضرت ہانبل کی شہادت کے بعد قافلہ حق ایک بحران کا شکار ہو گیا۔ روئے ارض پر نسل آدم کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ اس طرح معرکہ خیر و شر کے مرحلہ سوم کے پہلے دور کے دوسرے حصے کا اختتام حق کے لیے ایک بحرانی کیفیت سے دوچار ہونے کے ساتھ ہوا۔

دوسرا دور : حضرت شیث علیہ السلام : 11500 قبل مسیح

ابھی ہم نے دیکھا کہ مرحلہ سوم کے پہلے دور کا دوسرا حصہ حق کے لیے سنگین بحران پر ختم ہوا۔ غالباً یہ وہی صورت حال تھی جب اللہ تعالیٰ نے اہل حق کی مدد فرمائی۔ اور اس نصرت کا بنیادی سبب یہ تھا کہ حق اور الآدم کے دونوں نمائندے یعنی حضرت آدم اور حضرت حوا بحمد اللہ زندہ اور سلامت تھے۔ اور صورت حال یہ تھی کہ حق کے خلاف شیطان کو ایک بہترین آلہ کار ایسا مل گیا تھا جو اگرچہ کہ نیم آدمی، نیم ملک اور نیم جن تھا لیکن جس کی پیدائش میں سوئے اتفاق خود آدم و حوا کا ہاتھ تھا۔ چنانچہ یہ بحران متعدد الوجوہ ہو کر پیچیدہ تر ہو گیا تھا۔

ایسے موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت میں تبدیلی فرمادی۔ سنت کی یہ تبدیلی اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ کسی درجے میں ابلیس کا یہ اندازہ درست تھا کہ اللہ تعالیٰ حضرت ہابیل کی شکل میں حضرت آدم اور حضرت حوا کو دوبارہ جمع کر کے الجنت میں آدم قدیم کی حالت میں لا رہا تھا یا لانے والا ہے۔ یعنی حضرت آدم اور حوا کے اس بیٹے ہابیل میں وہ صفت عظمیٰ موجود ہوں گے کہ وہ آدم قدیم کی حیثیت کو بحال کر دے۔ ممکن ہے ابتداء پیدائش سے ہی حضرت ہابیل میں ان صفات عظمیٰ کے جوہر نظر آنے لگے ہوں۔ لہذا ہابیل کو شہید کر کے ابلیس نے آدم کی الجنت میں بحالی کی راہ ایک طویل مدت تک کے لیے بند کر دی۔ چنانچہ ایسا لگتا ہے کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے دو فیصلے فرمائے جو درج ذیل ہیں:

(۱) ہابیل کا بدل پیدا کرنا۔

(۲) اس عبوری زمینی سنت کے بجائے مکمل زمینی سنت کا اجراء کرنا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور حضرت حوا کو ایک اور اولاد دی۔ جن کا نام حضرت شیث تھا۔ غور طلب امر یہ ہے کہ حضرت شیث کے نام کے تعلق سے علماء یہود اور علماء نصاریٰ میں کئی اقوال رائج ہیں۔

جدید علماء نصاریٰ کا کہنا ہے کہ حضرت شیث کو اللہ تعالیٰ نے مضبوط جسم اور جنگجو پیدا فرمایا اس لیے ان کا نام شیث رکھا گیا جو ”شاؤونی“ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں جنگجو۔

علماء یہود کا خیال ہے کہ چونکہ حضرت شیث حضرت ہابیل کی موت کے بعد پیدا کیے گئے اس

لیے وہ دراصل اللہ کی طرف سے ان کے 'مثل' تھے۔ جو لفظ "شیث" ہی سے مشتق ہے۔ اس عاجز کی رائے یہاں علماء یہود سے ملتی جلتی ہے۔ بلاشبہ حضرت شیث حضرت ہابیل کے ثنی تھے۔ اور اس کا تعلق دراصل اللہ کی اس سنت سے ہے جس کا ذکر قرآن اور احادیث میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ (۱) اس سنت کا سب سے واضح ذکر سورۃ الانسان آیت: ۳۸ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

نحن خلقناهم وشددنا أسرهم وإذا شئنا بدلنا أمثالهم تبديلاً.
(الانسان ۲۸)

ترجمہ: ہم نے ان کو بنایا اور باندھے ان کے جوڑ بند اور جب ہم چاہیں بدل لائیں ان جیسے لوگ۔

(۲) اللہ تعالیٰ کی اس سنت کا دوسرا واضح تذکرہ سورۃ الکہف میں ملتا ہے۔ قرآن میں آتا ہے:

إِذَا الْغُلَامُ فَكَانَ أَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِينَا أَنْ يُرْهِمَا طُغْيَانًا
وَكُفْرًا فَارَدْنَاهُ أَنْ يَبْدُلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِنْهُ زَكَاةً وَأَقْرَبَ رَحْمًا.
(الکہف: ۸۰-۸۱)

ترجمہ: اور جو لڑکا تھا سو اس کے ماں باپ تھے ایمان والے پھر ہم کو اندیشہ ہوا کہ ان کو عاجز کر دے زبردستی اور کفر کر کے۔ پھر ہم نے چاہا کہ بدلہ دے ان کو ان کا رب بہتر اس سے پاکیزگی میں اور نزدیک تر شفقت میں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم و حضرت حوا کو حضرت شیث جیسا بدل فراہم کر دیا۔ لیکن اس عاجز کے نزدیک شیث کا ایک اور مفہوم بھی ہو سکتا ہے جو ابھی بیان کردہ دوسرے مفہوم میں اضافہ ہوگا۔ یعنی شیث کے ایک معنی دو — بھی ہو سکتے ہیں۔ یعنی حضرت شیث حضرات آدم و حوا کی دوسری اور حضرت ہابیل کے بعد پہلی اولاد ہیں۔ یہی بات علماء نصاریٰ کے دو گروہوں کے مابین بھی ایک اہم وجہ اختلاف ہے۔ یعنی یہووائی شجرۃ (Yahwist Genealogy) کے مطابق حضرت شیث (پیدائش: 4:25) کے مطابق حضرت آدم و حضرت حوا کی تیسری اولاد ہیں جو حضرت ہابیل کی موت کے بعد قاتیل کے مقابل میں پیدا کی گئی۔ دوسری طرف عبادی شجرہ (Priestly Genealogy) کے مطابق (پیدائش: 5:3) حضرت شیث حضرت آدم و حوا کی پہلی اولاد ہیں۔

یہ تینوں باتیں ایک ہی نتیجہ پر آمد کرتی ہیں:

(۱) حضرت شیث حضرت ہابیل کی شہادت کے بعد پیدا ہوئے۔

(۲) حضرت آدم اور حضرت ہابیل کے مثل تھے۔

(۳) وہ ترتیب کے اعتبار سے تیسری جائز کے اعتبار سے دوسری، اور زندہ رہنے والی اور

حضرت آدم کی قیادت کرنے والی پہلی اولاد تھی۔

لیکن ایسا لگتا ہے کہ اس سنت کا اجراء دراصل حضرت آدم اور حضرت حوا کو اس بحرانی کیفیت سے نکالنے کے لیے اللہ رب العزت کی طرف سے ایک رحم تھا جو آدم و حوا کی بقا کے لیے ناگزیر ہو چکا تھا چنانچہ جہاں ایک طرف رحم کا معاملہ کیا گیا تو دوسری جانب اس زائد رحم کے بجائے آزمائش کی صورت کی سنگینی میں اضافہ کر دیا گیا۔ یعنی ایک رعایت (Grace) تو دی گئی مگر اس کے بجائے درجے میں مزید کمی کر دی گئی۔ اور وہ کمی یہ کر دی گئی کہ جنتی سنت کے بعد عبوری زمینی سنت اور اب اس کے بعد مستقل الی یوم الوقت المعلوم تک رہنے کے لیے باضابطہ زمینی سنت کا اجراء کر دیا گیا۔ چنانچہ اس رحم سے حضرت آدم و حوا حق کی جدوجہد اور بحالی کی کوشش جاری رکھنے میں کامیاب تو ہوئے مگر اب بحالی کا سفر مزید طویل اور سخت ہو گیا۔ اب مستقل زمینی سنت، کے اجراء اور عبوری زمینی سنت کے خاتمے سے جنت کی فوری واپسی اور بحالی کی صورت مؤخر ہو گئی اور اب گویا یہ طے پا گیا کہ نسل آدم کو قیامت تک اس زمین پر ہی زندگی بسر کرتے ہوئے اس کی کوشش کرنا ہوگی۔

تیسرا دور : حضرت انس علیہ السلام: 11000 قبل مسیح

توراة کی سورۃ برائیت کے باب 4 سطر 26 اور باب 5 سطر 6 کے مطابق حضرت شیث کی پہلی اولاد حضرت انس تھے جسے توراة میں انش کہا گیا ہے۔ چونکہ حضرت شیث کے بعد حضرت آدم اور حوا کی کئی اولادیں ہوئیں جن میں ازدواجی رشتوں کا آغاز ہوا اور یہی وہ دور تھا جب ایک بطن کے لڑکے لڑکیوں کی شادیاں دوسرے بطن کے لڑکے لڑکیوں سے ہونا شروع ہوئیں۔ لیکن ابھی بھی روئے زمین پر نسل آدم عبوری دور سے گزر رہی تھی۔ یعنی شیث اور شیث کی طرح حضرت آدم و حوا کی دیگر اولاد دراصل ان ماں باپ کی اولاد تھے جو خود یا تو جنتی تھے یا جنت میں

بسائے جانے سے پہلے کی تخلیق۔ اس طرح یہ لوگ اگرچہ آدمی تھے مگر زمینی ہونے کے اعتبار سے آدمی تھے اور ابھی تک پوری طرح زمینی نہیں ہوئے تھے۔

حضرت انس اس اعتبار سے پہلے انسان ہوئے جن کے والد اور والدہ دونوں زمین کی پیداوار تھے۔ اور یہیں سے اس انسان کا آغاز ہوا جو اس وقت زمین پر آباد ہے۔

بہت ممکن ہے سورہ الدھر — کی جسے سورہ انسان بھی کہا جاتا ہے — ابتدائی آیتیں اسی دور کے آغاز کی طرف اشارہ کر رہی ہوں یعنی:

(۱) وہ دور جب نسل آدم و حوا پوری طرح زمینی انسان بن گئی۔

(۲) وہ دور جب اس نسل آدم و حوا میں نطفہ امشاج سے تخلیق کا باضابطہ آغاز ہونا شروع

ہو گیا۔ ممکن ہے بلکہ عین ممکن ہے کہ حضرت آدم و حوا میں یہ نظام دوسری حالت میں جاری ہو۔

(۳) وہ دور جب نسل آدم و حوا میں باضابطہ رسالت و نبوت کا آغاز ہوا۔ ممکن ہے کہ

حضرت آدم کی دنات کے بعد حضرت شیث پہلے مبعوث نبی ہوں یا پھر حضرت انس ہی پر پہلی بعثت ہوئی ہو۔

(۴) وہ دور جب نسل آدم و حوا میں باضابطہ توحید، رسالت، قیامت، بعثت بعد الموت،

یوم الحساب، اور آخرت کا باضابطہ عقیدہ سمجھایا گیا ہو۔

چنانچہ قرآن میں ارشاد فرمایا گیا:

”کیا انسان پر ایک وقت زمانے میں ایسا بھی گزرا ہے جب وہ کوئی قابل ذکر چیز

نہ تھا ہم نے انسان کو ایک مخلوق نطفے سے پیدا کیا اور ہم اسے پلٹے رہے پھر کر دیا ہم نے

اس کو بننے والا، دیکھنے والا۔ ہم نے اس کو بھائی راہیا حق ماننا ہے یا ناشکری کرتا ہے۔ ہم

نے تیار کر رکھی ہیں منکروں کے واسطے زنجیروں اور طوق اور آگ و کھتی۔ البتہ نیک

لوگ پیئیں گے پیالہ جس کی ملونی ہے کا نور ایک چشمہ ہے جس سے پیئیں گے بندے اللہ

کے۔ اور جہاں چاہیں گے اس کی شاخیں نکال لیں گے یہ لوگ ہوں گے جو نذر پوری

کرتے ہیں اور ڈرتے ہیں اس دن سے کہ جس کی آفت ہر طرف پھیلی ہوئی ہوگی۔“

(الدھر ۱-۷)

توراة میں مذکور عمروں کا اگر ذکر کیا جائے تو حضرت آدم تا حضرت انس اپنی اپنی عمر کے

اعتبار سے اس طرح ہوں گے:

(۱) حضرت آدم	930 سال
(۲) حضرت شیث	912 سال
(۳) حضرت انس	905 سال

ایسا لگتا ہے کہ معرکہ خیر و شر کے تیسرے مرحلے کا تیسرا دور انقلاب آفریں ہوا۔ اب اس نے روئے زمین پر معرکہ خیر و شر کی باضابطہ صف آرائی کر دی جو ہمہ جہت اور رفتہ رفتہ متعدد الابعاد (Multi-dimensional) ہونے کے ساتھ ساتھ وسیع الاطراف ہو جانے والی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کا سبب اصلی ابلیس تھا جس کی جانب سے نئے اور متعدد الابعاد حکمت عملی کا جو ہمہ دم، وسیع الاطراف ہوتی جا رہی تھی آغاز ہو رہا تھا۔ جس نے ایک طرف انسان پر ہمہ جہت ابلیسی حملے کی شکل اختیار کر لی تھی لہذا نتیجتاً دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے انبیاء اور رسولوں کی بعثت کا سلسلہ شروع ہو گیا تو تیسری طرف روئے ارض پر ہر جگہ اور ہمہ دم معرکہ خیر و شر کے شعلے بھڑکنا شروع ہو گئے۔

مرحلہ چہارم : ابلیس کا مافوق البشری دیو ہیکل نیوانی قوتوں کے ذریعہ حملہ اور ارضی جنگ حضرت ادریس علیہ السلام : 8000 قبل مسیح

روئے زمین پر معرکہ خیر و شر کا مرحلہ چہارم بے حد انقلابی، ہولناک اور دور رس نتائج کا حامل ثابت ہوا۔ یہ مرحلہ کب شروع ہوا اس تعلق سے کئی باتیں کہی جاسکتی ہیں جو درج ذیل ہیں:

(۱) مرحلہ چہارم کا آغاز حضرت انس کے انتقال کے بعد یا ان کی زندگی کے آخری حصے میں ہو گیا۔

(۲) اگر یہ مرحلہ اس وقت نہیں شروع ہوا تو کم از کم حضرت انس کے انتقال کے ڈیڑھ ہزار سالوں کے بعد تو لازمی طور پر شروع ہو گیا۔

اس مرحلے کی خاص بات یہ ہے کہ غالباً حضرت انس کی پیدائش اور زمین پر مکمل انسانی نظام کے اجراء سے ابلیس نے کئی نتائج اخذ کیے جو اپنی جگہ سبب بنے اس کی حکمت عملی کی تبدیلی اور معرکہ خیر و شر کے ایک نئے رخ کے اختیار کرنے کے۔ ان اسباب کا خلاصہ اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

(۱) حضرت انس کی پیدائش، زمین پر مکمل انسان کی تخلیق، دین اللہ کا باضابطہ لفظ، اس کے تشریحی پہاؤں کا آغاز، رسالت کا آغاز اور انسانی معاشرے میں عبادات اور معاملات کی باضابطہ تشکیل نے حضرت ادریس کی قیادت میں پوری نسل انسانی کو قابیل کی نسل کے علاوہ باضابطہ طور پر ایک لفظ اور نظام کا حصہ بنادیا۔ جس نے ابلیس کے لیے انسانوں کو گمراہ کرنے کا کام مشکل بنادیا۔ اسی سبب نے ابلیس کو مجبور کیا کہ وہ انسان پر اپنی فتح کے لیے اپنے طریقہ کار اور دائرہ کار میں بنیادی تبدیلی کرے۔

(۲) زمین پر باضابطہ نظام کی تشکیل میں اسے امید کی ایک نئی کرن نظر آئی۔ اسے محسوس ہوا کہ اب اس نے کم از کم اس میں کامیابی ضرور حاصل کر لی ہے کہ انسان زمین پر ہی قیامت تک رہے گا۔ وہ خطرہ جو حضرت ہابیل کی پیدائش اور ان میں ایک۔ میں۔ دو کے اجراء سے

پیدا ہوا تھا اور آدم کے دوبارہ الجسہ کی واپسی عنقریب نظر آنے لگی تھی اس کا خطرہ اب ہمیشہ کے لیے یا کم از کم قیامت تک کے لیے ٹل گیا۔ لہذا اب یہ نسبتاً آسان ہو گیا کہ انسان کے خلاف ایسی حکمت عملی کا آغاز ہو جو اسے روئے ارض پر ہی طبعی اور روحانی طور پر ختم کر کے معرکہ خیر و شر سے ہمیشہ کے لیے اسے باہر (Knock out) کر دے۔

لیکن یہ کام اب آسان نہ تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت جو انبیاء بھیجے اور انہیں جو شریعت دی۔ اس کا الشیطان نے بغور مطالعہ کیا اور انسان کے تعلق سے اللہ تعالیٰ کی حکمت عملی کا اندازہ قائم کیا۔ چنانچہ اس پر تدبر اور تفحص کے بعد اس نے ایک ایسی ہولناک حکمت عملی تیار کر لی جس کا مقصد تھا انہ ان کا کلی خاتمہ۔ اس حکمت عملی کے دو جزء تھے:

(۱) فساد عقیدہ اور

(۲) فساد طبع

چونکہ یہ مرحلہ بے حد انقلابی، ہولناک اور دور رس نتائج کا حامل تھا اس لیے اس کی اور بعد کے ادوار میں پیش آنے والے واقعات کی پوری تفہیم کے لیے ضروری ہے کہ چند بنیادی امور کے تعلق سے کچھ توضیحات سامنے آجائیں۔

توضیحات

(۱) حضرت ادریس علیہ السلام :

قرآن میں حضرت ادریس علیہ السلام کا ذکر بڑے اولی العزم انبیاء کے اعتبار سے کیا گیا ہے۔ آپ کون تھے؟ اس عاجز کی تحقیق کے مطابق ادریس کسی اولوا العزم نبی کا نام نہیں بلکہ لقب تھا۔ جو اس قدر متداول ہو گیا کہ وہ نام کا بدل بن گیا۔ چنانچہ اس تعلق سے کہ 'ادریس' جن اولی العزم نبی کا نام یا لقب تھا وہ کون تھے کئی باتیں سامنے آتی ہیں:

(۱) آپ حضرت شیث کی وہی اولاد تھے جنہیں مرحلہ سوم کے تیسرے حصے میں حضرت انس کہا گیا ہے۔ یعنی آپ حضرت انس بن شیث بن آدم تھے۔ یہ وہی انس ہیں جنہیں توراۃ انوش (Enosh) کہتی ہے۔ اور قرآن میں انہیں کا نام سورہ ص آیت: ۴۸ میں السبع آیا ہے۔ یہ السبع وہ نہیں جن کا ذکر الانعام آیت ۸۶ میں آیا ہے۔

(۲) آپ حضرت شیث کے بیٹے انس نہ تھے بلکہ ان کے پڑپوتے کے پوتے تھے۔ یعنی آپ حضرت انس بن یزد بن مہال لیل بن کینان بن انس بن شیث بن آدم تھے۔ یہ دعویٰ انس ہیں جنہیں توراة حنوخ (Enoch) کہتی ہے اور جیسا کہ ماقبل عرض کیا گیا کہ انہیں کا نام قرآن نے الیسع اور لقب ادریس رکھا ہے۔

قرآن نے ایک ہی بات بیان کرنے کے لیے ایک جگہ انہیں الیسع اور دوسری جگہ ادریس کہا ہے:

(۱) واسمعیل وادریس وذاکفل کل من الصابرين۔ (الانبیاء: ۸۵)

ترجمہ: اور اسمعیل اور ادریس اور ذوالکفل سبھی صابروں میں سے تھے۔

(۲) وانکر اسمعیل والیسع وذاکفل وکل من الاخیل۔ (ص: ۴۸)

ترجمہ: اور ذکر کرو اسمعیل اور الیسع اور ذوالکفل اور تمام ان لوگوں کا جو اخیر

میں سے تھے۔

اس عاجز کار حجام اسی جانب ہے کہ حضرت ادریس ہی حضرت الیسع (سورہ ص: ۴۸) تھے اور وہ دراصل حضرت انس بن یزد بن مہال لیل بن کینان بن انس بن شیث بن آدم ہی تھے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت الیسع کو قرآن نے ادریس کیوں کہا؟

زمین پر معرکہ خیر و شر میں ابلیس نے جب نئے طریقہ سکار، حکمت عملی اور ہتھیاروں کا استعمال کرنا شروع کر دیا (جس کا کسی قدر تفصیلی ذکر توضیحات کے بعد آرہا ہے) تو اللہ تعالیٰ نے اہل حق کی نصرت فرمائی۔ اور ایک نئی قسم کی نصرت کا دروازہ وا کر دیا۔ ممکن ہے اس کے لیے حضرت انس بن شیث یا حضرت یزد یا حضرت مہال لیل یا حضرت کینان نے کوئی خصوصی مدد مانگی ہو۔ اور وہ قبول ہو گئی۔ یہ نصرت وہ ہے جسے قرآن کے ’کفل‘ کہا ہے۔ (ان شاء اللہ اس کی تشریح توضیحات کے ذیل میں آرہی ہے۔) اور اسی ’کفل‘ کی نصرت کا ظہور تھا کہ حضرت الیسع ادریس بنا دیئے گئے۔

چنانچہ نصرت کفل کا نتیجہ تھا کہ حضرت الیسع کی آدمیت یا انیسیت پر ملکوتیت کا غلبہ ہو گیا اور آپ انس ہوتے ہوئے ملائکتہ بنا دیئے گئے۔ چونکہ آپ کا ملائکتہ بنادیا جانا معرکہ خیر و شر کی ایک خاص مصلحت اور مجبوری کے سبب تھا اس لیے آپ اہل ارض کو چھوڑ کر السماء میں چلے گئے اور اس

صورت میں اہل ارض کے مخصوص اہل حق سے آپ کا رابطہ بحال رہا۔

اس صورت میں ادریس کے لقب دیئے جانے کے دو وجوہات ہو سکتے ہیں:

(۱) لفظ ادریس دراصل درس سے مشتق ہے۔ جس کا مطلب ہے پرندوں کی طرح اڑنا

اور منڈلانا جو ملائکہ کی ایک صفت ہے جیسے حافین حول العرش۔ چنانچہ اسی نصرت کے بعد آپ کو اللہ تعالیٰ نے ملائکہ بنادیا اور آپ ملائکہ کی طرح ارض و سماء میں اڑا کرتے تھے۔

(۲) لفظ ادریس جیسا کہ عرض کیا گیا کہ درس سے مشتق ہے اور اس کا دوسرا مطلب ہے

پوچھنا، تحقیق کرنا، جاننا اور پوچھنے، تحقیق اور تفحص کرنے کے ذریعہ حقیقت حال جاننا۔ چنانچہ جس مصلحت کے تحت حضرت الیسع کو ملائکہ میں شامل کر لیا گیا تھا اس کے پس منظر میں دو ضرورتیں ہو سکتی تھیں۔ ملک اور ملک ملائکہ کو اللہ کی نافرمانی اور اطمینان کے اتباع سے روکنا اور بنی آدم میں کوشاں اہل حق کی خصوصی نصرت کرنا اور ان نصرتوں میں ایک نصرت تھی ارض پر ہونے والے واقعات جن کے متعلق فیصلوں کی اطلاع اہل سماء کو پہلے ہو جاتی ہے ارضی اہل حق کے پوچھنے پر یا از خود انہیں بتادینا۔

اس عاجز کی رائے میں یہ دونوں ہی مطالب بیک وقت حضرت الیسع پر پورے پورے

چسپاں ہوتے ہیں اس لیے ادریس کا مفہوم ہوا — الیسع الادریس۔ چنانچہ حضرت الیسع جواب ملائکہ کی طرح رہتے تھے اور لوگوں کو خیر و شر کے تعلق سے واقع ہونے والی باتوں سے ان کے وقوع پذیر ہونے سے، قبل پوچھنے پر یا از خود آگاہ کرتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ یوں تو دونوں جگہ جہاں قرآن میں ادریس اور الیسع آیا ہے اللہ تعالیٰ نے نصرت کفل کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً :

(۱) واسمعیل وادریس وذاکفل (انبیاء : ۸۵)

ترجمہ : اور اسمعیل اور ادریس اور ذواکفل

(۲) واذکر اسمعیل والیسع وذاکفل (ص : ۳۸)

ترجمہ : اور ذکر کرو اسمعیل اور الیسع اور ذواکفل کا

لیکن جہاں صرف لفظ ادریس آیا ہے وہاں ایک اور بات کا ذکر کیا گیا ہے:

واذکرفی الکتاب ادریس انه کان صدیقاً نبیاً ورفعنہا مکانا

علیہ۔ (مریم : ۵۷)

ترجمہ : اور ذکر کرو ادریس کی کتاب کے بارے میں بے شک وہ صدیق نبی تھا

اور ہم نے اس کو بلند کر دیا مکان کے اعتبار سے اور اونچائی کے اعتبار سے۔
یہاں رفعت، مکان اور علو قطعاً معنوی نہیں بلکہ حسی ہیں بلکہ طبعی ہیں اور جسمانی
ہیں۔ اور اس میں ذرہ برابر بھی استبعاد نہیں۔

(۲) فساد عظیم :

ابھی ذکر کیا گیا کہ اپنی نئی حکمت عملی کے تحت ابلیس نے روئے ارض پر ایک فساد عظیم
برپا کر دیا۔

معرکہ خیر و شر کے چوتھے مرحلے میں شروع کیا گیا ابلیس کا فساد دو نکتوں پر قائم تھا۔ پہلا
نکتہ تھا فساد عقیدہ اور دوسرا نکتہ تھا فساد طبع۔

فساد عقیدہ :

یہ وہ پہلا موقع ہے جب ابلیس نے آدم کے خلاف حکمت عملی میں تبدیلی یہ پیدا کر دی کہ
اب جب کہ ابناء آدم کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی تھی اس نے عقیدہ کا فساد پیدا کیا۔ غالباً یہ پہلا
موقع تھا جب الشیطان نے انسانیت کو شرک سے آگاہ کیا۔ اب تک ابلیس کے طریقہ کار سے نہ تو
الہیتہ میں اور نہ ہی الارض پر شرک کا کوئی شائبہ پایا جاتا تھا۔ لیکن اب اس نے شرک کی ترویج کی۔
غالباً اس کے دو اسباب ہوں گے۔ زمین پر شریعت کی توضیح سے اس نے یہ اندازہ لگایا ہو گا کہ اللہ
تعالیٰ کی بنیادی تائید بندوں کو اپنی ذات کے گرد مرکوز اور اپنے سے وابستہ رکھنا ہے۔ لہذا اس نے
اللہ مخالف مرکز کی تشکیل کی اور توحید کا ایک مرئی مخالف مرکز ترتیب دیا جو شرک تھا۔ غور کرنے
سے معلوم ہوتا ہے کہ شرک ابتداء شرک فی الصفات سے ہوتے ہوئے شرک فی الذات تک
وسیع ہوا۔ بت خدایہ وہ پتھر کے گول ٹکڑے ہوں یا درخت اس شرک کی ابتداء ہیں جو بعد میں
باضابطہ بت تراشی اور بت پرستی میں بدل گئے۔

یہ وہی فساد ہے جو مرحلہ چہارم کے اس سرے سے اس سرے تک پھیلا ہوا ملتا ہے۔ اور
اسی کریمہ ترین دور کا خاتمہ (ڈراپ سین) حضرت نوح کی حجت پوری ہونے کے ساتھ ہوا جس کا
ذکر قرآن نے اس طرح کیا ہے:

قال نوح رب انهم عصونی واتبعوا من لم یزده ماله ولده الا

خسارا ومكروا مكرا كبلرا وقللوا لا تذرنا الهتكم ولا تذرنا ودا ولا
سوا:علا ولا يغوث ويعوق ونسرا۔ (توح: ۲۱-۲۳)

ترجمہ۔ کہانوح نے اے رب میرے! انہوں نے میرا کہانہ مٹا اور مائیسوں کا
جس کو اس کے ہاں اور اولاد سے اور زیادہ ہو ٹوٹا۔ اور دلو کیا بڑا دلو اور بولے ہر گز مت
چھوڑا اپنے آلہوں کو اور نہ چھوڑا یود کو اور سواع کو اور نہ یغوث کو اور یعوق کو اور نسر کو۔
لیکن اس کا تفصیلی ذکر ان شاء اللہ بعد میں آئے گا۔

چنانچہ اس مرحلہ چہارم میں ابلیس نے پوری روئے زمین میں آدم کی اولاد جہاں جہاں
پھیل گئی تھی وہاں پہنچ کر وہ اور اس کے آلہ کاروں نے شرک کی ترویج کی اور پوری روئے زمین کو
شرک سے بھر دیا۔ یہ وہ فساد عقیدہ تھا جو اس مرحلہ میں ایک نئی حکمت عملی کے ساتھ ابلیس نے
وضع کیا اور اس کو بھرپور توسیع دی۔
فساد طبع :

دوسرا فساد پہلے فساد سے کسی صورت کم بڑا اور وحشت ناک نہ تھا۔ اور یہ فساد تھا نسل
آدم کی حقیقت اور اس کی ساخت کو تباہ و برباد کر دینے کا۔ چونکہ اب ابلیس کو اطمینان تھا کہ زمین پر
انسان کو قیامت تک رہنا ہے اس لیے اس نے ایک ایسی تدبیر اختیار کی جس کے مقاصد درج ذیل
تھے۔

- (۱) آدم کی نسل کو زمین پر فنا کر دینا۔
- (۲) آدم کی نسل کو طبعی طور پر فاسد کر کے اسے معرکہ خیز و شر میں خیر کے نمائندہ کی
حیثیت سے ختم کر دینا۔
- (۳) آدم کی نسل کو طبعی طور پر فاسد کر کے اس کو معرکہ خیز و شر میں ابلیس کے مقاصد
کی تکمیل کے لیے جو دراصل نسل انسانی کی ہی خلافت کے خلاف ہے انسان کو آلہ کار کے بطور
استعمال کرنا۔
- (۴) زمین پر ایک ایسی مفلوج کرنے والی بیماری کو نسل آدم میں پھیلا دینا جس سے خود
بخود اس کے اندر خیر کے تعلق سے صلاحیت اور آملگی ختم ہو جائے۔
- چنانچہ ان مقاصد کے حصول کے لیے ابلیس نے نسل انسانی میں دو کام رائج کیے۔

(۱) زنا بین المخلوقات

(۲) زنا بین الانسان

ان دونوں میں پہلا بے حد وحشت ناک تھا۔ اس کے لیے ابلیس نے شاید روئے زمین پر آدم و حوا کی آمد کے بعد پہلی بار تمام ملک شیاطین اور جن شیاطین کو انسانوں پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔ آدم کے خلاف ابلیس کی کائناتی لڑائی کی یہ پہلی کائناتی توسیع تھی۔ جب اس نے اپنی اور آدم کے درمیان لڑائی کو دو سطحوں تک وسیع کر دیا:

(۱) اس توسیع کا پہلا حصہ تھا معرکہ آرا فریقین میں سے ابلیس کی فوج میں اضافہ اور آدم کے خلاف پہلی بار اتنے بڑے پیمانے پر ملک اور جنوں کا استعمال۔

(۲) اس توسیع کا دوسرا حصہ تھا معرکہ آرائی کے میدان کی توسیع چنانچہ اب یہ لڑائی: فرش زمین، بحر زمین اور فضاء زمین سے آگے بڑھ کر سماء ارض اور اس سے بھی آگے چلی گئی۔

ان دو وسیعیت کا ایک تیسرا نتیجہ بھی برآمد ہوا اور وہ تھا اللہ اور نسل آدم کے درمیان واقع نوافذ اور مطالعہ کے ذرائع پر شیطان کا قبضہ یا ان میں رکاوٹ پیدا کرنا۔

(الف) زنا بین المخلوقات :

زنا بین المخلوقات دراصل ابلیس کا وہ حملہ تھا جو معصوم انسانیت پر ابلیس کی فوجوں نے کر دیا جس میں ملک شیاطین اور جن شیاطین ابلیس کے ساتھ برابر کے شریک تھے۔ چنانچہ وہ بطور خاص آدمی خواتین پر حملہ آور ہوئے اور ان سے زبردستی یا انہیں قابو میں کر کے یا ان سے روابط بڑھا کر ان کے ساتھ طبعی ازدواجی تعلقات پیدا کیے اور اس اختلاط اور زنا کا نتیجہ ہوا زمین پر بین المخلوقات نیم انسانی، نیم ملکی، یا نیم جناتی خلاف طبعی حرام نسل کی پیدائش کا آغاز۔ اور کچھ اپنی طبعی تقاضوں کے تحت اور کچھ ابلیس کے اشارے پر اس نسل کا بعد میں پوری روئے زمین پر فساد برپا کرنا۔

ابلیس کے پیدا کردہ فساد کی یہ اب تک کی سب سے خطرناک شکل تھی جو روئے ارض پر نمودار ہوئی۔ اس عاجز کا خیال ہے کہ اس عہد میں ابلیس نے نسل آدم کو تباہ کرنے کا ایک نہایت بڑا (جس کی تفصیل بیان کرنا یہاں بہت دشوار ہے) منصوبہ بنایا جو ایک ایسی خطرناک سازش تھی جو

اپنی شدت اور وسعت میں ہمہ جہت ہی نہیں ہمہ گیر تھی جس کی تلخیص ذیل میں درج کی جاتی ہے۔
(۱) ابلیس نے نسل انسانی کے مابین تباہ کاریوں کے لیے بین المخلوقات Genetic Cross-breeding کا سلسلہ شروع کیا۔

(۲) اس Criss-Cross Genetic Cross-breeding کا ایک پہلو مختلف مخلوقات کے Developed breed پیدا کرنا تھا۔

(۳) اسی طرح اس Genetic Cross breeding کا ایک مقصد انسانی breed یعنی آدم کے نطفے کو جڑ سے فنا کر دینا تھا۔ تاکہ آدمی کی شکل تو برقرار رہے لیکن نطفہ آدم کا روئے ارض سے خاتمہ ہو جائے۔ یعنی نام نہاد غیر انسانی انسان (So-called Unhuman human) بنانا اس کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد تھا۔

لیکن اس عظیم سازش میں اس وقت ابلیس سے مربوط بنی آدم کی تعداد برائے نام تھی یعنی بنی آدم بنیادی طور پر گروہ حق سے منسلک تھے اور ابلیس کی فوج دوسری طرف اصلاً چند انسانوں اور بیشتر ملک شیاطین اور جن شیاطین پر مبنی تھی۔ اس لیے اس وقت ملک شیاطین اور جن شیاطین ہی ابلیس کی حمایت میں اس بڑے پیمانے پر عامل اور حملہ آور ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ابلیس نے ان ملک اور جن شیاطین کے ذریعہ بنی آدم پر حملہ کر دیا اور نسلی اور طبعی طور پر اسے تباہ کر دینے کی کوشش کی۔

اور اسی حملے کا ایک نتیجہ روئے زمین پر جباروں، نفلوں اور الہیوں کی پیدائش ہے۔ جن کا ذکر الگ الگ کیا جائے گا۔

اس تعلق سے دو خیال پائے جاتے ہیں۔ پہلا خیال یہ ہے کہ ابلیس کی سازش کے پہلے مرحلے میں جباروں کی پیدائش ہوئی دوسرے مرحلے میں نفلوں کی اور تیسرے مرحلے میں الہوں کی۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ یہ بات مرحلے وار بھی ہو سکتی ہے اور بیک وقت مختلف راہوں پر کی گئی کوشش کا نتیجہ بھی۔ اس عاجز کا احساس ہے کہ دوسری بات زیادہ قرین قیاس لگتی ہے۔ یعنی روئے ارض پر ابلیس کی اس سازش کے نتیجے میں بیک وقت جباروں، نفلوں اور الہوں کی پیدائش کا آغاز ہوا اور پھر ان کے نسلدات کا۔

جبار :

جبار وہ دیوبیکل مخلوق ہیں جو آدمی عورتوں پر ملک شیطین اور جن شیطین کے ذریعہ کیے گئے حملے کے نتیجے میں ان عورتوں کے بطن سے پیدا ہوئے۔ اس تعلق سے تین باتیں ممکن ہیں:

(۱) یہ جبار شیطین ملک اور شیطین جن کے اختلاط کا نتیجہ تھے۔

(۲) یہ جبار دراصل شیطین جن اور شیطین قابیل (نسل قابیل جس کا تفصیلی ذکر ان شاء اللہ بعد میں آئے گا جو نیم آدمی، نیم ملک اور نیم جن تھے) کے اختلاط کا نتیجہ تھے۔

(۳) یہ جبار ایسے متعدد السطوح اور متسلسل (Multilayer Chain Cross breeding) اختلاط کا نتیجہ تھے جن کا مقصد شیطین ملک، شیطین جن اور شیطین انس میں Genetic تبدیلی کر کے ایک عظیم الجثہ اور عظیم القوۃ نسل تیار کرنا تھا۔

چنانچہ اس اعتبار سے پیدا ہونے والے لوگ جبار کہلائے جو طویل القامت، دیوبیکل اور غیر معمولی، قوتوں اور صلاحیتوں کے مالک تھے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ پوری طرح افزودہ جبار کی اونچائی ایک لاکھ پینتیس ہزار انچ = گیارہ ہزار دو سو پچاس فٹ = تین ہزار سات سو پچاس گز تک ہوتی تھی۔ چونکہ یہ عام طور پر صرف صورت انسانی رکھتے تھے ورنہ ان کی بقیہ ہر چیز جنوں یا ملک سے مشابہ تھی اس لیے یہ جبار بالعموم ایسے بد خلق ہوتے تھے جن سے وحشی بھی شرمائیں۔

قرآن میں لفظ جبار کئی مقامات پر آیا ہے۔ ایک جگہ وہ اللہ تعالیٰ کا ایک نام بھی ہے۔ مفسرین اور علماء لغت نے قرآن میں بیان ہونے والے لفظ جبار کو ایک ہی لفظ سمجھا۔ لہذا اکثر نے تاویل کی راہ اختیار کی جو قطعاً درست نہیں۔ الجبار اور جبار نہ ایک لفظ ہیں نہ ہی کسی ایک مادے سے مشتق۔ اللہ تعالیٰ کا نام الجبار کسی اور مادے سے مشتق ہے اور جبار کسی اور مادے سے مثلاً المائدہ آیت: ۲۲ میں لفظ جبار چنانچہ قرآن میں متعدد جگہوں پر ان جباروں کے صفات کا ذکر کیا گیا ہے:

(۱) وبرا بوالدیہ ولم یکن جبلاً عصیاً (مریم: ۱۴)

ترجمہ: اور نیکی کرنے والا اپنے ماں باپ سے اور نہ تھا جبار نافرمان۔

(۲) وبرا بوالدتی ولم یجعلنی جباراً شقیاً (مریم: ۳۲)

ترجمہ: اور نیکی کرنے والا اپنی ماں سے اور نہیں بنایا مجھ کو جبار غیر صالح۔

(۳) ان تردید الا ان تكون جباراً فی الارض۔ (القصاص: ۱۹)

ترجمہ: تیرے ارادے بھی ہیں کہ تو زمین میں جبار ہو جائے۔

یہ فساد کی، بدخلق اور شقی ہوا کرتے تھے اور انسانوں کے دشمن تھے۔

قرآن کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت نوح کا طوفان من جملہ جن خوفناک مصیبتوں کے ازالے کے لیے آیا تھا ان میں یہ جبار بھی ایک تھے۔ اس لیے حضرت نوح کے بعد ان کی صرف تمثیل بیان ہوتی ہے مثلاً:

(۱) وعصوا رسلہ واتبعوا امر کل جبار عنید۔ (ہود: ۵۹)

ترجمہ: اور نافرمانی کی اپنے رسولوں کی اور چلے حکم پر تمام جبار دشمنوں کے

(۲) واستفتحوا وخاب کل جبار عنید۔ (ابراہیم: ۱۵)

ترجمہ: اور (سرکش) لگے فیصلہ مانگنے سو نامراد ہوئے تمام جبار دشمن۔

ممکن ہے حضرت نوح علیہ السلام کے طوفان میں چند جباروں کو چھوڑ کر بقیہ پوری جبار نسل کا اللہ تعالیٰ نے خاتمہ کر دیا ہو۔ اور چونکہ حضرت ہود علیہ السلام نوح علیہ السلام کے بعد مبعوث فرمائے گئے، اس لیے اس وقت بھی دو چار جبار روئے ارض پر پائے جاتے ہوں گے جن کا ذکر اس طرح قرآن میں کیا گیا۔ ایسا اس لیے بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ اس عہد کے بہت بعد بھی یعنی حضرت نوح کے طوفان کے تقریباً ۴ ہزار سالوں کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت میں بھی کم از کم ایک جبار ضرور یا ایک جبار قوم کے پائے جانے کی بات منقول ہے۔ قرآن کا بیان ہے:

قالوا یا موسیٰ ان فیہا قومما جبارین۔ (المائدہ: ۲۲)

ترجمہ: ان لوگوں نے کہا اے موسیٰ! بے شک اس جگہ جبار لوگ رہتے ہیں۔

اسی لیے ایسا لگتا ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام کا یہ کہنا کہ:

واذا بطشتم بطشتم جبارین۔ (الشعراء: ۱۳۰)

ترجمہ: اور جب تم دبو پڑتے ہو تو دبو پڑتے ہو ایسا جیسے جبار۔

تمثیل سے زیادہ حقیقت لگتا ہے۔

نفل:

ابلیس کے نساد کی دوسری ہیبت ناک کڑی روئے ارض پر نفلوں کی پیدائش ہے۔ قرآن اور دیگر صحائف کے مطالعے کے بعد اس عاجز کی رائے یہ ہے کہ یہ نفل دراصل ملک شیطین اور

آدمی عورتوں کے اختلاط کا نتیجہ تھے۔ جو قد و قامت میں انسانوں سے بہت بڑے اور قوی ہیکل مگر جباروں سے چھوٹے تھے۔ چونکہ ان میں جنوں کی آمیزش نہیں تھی اس لیے ان کی شکل بیشتر انسانی کمتر ملکی اور صلاحیت و قوت بیشتر ملکی اور کمتر انسانی تھی۔ قرآن نے صراحتاً ان کا صرف ایک بار ذکر کیا ہے اور وہ بھی ایک غیر معمولی صورت حال میں یعنی غزوہ بدر الکبریٰ کے موقع پر (جس پر تفصیلی بحث ان شاء اللہ عنقریب آئے گی) قرآن نے فرمایا:

يَسْتَلُونَكَ عَنِ الْانْفَالِ قُلِ الْانْفَالُ لِلَّهِ وَالرَّسُولِ (الانفال: ۱)

ترجمہ: (اے رسول) آپ سے (یہ یہودی) لوگ (بصورت طعنہ) سوال کرتے ہیں انفال کے بارے میں! (ہاں) آپ کہہ دیجئے کہ انفال اللہ اور رسول کے لیے (کام کرنے پر مجبور) ہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ طوفان نوح جن مصیبتوں کے ازالے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بھیجا تھا اس نے ان تغلوں کا پوری روئے زمین سے صفایا کر دیا۔ اور اب شاید ان میں کوئی موجود نہیں۔ جہاں تک سورہ انفال کی اس آیت میں انفال کا تذکرہ ہے تو اس میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے ایک بہت بڑے طعنے کا جواب دیا ہے جس کا ذکر ان شاء اللہ بعد میں آئے گا۔

إِلْيُو :

ابلیس کے فساد کی تیسری ہیبت ناک کڑی ایلیو ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ ایلو ملک شیاطین اور انسانی مردوں کے اختلاط کا نتیجہ تھیں۔ انہیں ایلیو، ایلیجو، الہ آلہ بھی کہتے ہیں۔ یہ قد و قامت میں خراب صورت، متناسب اور خوش شکل مردوں یا عورتوں سے مشابہ تھیں لیکن صفات میں ملکوں سے زیادہ مشابہت تھی۔

چنانچہ قرآن نے ان کا ذکر اس طرح کیا ہے:

افاصفكم ربكم بالبنين واتخذوا من الملكة اناثا انكم لتقولوا
قولا عظيما ولقد صرفنا في هذا القرآن ليعذكروا وما يزيدهم الا نفورا۔
قل لو كان مع الهة كما يقولون اذا لا بتغوا إلى ذي العرش سبيلا۔
(اسرئ: ۳۰-۳۲)

ترجمہ: کیا تم کو جن کر دیئے تمہارے رب نے بیٹے اور اپنے لیے کر لیا ملائکہ بیٹیاں۔ تم کہتے ہو ہماری بات اور پھیر پھیر کر سمجھایا ہم نے اس قرآن میں تاکہ وہ

سوچیں اور ان کو زیادہ ہوتا ہے بد کتا۔ اے رسول! کہہ دیجئے اگر ہوتے اس کے ساتھ
 اٹھ جیسا کہ دعویٰ کرتے ہیں تو نکالتے صاحب عرش کی طرف (اڑ کر جانے کی راہ)
 ابلیس نے اپنی ناکامی کے بعد جو باتیں اپنے قبیحین میں پھیلا رکھی تھیں اس آیت میں اسی پر
 ایک طنز سے بھرا ہوا تبصرہ ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ابلیس کی سازش کی یہ قسم بھی طوفان نوح میں کلیتہً
 ختم کر دی گئی۔

اس قسم کے فساد کے ذیل میں دو اور قسموں کی مخلوق کا ذکر آتا ہے لیکن یہ کہنا بہت مشکل
 ہے کہ یہ دونوں قسمیں اصلی نوعی قسمیں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کی رضا نے بنایا وہ نوع ہیں جو ابلیس
 کے مفسدانہ عمل کے سبب اللہ کی مشیت کے تحت بن گئیں۔ ان میں پہلی قسم ہے:

نفر:

یہ نفراء مخلوق ہے جس کا ذکر قرآن نے اس طرح فرمایا ہے:

(۱) واذ صرفنا اليك نفراً من الجن يستمعون القرآن فلما

حضروہ قالوا انصتوا فلما قضی ولوالی قومہم منذرین۔ (الاحقاف: ۲۹)

ترجمہ: اور جس وقت پھیر دیئے ہم نے اے رسول آپ کی جانب جن میں

سے نفروں کو تو وہ لگے قرآن کو دھیان سے سننے۔ اور جب سب اکٹھے ہو گئے (قرآن

سننے کی جگہ) تو بولے دھیان سے سنو (اور سمجھنے کی کوشش کرو)۔ پھر جب (قرآن کا

ان کو سنایا جاتا) ختم ہو گیا تو وہ لوٹے اپنی قوم کی طرف اور ان کو ڈرایا۔

(۲) قل اوحی الی انہ استمع نفر من الجن فقالوا انا سمعنا

قرآناً عجیباً۔ (الجن: ۱)

ترجمہ: (اے رسول آپ) کہہ دیجئے مجھ کو بتایا گیا کہ سن کر گئے ہیں کتنے ہی

نفر جنوں میں سے پھر انہوں نے جا کر (اپنے لوگوں سے) کہا ہم نے سنا ایک قرآن

عجیب۔

اسء جز کار جھان سورہ الجن آیت: ۸ کی وجہ سے یہ ہے کہ یہ نفرا ابلیس کے اسی عمل

سے پیدا ہونے والی نسلوں میں سے ایک نسل سے تھے۔

عفریت:

یہ وہ قسم ہے جس کا ذکر قرآن نے اس طرح کیا ہے:

قال عفريت من الجن انا آتیک به قبل ان تقوم من مقامک وانی
 علیہ ابقوی امین۔ (النمل: ۳۹)

ترجمہ: بولا عفريت جن میں سے، میں لائے دیتا ہوں وہ تجھ کو پہلے اس سے
 کہ تو اٹھے اپنی جگہ سے۔ اور اصلاً تو میں ہی طاقت والا ہوں۔

عفريت کے تعلق سے دو باتیں کہی جاسکتی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ یہ عفريت ایک مستقل
 نوع سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسری بات یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ عین ممکن ہے کہ یہ اس فساد
 نسل کا ایک فرد ہو جسے حضرت سلیمان علیہ السلام کا تابع فرمان بنادیا گیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے اسے
 دین اللہ اختیار کرنے اور حق کے ساتھ ہونے کی توفیق ملی ہو۔

(ب) زنا بین الإنسان :

فساد طبع کے ذیل میں ابلیس کے عظیم ترین فساد میں سے ایک بنیادی فساد یہ بھی ہے۔ زنا
 بین الانسان ایک اجمالی عنوان ہے۔ یہ ایک بڑے سازشی نظام کا نام ہے جس کے اندر سینکڑوں
 اقسام کے ذیلی نظام جاری کیے گئے ہیں اور جن کا احاطہ کرنا سر دست ناممکن ہے۔ ابلیس کا فساد پیدا
 کرنے کا یہ وہ نظام ہے جس کے ذریعہ انسانی جسم میں شقاوت داخل کی جاتی ہے۔ تاکہ بحیثیت
 مجموعی نطفہ آدم کی سعادت ختم ہو جائے۔ چنانچہ سارے جہاں کے لوگوں کے نطفے میں سعادت کا
 خاتمہ ابلیس کے نقطہ نظر میں دراصل آدم و حوا کا خاتمہ ہے جو بالآخر منج ہو گا آدم کی ناکامی اور ابلیس
 کی کامیابی پر۔

اس کے صرف چند خاص بڑے اقسام کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے:

(۱) نطفے کے ذریعہ انسانی سعادت کا ختم کیا جانا:

اس کی بنیادی صورتیں ہیں:

(۱) صالح مرد کا نطفہ غیر صالحہ عورت کے رحم میں جانا۔

(۲) غیر صالح مرد کا نطفہ صالحہ عورت کے رحم میں جانا۔

(۳) غیر صالح مرد کا نطفہ غیر صالحہ عورت کے رحم میں جانا۔

(۴) صالح مرد کا نطفہ صالحہ عورت کے رحم میں ممنوع طریقے سے جانا۔

(۵) شیطان انس (غیر قابیلی) کا نطفہ صالحہ یا غیر صالحہ عورت کے رحم میں جانا۔

(۶) صالح یا غیر صالح مرد کا نطفہ شیطانہ انس (غیر قابیلی) کے رحم میں جانا۔

(۷) شیطان انس (قابیلی) کا نطفہ صالح یا غیر صالح عورت کے رحم میں جانا۔

(۸) صالح یا غیر صالح مرد کا نطفہ شیطانہ انس (قابیلی) کے رحم میں جانا۔

یہ ایک بہت تفصیلی بحث کا موضوع ہے جس کی یہاں قطعاً منجائش نہیں لیکن اس کے بعض فروع آئندہ متعدد مواقع پر زیر بحث آئیں گے ان شاء اللہ۔ اس تعلق سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی حجۃ اللہ البالغہ میں المبحث الرابع دیکھی جاسکتی ہے۔

اس فساد کی کترین شکل یہ ہے کہ کوئی شخص جو صالح یا صالحہ ہی کیوں نہ ہو ذرا غفلت میں پڑ جائے تو شیطان اس پر حملہ آور ہو کر اس کے اندر شقاوت کے فساد پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی مثل ایسی ہے جیسے کسی بہت محتاط آدمی کی ذرا سی غفلت یا کسی مخصوص حالت میں اتفاقاً پڑ جانے سے اسے کسی بھی بیماری کا Infection ہو جاتا ہے۔ اور بعض Infection تو نہایت خطرناک ہوتے ہیں جو نہایت معمولی غفلت سے بھی ہو سکتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح کوئی صالح یا صالحہ اگر شیطان کے تعلق سے ذرا بھی غافل ہو جائے تو اسے شیطان فوراً ضرب لگا دیتا ہے۔ یہ ضرب طویل امدت ضرب کی صورت بھی اختیار کر سکتی ہے۔ مثلاً کوئی ایسی شقاوت بھی پیدا ہو سکتی ہے جو نسل بعد نسل کسی کی سعادت کو متاثر کر دے۔

خیر و شر کی اس کائناتی جنگ کے عظیم قائدین اہل حق یعنی حضرات انبیاء کرام نے یوں تو تمام ہی انسانوں میں سعادت کی ترقی اور شقاوت کے خاتمے کی کوشش کی ہے لیکن انہوں نے بطور خاص اس بات پر نظر رکھی ہے اور اس کی پوری پوری حفاظت کی ہے کہ ابلیس اپنی کائناتی سازش کے تحت ان سلسلوں کو متاثر نہ کر سکے جو خیر و شر کی اس جنگ میں مستقبل میں اللہ کی فوج کی قیادت کرنے والے ہیں۔

اس عاجز کا خیال ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ نصیحت جس کا ذکر مروج الذہب جلد اول میں المسعودی نے کیا ہے اسی سلسلے کی کڑی معلوم ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کنعان سے حجاز سفر کرتے ہیں تاکہ حضرت ہاجرہ اور اسمعیل علیہما السلام کی خیر و عافیت معلوم کریں۔ آپ جب مکہ پہنچتے ہیں تو حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمعیل بکریاں لے کر صحرا میں گئے ہوتے ہیں چنانچہ صرف حضرت اسمعیل کی زوجہ سے ملاقات ہوتی ہے۔ آپ انہیں

یہ پیغام دے کر لوٹ آتے ہیں کہ جب اسمعیل آئیں تو کہنا کہ ایک ایسا شخص آیا تھا اور اس نے کہا ہے کہ گھر کا دروازہ بدل دو۔ حضرت اسمعیل اس پیغام کو سنتے ہی سمجھ گئے کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے اور انہوں نے اس زوجہ کو فوراً طلاق دے دی۔ چند سالوں کے بعد حضرت ابراہیم اپنے وصال سے تھوڑا قبل پھر حضرت اسمعیل سے ملنے مکہ پہنچے۔ اتفاقاً اس بار بھی حضرت اسمعیل موجود نہ تھے لیکن ان کی دوسری زوجہ نے بغض ہو کر انہیں اترنے اور تھوڑی دیر ٹھہرنے پر راضی کر لیا۔ تھوڑی دیر بعد نب حضرت روانہ ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ اسمعیل آئے تو ان سے کہنا کہ ایک شخص آیا تھا اس نے کہا ہے کہ دروازے کی حفاظت کرو۔ حضرت اسمعیل آئے تو انہوں نے سمجھ لیا کہ یہ حضرت ابراہیم ہی ہو سکتے ہیں اور ان کی تاکید ہے کہ یہ زوجہ بڑی بابرکت ہیں ان کی حفاظت کی جائے۔ چنانچہ یہ حفاظت خود اللہ رب العزت کی طرف سے ان تمام نفوس قدسیہ کی ہمیشہ ہوئی ہے جن سے اللہ تعالیٰ کو اس معرکے میں کام لینا ہے اور شیطان نے ہمیشہ ایسے نفوس کی سعادت کو مجروح کرنے کی کوشش کی ہے۔ آنحضور ﷺ کے والد عبد اللہ اور ان کے دادا عبد المطلب اور ان کے والد ہاشم سب کو تباہ کرنے کی ایسی ہی کوششیں متعدد بار ہوئیں اور اللہ تعالیٰ نے سب کی حفاظت فرمائی۔ یہی مطلب ہے اس حدیث کا جس میں فرمایا گیا ہے:

ثم لم يزل ينتقل من طاهر الى ان ولدته آمنة من عبد الله بن

عبد المطلب (رواه الامام ابن الجوزي في كتاب الوفاء بحواله مرقاة)

اس طرح یہ عاجزان واقعات کو بھی اسی کائناتی معرکہ کے تعلق سے انتہائی احتیاط کی کارروائی سمجھتا ہے جن میں آنحضور ﷺ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر دو حکم لگائے تھے اور حضرت علی نے انہیں احسن طریقے سے پورا فرمایا:

(۱) آپ ﷺ نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی حیات میں دوسری شادی سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو روک دیا۔

(۲) نب حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کی بہن سے جو ابو جہل — عمرو بن ہشام کی بیٹی تھیں شادی کرنا چاہی تو آپ نے اسے بھی روک دیا۔ یہ باب نہایت پیچیدہ ہے۔

یہ عاجزان واقعہ کو بھی اسی سلسلے کی کڑی سمجھتا ہے جس میں آنحضور ﷺ نے حضرت

رقیہ اور پھر حضرت ام کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی وفات پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے تعلق سے فرمایا تھا:

لو كانت لی بنت اخری لزوجتها ایاہ. (بحوالہ مرقاۃ)
ترجمہ: اگر میری کوئی اور بیٹی ہوتی تو میں یقیناً اسے بھی اس شخص سے بیاہ دیتا۔

نصرت الکئل :

حضرات آدم و حوا کے زمین پر تشریف لانے کے بعد یہاں جو معرکہ خیر و شر کا دور دوبارہ شروع ہوا اس میں ایسے بھی مواقع آئے جب اللہ تعالیٰ کی سنت تخلیق سنت تکوین سے متصادم ہو گئی۔ ایسے لمحات نہ صرف نسل آدم کے لیے بلکہ پوری قوت خیر کے لیے سنگین ترین بحرانی (Critical) لمحات ہو گئے۔ یہ سارے بحرانی لمحات وہ مواقع تھے جب ابلیس نے اپنی طاقت اور مکر کا ایسا استعمال کیا اور اسکی ایسی تدبیریں ہوئیں اور اللہ تعالیٰ کی سنت تخلیق کی صورت ایسی ہو گئی کہ اگر اس کو جاری رہ جانے کا موقع ملے تو خود اللہ تعالیٰ کی رضا مجروح ہو جائے۔ یہ ابلیس کی وہ عظیم اور عجیب و غریب تدبیر تھی جس میں وہ کئی بار اس طرح کامیاب ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کا خود اللہ کی رضا سے ٹکراؤ ہو گیا۔ یہی وہ مواقع ہیں، جب اللہ تعالیٰ نے اپنی وہ سنت جاری فرمائی جس کے تحت ایسے مواقع پر سنت تخلیق پر سنت تکوین کا اجراء ہو گیا۔ تاریخ انسانی میں ایسے مواقع کئی بار آئے مگر اس کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ یہاں وہ خصوصی قسم زیر بحث ہے جس کا تعلق اس شے سے ہے جسے عالم اشیاء میں نفس، عالم عصر میں روح اور عالم بریۃ میں نفس مطمئنہ کہا جاتا ہے۔ یعنی ایسے مواقع جب ابلیس نے کوئی ایسی صورت بنا دی کہ ایک ایسا شخص جس کی حیات کا باقی رہنا اللہ کی رضا ہو لیکن اسے شیطان نے ایسی صورت میں ڈال دیا کہ اب اس پر اللہ تعالیٰ کی سنت تخلیق کا جوں ہی اجراء ہوتا وہ اس کی حیات کو ختم کر دیتا اور عالم امکان میں اس سے بچنے کی کوئی صورت نہ رہ گئی ہو۔ یہ بات واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ کی اس دنیا میں رائج سنت تخلیق عام حالات کیا خاص الخاص حالات میں بھی نہیں بدلتی۔ عوام میں جو یہ غلط فہمی رائج ہے کہ ہر شخص جس کو لوگ بزرگ سمجھتے ہیں — اور ایسے لوگوں کی تعداد کسی ایک وقت میں ایک ملک میں ہزاروں سے متجاوز ہوتی ہے — کی خواہش پر اللہ تعالیٰ کی سنت تخلیق بدل جاتی ہے — محض ایک دھوکہ اور شیطان کا فریب ہے۔ چنانچہ تاریخ انسانی میں ایسے مواقع صرف ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں جب اس

کائنات میں اس قسم کا غیر معمولی واقعہ وقوع پذیر ہوا ہو۔

اللہ تعالیٰ کی یہ سنت سنت الکفل کہلاتی ہے۔ چونکہ سنت الکفل ایک حاوی اور محیط اصطلاح ہے اس لیے اس حصے کا عنوان نصرت الکفل تجویز کیا گیا ہے۔ اس سنت کے تحت اللہ تعالیٰ نے تین سنتیں جاری فرمائیں۔ ان میں سے ہر ایک سنت کا درجہ غیر معمولی، خاص الخاص اور عظیم النظیر ہے۔ لیکن تینوں سنتوں کے درجات اپنے آپ میں الگ الگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی یہ تین سنتیں ہیں:

(۱) ذبیح اللہ

(۲) ذوالکفل اور

(۳) ذوالقرنین

ان میں سب سے پہلی سنت یعنی سنت ذبیح اللہ سب سے اعلیٰ و ارفع ہے اور شاید تاریخ انسانیت میں نہیں بلکہ تاریخ کائنات خلق میں اس کی صرف ایک ہی مثال ہے۔

دوسری اعلیٰ و ارفع سنت لیکن پہلے سے کم درجے کی سنت ذوالقرنین معلوم ہوتی ہے۔ قرآن کے مطالعے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سنت سنت ذبیح اللہ سے کم عظیم النظیر ہے یعنی تاریخ کائنات میں اس کی کم از کم دو مثالیں معلوم ہیں۔

تیسری اعلیٰ و ارفع سنت جو دراصل نام اور اپنی صفات کے اعتبار سے سب میں مشترک ہوتے ہوئے اپنی جگہ ایک مستقل سنت ہے۔ وہ سنت ذوالکفل ہے۔ اس سنت کا اجراء تاریخ کائنات میں کم از کم تین بار ہوا۔

(۱) ذبیح اللہ :

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت کائنات خلق کی سنتوں میں سب سے اعلیٰ و ارفع سنت ہے۔ اس کا تفصیلی بیان تو ان شاء اللہ اپنے موقع سے ہو گا۔ یہاں اس کا شمار صرف اس لیے کیا گیا ہے کہ یہ بھی سنت بنیادی طور پر سنت ذوالکفل سے تعلق رکھتی ہے اور اس سے افہام میں ان شاء اللہ آسانی ہو گی۔

(۲) ذوالکفل :

جیسا کہ ابتداء کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی اس سنت کا تعلق اس شے سے ہے جس کا نام عالم اشیاء

میں نفس، عالم نضر میں روح اور عالم بریہ میں نفس مطمئنہ ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی عرض کی گئی کہ ابلیس نے اپنی طاقت اور مکر کا کئی بار ایسا استعمال کیا کہ روئے زمین پر اہل حق اور نظام ربانی بحرانی حالت کے شکار ہو گئے۔ چنانچہ اس تدبیر سے اہل حق کو اس حالت میں ڈال دیا گیا کہ یہ گروہ بجائے شیطان سے ٹکرانے کے خود اللہ تعالیٰ کی سنت تخلیق سے متصادم حالت میں آمنے سامنے آ گیا۔ اس بحرانی کیفیت میں بے حد انتہائی صورت بحرانی وہ تھی جب حق کسی سبب سے صرف ایک شخص کی ذات کی حد تک سمٹ آیا ہو اور اس کا ختم ہو جانے کا وقت پورے گروہ حق کا خاتمہ ہو اور ٹھیک اس گھڑی وہ شخص ایسی حالت میں ڈال دیا جائے کہ ایک طرف اللہ کی تخلیقی سنت کا اجراء ہونا لازمی ہو۔ دوسری طرف اس تخلیقی سنت کو نہ تو روکا جاسکتا ہو نہ ہی کسی دوسری تخلیقی سنت سے بدلا جاسکتا ہو۔ نہ اس سے ارار اختیار کیا جاسکتا ہو۔ اور ایسی حالت میں اس کا اندیشہ صد فی صد یقینی ہو جائے کہ اگر اس سنت کا اجراء ہوا تو وہ شخص جو اس وقت اپنے آپ میں حق کا واحد مظہر ہے ختم ہو جائے گا تو یہ وہ بحرانی حالت ہے جب اس سنت کا اجراء ہوتا ہے۔

اس سنت کے کیا معنی ہیں؟ اور اس کی کیا صورتیں ہیں؟

’کفل‘ کے معنی ہیں دو گنا۔ دہرا، دوسرا، زیادہ طاقت ور۔ اور ان تمام معانی کا اس سنت پر

انتہا ہوتا ہے۔

جب کسی شخص کا مرنا یقینی ہو جائے یعنی اس کے آس پاس جاری سنت تخلیق میں اس کا زندہ رہنا محال ہو اور اس شخص کا مرنا اللہ کی رضا کے خلاف ہو۔ تو اللہ تعالیٰ اس شخص کی زندگی کو اس سنت کے تحت کبھی دو گنا کر دیتا ہے کبھی دہرا کر دیتا ہے، کبھی زیادہ طاقت ور کر دیتا ہے اور کبھی دوسرا کر دیتا ہے۔

سنتوں کی تبدیلی پر غور کرنے سے پہلے اللہ کی سنتوں — کے تعلق سے اس کی اصولی سنت کا سمجھنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(۱) فَلَئِنْ تَجَدَّلْتُمْ لِلَّهِ تَبْدِيلًا. (فاطر: ۲۳)

ترجمہ: سو تو نہ پائے گا اللہ کا دستور بدلتا۔

(۲) وَلَنْ تَجْدَ لِلَّهِ تَحْوِيلًا. (فاطر: ۲۳)

ترجمہ: اور نہ پائے گا اللہ کا دستور ملتا۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دستور کو نہیں بدلتا۔ اور اگر کوئی چاہے کہ اللہ کے دستور کو بدل دے تو یہ ممکن نہیں۔ لہذا ایسے تمام مواقع کی حقیقت جہاں محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت بدل دی کچھ اور ہی ہے۔

سخت سے سخت بحران کے واقع ہونے پر بھی اللہ تعالیٰ اپنی سنت کو نہیں بدلتا۔ اور اگر ایسا بار بار کرتا تو اللہ کے اتنے انبیاء — جن میں سے کسی ایک کا خون بھی پوری روئے زمین پر بھاری ہے۔ قتل نہ ہوتے — اور نہ کوئی دوسرا اللہ کی سنت کو بدل سکتا ہے خواہ وہ انبیاء ہوں یا — فرعون و عاد و ثمود — بلکہ ایسے مواقع پر اللہ تعالیٰ دراصل اپنی ارتسالی سنت پر ارتجاعی سنت کو جاری فرمادیتا ہے۔ یعنی کل اس نے تکوین کی توسیع تخلیق سے کی آج وہ تخلیق کی ترجیع تکوین سے کرنے پر قادر ہے۔ لہذا ایسے تمام مواقع پر اللہ تعالیٰ تخلیق کی ترجیع تکوین سے کر دیتا ہے۔

چنانچہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نردو نے آگ میں ڈالا تو جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ 'قال یا نار کدنی بردا و سلاما علی ابراہیم' اللہ نے کہا: اے آگ تو ابراہیم پر ٹھنڈی اور سلامتی ہو جا کا مطلب یہ ہے کہ وہ آگ بجھ گئی اور ٹھنڈی ہو گئی اور اس نے ابراہیم کو نہیں جلایا اور آپ بچ گئے — وہ اس کا مطلب درست نہیں سمجھتے۔ اتنی بڑی دہکتی ہوئی آگ نہ بجھائی گئی نہ بجھی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کو اس طرح آگ میں ڈالا گیا تھا جیسے آج کسی آدمی کو کسی بڑے اسٹیل مل کے دیو ہیکل فرنس (Furnace) میں ڈال دیا جائے — لہذا جب حضرت ابراہیم کو ڈال دیا گیا تو یہ ہوا کہ آگ اسی طرح دہکتی رہی اور ڈالنے والے ایک ایک فرد کو اس کا یقین ہو گیا کہ حضرت ابراہیم کا نام و نشان مٹ چکا ہو گا اور وہ مطمئن ہو گئے کہ انہوں نے اس مظہر حق کا بالآخر خاتمہ کر دیا جب کہ حقیقت یہ تھی کہ آگ کی سنت پلٹ گئی۔ یعنی وہ آگ جس کی سنت تخلیق تھی (۱) گرم ہونا اور (۲) طبعی اور کیمیائی طور پر جلا کر اس شے کی حقیقت کو یعنی کسی کی شکل، صورت حتیٰ کہ طبعی اور کیمیائی خواص تک کو ختم کر دینا وہ سنت نہ صرف بدل گئی بلکہ الٹی (Reverse) ہو گئی۔ حکم کے بعد آگ کی سنت ٹھنڈک پہنچانا اور (۲) ختم ہونے والی چیز کو پہنچانا اور محفوظ ہی رکھنا نہیں بلکہ ارتقاء اور تکمیل کے اعلیٰ ترین مقام — مقام سلام پر پہنچانا ہو گئی۔

چنانچہ 'کفل' کی سنت کا اجراء دراصل یہ ہے کہ جب عالم اشیاء میں جاری سنت — نفس کو ختم کرنے کی حالت میں آجائے تو اس نفس پر دوسری سنت کا اجراء کر دیا جانا جو نفس کو اس تخلیقی

سنت کے دائرے، سے اوپر کر دے۔ واضح ہو کہ نفس کے تعلق سے کم از کم دو سنتیں عمومی طور پر رائج ہیں جن کی تشریح اس سے پہلے کی جا چکی ہے:

(۱) عالم عصر سے عالم اشیاء میں روح کی منتقلی یعنی روح کو نفس قرار پانے کے لیے تناسل خواہ اس کی کوئی شکل ہو ضروری قرار دی گئی ہے۔

(۲) عالم اشیاء سے عالم عصر کی واپسی یقینی ہے اور اس واپسی کا واحد راستہ موت ہے۔ چنانچہ اسی لیے کہا گیا کہ کل نفس ذائقۃ الموت۔ (ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے) ہر وہ شے جو عالم عصر سے عالم اشیاء میں آئی ہے وہ واپس جائے گی اور جانے کا صرف ایک راستہ ہے یعنی موت۔

اب اگر ایسی صورت ہو جائے کہ ابلیس کی تدبیروں سے کسی ذات پر جس کی حیات کا باقی رہنا رضائے الہی ہو۔۔۔ موت کا طاری ہونا یقینی ہو جائے اور اس سے بچنے کی صورت نہ رہ گئی ہو تو اس بحرانی حالت میں اللہ تعالیٰ کی ایک سنت کار فرما ہو جاتی ہے جس کے تحت کئی باتیں واقع ہو جاتی ہیں:

(۱) یا تو اس شخص پر ایک ثانیہ کے لیے عالم اشیاء پر موت واقع ہو جاتی ہے لیکن دوسرے ثانیہ وہ عالم عصر میں پہنچ کر پھر عالم اشیاء میں واپس آ جاتا ہے اور اس حالت میں عالم اشیاء میں کام کرتے ہوئے عالم عصر میں ہوتا ہے۔

(۲) یا تو اس شخص پر عالم اشیاء پر موت واقع ہونے کی سنت اس طرح اٹھالی جاتی ہے کہ اسے عالم اشیاء میں ہوتے ہوئے عالم عصر بلکہ عالم بریۃ میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ اور وہ عالم اشیاء میں ہوتے ہوئے دراصل عالم بریۃ میں ہوتا ہے۔

(۳) یا تو اس شخص پر عالم اشیاء میں موت واقع ہونے کی سنت اس طرح تبدیل کی جاتی ہے کہ اسے عالم اشیاء میں ہوتے ہوئے عالم عصر بلکہ عالم بریۃ میں منتقل کر دیا جاتا ہے اور اس کی عالم اشیاء میں واقع ہونے والی موت واقع تو ہو جاتی ہے مگر اس کا ظہور اصلی طور پر واقع ہونے کے کئی سالوں بلکہ ہزاروں سالوں کے بعد ہوتا ہے۔

اس اعتبار سے نصرت کفل کے بعد کوئی ذات زیادہ طاقت ور دو گنی یا دوہری یا دوسری نفس کی حامل ہو جاتی ہے۔ نصرت کفل ایک حاوی نصرت ہے اس لیے عمومی طور پر ذبیح اللہ، ذوالکفل اور ذوالقرنین بھی نصرت کفل سے فیض یاب ہیں۔ لیکن جب مخصوص اعتبار سے ذکر کیا جائے گا

تو اس کا اطلاق صرف ان اشخاص پر ہو گا جو ذوالکفل قرار دیے گئے۔

چنانچہ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ انسانی میں صرف دو اشخاص ہی ایسے گزرے ہیں جنہیں ذوالکفل کہا گیا ہے۔ اور ان دونوں کے نام المسیح ہیں۔

(۱) پہلے المسیح حضرت ادریس ہیں جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ حضرت نوح کے اسلاف میں سے تھے۔

(۲) دوسرے المسیح حضرت الیاس، آل یاسین، آل یاسین ہیں جو حضرت یعقوب کے اخلاف میں سے تھے۔

چنانچہ قرآن نے نصرت کفل کی حاوی شکل اور بطور خاص نصرت کفل سے متصف خصوصی قسم کا حوالہ اس طرح دیا ہے:

(۱) واسمعیل وادریس وذوالکفل کل من الصابرين وادخلناهم فی رحمتنا انهم من الصالحین۔ (الانبیاء: ۸۵-۸۶)

ترجمہ: اور اسمعیل اور ادریس اور ذوالکفل یہ سب صبر والوں میں سے ہیں۔ اور ہم نے ان کو اپنی رحمت میں داخل کیا ہے اور یہ سب صالحین میں سے ہیں۔

(۲) واذکر اسمعیل والیسع وذاکفل وکل من الاخیار۔ (ص: ۳۸)

ترجمہ: اور ذکر کرو اسمعیل اور الیسع اور ذوالکفل کا اور وہ سب اخیار میں سے تھے۔

چنانچہ عمومی قسم میں حضرت اسمعیل بھی اس قسم میں داخل ہیں جبکہ خصوصی طور پر صرف حضرت الیسع سلف حضرت نوح اور حضرت الیسع خلف حضرت یعقوب اس میں داخل ہیں۔

اس طرح قرآن دراصل خصوصی طور پر دو ذوالکفل کا ذکر کرتا ہے (۱) ادریس ذوالکفل اور (۲) الیسع ذوالکفل۔

چونکہ یہاں اس کی تقریر پر کوئی بحث مقصود نہیں اس لیے اس نکتے سے بھی سر دست تعارض نہیں کیا جا رہا ہے کہ الانبیاء آیت: ۸۵ میں ادریس اور ذوالکفل کے درمیان جو 'و' ہے اور ص آیت: ۳۸ میں الیسع اور ذوالکفل کے درمیان جو 'و' ہے اس کا کیا مفہوم ہے۔ جس سے کسی کو شبہ ہو سکتا ہے کہ ذوالکفل کوئی مستقل شخص ہیں اور اس طرح ان آیتوں میں دراصل تین اشخاص کا ذکر کیا گیا ہے۔ (اس تعلق سے تقریری بحث ان شاء اللہ عالم اسلام کی منصبی و مقصدی

صورت حال کے سلسلے میں کی جائے گی)

(۳) ذوالقرنین :

ذوالقرنین بھی ذوالکفل کی طرح نام نہیں بلکہ لقب ہے۔ اپنے عموم کے اعتبار سے یہ قسم بھی نصرت کفل میں ہی شمار ہوگی لیکن خصوصیت کے لحاظ سے یہ اس سے مختلف ہے۔ کفل کے اعتبار سے اشتراک ہوتے ہوئے بھی دو لحاظ سے اس میں فرق ہے:

(۱) حکمت عملی (Strategy)

(۲) ترسیل (Logistics)

اس عاجز کی تحقیق کے مطابق قرن کے تین معانی ہیں اور تینوں ہی یہاں منطبق ہوتے ہیں۔ قرن کے وہ تین معانی درج ذیل ہیں:

(۱) قرن : زمانہ، عرصہ، عمر، مدت کار، مدت عمل

(۲) قرن : ایسی چیز جو اصل میں ملی ہوئی اور ایک ہو اور جس کا ظہور دو الگ الگ حصوں میں یا شکلوں میں ہوا ہو مثلاً سینک۔

(۳) قرن : طاقت، قوت، جبر، اسلحہ

اس طرح ذوالقرنین کے معانی ہیں:

(۱) دو زمانہ، دو عرصہ، دو عمر، دو مدت کار، دو مدت عمل والا۔

(۲) ایسے دو ظہور والا جن کی حقیقت ایک ہو۔

(۳) دو طاقتوں، دو قوتوں، دو جبروں، دو اسلحوں کا مالک

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ نزاکت کے اعتبار سے یہ وہی صورت حال ہے جو اس سے قبل ذوالکفل کے ذیل میں بیان کی گئی ہے۔ تاہم یہاں اس سے چند باتیں مختلف پائی جاتی ہیں۔ وہ مزید نزاکتیں جو یہاں پائی جاتی ہیں ان کا تعلق کچھ ابلیس کی حکمت عملی سے ہے اور کچھ اس کی ترسیل (Logistic Criticality) سے۔

قرآن میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی نازک صورت حال تقدیر انسانی میں کم از کم دو بار پیدا ہو سکتی ہے۔ جن میں ایک بار ہو چکی ہے اور ایک بار ہونے والی ہے۔ یہ اپنی نوعیت

کے اعتبار سے اتنی غیر معمولی صورت حال ہے جس کا اندازہ کرنا طاقت بشری سے عموماً باہر ہے۔ اس کے تین شعبے ہیں:

- (۱) کسی مظہر حق ذات کے تعلق سے ایسی نازک صورت حال کا واقع ہونا جب اللہ کی سنت تخلیق کا اجراء اسے موت دینے کے درپے ہو اور اللہ کی رضا اس کی بقا چاہتی ہو۔
- (۲) ابلیس اہل حق کے خلاف ایسی حکمت عملی کا مظاہرہ کرے کہ زمین کی عمومی سنت بشری اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہو۔

(۳) ابلیس اہل حق کے خلاف ایسی حکمت عملی کا مظاہرہ کرے کہ طاقت بشری میں اس کے مقابلے کی استعداد پیدا کرنے کی صلاحیت معدوم ہو جائے اور کفایت کرنے والی اضافی صلاحیت کی درآمد واحد ممکنہ صورت کے اعتبار سے ناگزیر ہو جائے۔

یہ وہ نازک ترین حالت ہے جب اللہ تعالیٰ اس سے رنجی نزاکت کے مقابلے کے لیے اہل حق کی ذوالقرنین سے مدد فرماتا ہے۔ اس طرح بھیجے جانے والے ذوالقرنین تین صفات کے حامل ہوتے ہیں:

- (۱) ان پر دو زمانے والا ہونے کا اطلاق ہوتا ہے۔
 - (۲) ان کے دونوں ظہور کی اندرونی حقیقت ایک ہوتی ہے۔
 - (۳) ان کے پاس دو قوت یا دو قسم کے اسلحے ہوتے ہیں۔ ایک بشری اور ایک غیر بشری۔
- جیسا کہ عرض کیا گیا کہ ایسی صورت حال اب تک صرف ایک بار پیدا ہوئی جب زمین پر اپنی تخلیق کے بعد شاید پہلی بار یا جوج و ماجوج کے ظہور کا سلسلہ شروع ہوا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے پہلی بار زمین پر گردہ حق کی مدد ایک ذوالقرنین سے کی۔ اس عاجز کا اندازہ ہے کہ یہ زمانہ حضرت نوح سے قبل یا فوراً قبل کا زمانہ تھا یا خود حضرت نوح کے ساتھ ساتھ ہی یہ زمانہ آیا۔ ان شاء اللہ ان دونوں ذوالقرنین کا ذکر اپنے اپنے محل پر آئے گا۔

ان توضیحات کے بعد ہم پھر اس سلسلہ بحث کو شروع کرتے ہیں۔ جو معرکہ خیر و شر کے مرحلہ چہارم سے متعلق تھا اور اس ذیل میں ہم حضرت ادریس علیہ السلام کا ذکر کر رہے تھے۔

حضرت الیسع علیہ السلام کا آسمان پر اٹھالیا جانا اور ادریس بنادیا جانا دراصل ایک نازک صورت حال سے مظہر حق کو باہر نکالنا تھا۔ اس نازک حالت کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ یہ ایک

بچاؤ کی کارروائی (Rescue Operation) تھی۔ اور غالباً اسی صورت حال سے مشابہت رکھتی ہے جس صورت حال میں حضرت عیسیٰ علی نبینا علیہ السلام ڈال دیئے گئے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی بچالیا تھا۔ جس کا ذکر قرآن نے اس طرح کیا ہے:

(۱) اذ قال الله يعيسىٰ انى متوفيك ورافعك الى ومطهرك من الذين كفروا. وجاعل الذين اتبعوك فوق الذين كفروا الى يوم القيامة. (آل عمران: ۵۵)

ترجمہ: جس وقت کہ اللہ نے اے عیسیٰ! یقین کرو میں تم کو اپنی قدرت کاملہ کا مورد اور اپنی جانب اٹھایا ہوا اور انکار کرنے والوں سے پاک کیا ہوا بنادوں گا۔ اور تجھ کو ایسا بنادوں گا کہ جو تمہاری پیروی کرنے والے ہیں وہ بالآخر قیامت تک غالب آجائیں گے ان پر جو تمہارا انکار کرتے ہیں۔

(۲) وقولهم انا قتلنا المسيح عيسىٰ ابن مريم رسول الله وما قتلوه ما صلبوه ولكن شبه لهم وان الذين اختلفوا فيه لفي شك منه ما لهم به من علم الا اتباع الظن وما قتلوه يقينا. بل رفعه الله اليه وكان الله عزيزا حكيما. (النساء: ۱۵۷-۱۵۸)

ترجمہ: اور جہاں تک ان کے دعویٰ کی بات ہے! بے شک ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ کو قتل کر دیا تو نہ وہ انہیں قتل کر پائے نہ انہیں صلیب دے پائے۔ بلکہ انہیں شبہ میں ڈالنے کی صورت بنادی گئی۔ اور دوسری طرف وہ لوگ جو اس تعلق سے اختلاف میں پڑ گئے تو انہیں بھی اس میں شک ہے۔ کسی کے پاس علم نہیں صرف قیاس ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ بالیقین انہیں قتل نہیں کر سکے۔ بلکہ ان کو اللہ نے اپنی جانب اٹھالیا اور اللہ ہمیشہ سے زبردست اور حکیم ہے۔

اس طرح ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ معرکہ خیر و شر کا مرحلہ چہارم بھی ایک بحران اور تباہی (Disaster & Crisis) پر منتج ہوا۔ جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے:

واذکر فی الكتاب ادریس انه کان صدیقا نبیا ورفعنہ مکانا علیا. (مریم: ۵۶-۵۷)

ترجمہ: اور ذکر کرو اور لیس کی مہم کے بارے میں بے شک وہ تھا اپنی حقیقت کے اعتبار سے صدیق اور نبی۔ اور ہم نے اس کو اونچا کر دیا مکان کے اعتبار سے اور علو کے اعتبار سے۔

پہلا ذوالقرنین : 6000-7600 قبل مسیح

لیکن ایسا لگتا ہے کہ دو ہزار سالوں کے اندر اندر ہی اللہ تعالیٰ نے ایک بار پھر حضرت اوریس کو جنہیں پہلے مرحلے میں ذوالکفل بنایا گیا تھا۔ ذوالقرنین کے اعتبار سے دوبارہ مبعوث فرمادیا۔ یہ بعثت چند دنوں چند ہفتوں، چند مہینوں یا چند سالوں کے لیے بھی ہو سکتی ہے۔ اور ایسا لگتا ہے کہ چند سالوں کے لیے ہی ہوئی ہوگی۔ جیسا کہ اس پر روشنی ڈالی جا چکی ہے کہ روئے ارض پر ذوالقرنین کی بعثت کب اور کیوں ہوتی ہے؟ وہ کیسی نازک صورت حال ہوتی ہے جب اللہ تعالیٰ اہل حق کو کسی ذوالقرنین سے مدد دیتا ہے؟ یہ نزاکت تاریخ انسانی میں عدیم المثال ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کا ذکر کرتے ہوئے قرآن نے بیان فرمایا:

يَسْأَلُونَكَ عَنِ ذِي الْقُرْنَيْنِ. قُلْ سَأَتْلُوا عَلَيْكُمْ مِنْهُ ذِكْرًا. اَنَا مَكْشَلُهُمْ فِي الْاَرْضِ وَآتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبِيلًا. (الكهف : ۸۳-۸۴)
ترجمہ: اے رسول! وہ (یہودی) لوگ آپ سے ذوالقرنین کے متعلق پوچھتے ہیں (تاکہ آپ کا امتحان لیں اس لیے کہ ان یہودیوں کا خیال ہے کہ یہودی علماء کے علاوہ ذوالقرنین کے بارے میں روئے زمین پر کوئی نہیں جانتا اور اگر آپ اصلی نبی نہیں تو آپ کو ذوالقرنین کا علم نہ ہو گا آپ کہہ دیجئے! ٹھہرو فوراً یہی نہیں بلکہ ساری تفصیل بتا دیتا ہوں۔ بے شک ہم نے ذوالقرنین کو زمین پر تمکن بخشا اور ہر شے کو قابو میں کر لینے کا اختیار دے دیا۔

اس مقام پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا طوفان نوح کے بعد کسی ذوالقرنین کی بعثت نہیں ہو سکتی؟ بلاشبہ کئی ایسے امور ہیں جن کی بنیاد پر بعض اہل علم اس طرف بھی گئے ہیں۔
پہنانچہ اہل علم کے مابین جن دو زمانوں میں کسی ذوالقرنین کی بعثت کا امکان پایا جاتا ہے وہ ہیں:

(۱) عہد حضرت ابراہیم علیہ السلام — اور دوسرا

(۲) عہد حضرت یعقوب تا حضرت یحییٰ علیہما السلام۔

لیکن عاجز کی ترجیح یہی ہے کہ اگر کوئی زمانہ ذوالقرنین کی بعثت کا ہو سکتا ہے تو وہ حضرت نوح علیہ السلام سے بہت قبل یا معا قبل یا زیادہ سے زیادہ ساتھ ساتھ کا زمانہ ہو سکتا ہے۔ تاہم یہ

عاجز حضرت ابراہیم کے عہد میں کسی ذوالقرنین کی بحث کا امکان بھی مانتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ بعض صحائف میں جس شخصیت حضرت ملک الصدق کا ذکر ملتا ہے جن کی حضرت ابراہیم سے ملاقات ہوئی تھی ہو سکتا ہے وہی ذوالقرنین اول ہوں۔ چونکہ یہ بحث طویل ہو جائے گی اس لیے عاجزان دلائل کو پیش نہیں کرتا جو حضرت انس بن یزد المعروف بہ الیسع الادریس ذوالکفل کے ہی ذوالقرنین اول کے اعتبار سے ترجیح کا سبب ہیں۔

بہر حال حضرت ذوالقرنین اول مبعوث فرمائے گئے۔ کوئی ضروری نہیں — بلکہ اس کا امکان کم ہی ہے — کہ کوئی ذوالقرنین ایسے نبی ہوں جن کا بنیادی کام دعوت ہو — اس لیے کہ ایک ذوالقرنین نبی اپنے آپ میں حجت، جارحہ اور فیصل ہوتا ہے بلکہ وہ حجت کے ساتھ ساتھ امر اللہ بھی ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی زندگی میں دعوتی انبیاء کی طرح مصابرت کے بجائے قوت قاہرہ کا استعمال ہوتا ہے اور وہ قوت قاہرہ بشری کے ساتھ ساتھ مافوق البشری بھی ہوتی ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کوئی ذوالقرنین ایک فیصلہ کن حاوی موثر فوق البشری قوت لے کر ہی آتا ہے اور جب ہی اسے ذوالقرنین سے موسوم کیا جاتا ہے۔

قرآن کے مطالعے سے ایسا بھی معلوم ہوتا ہے کہ زمین پر حضرت آدم اور حضرت حوا کی تشریف آوری کے بعد خیر و شر کے جتنے معرکے ہو چکے تھے — یعنی معرکہ سوم کے پہلے دور کا حصہ اول و حصہ دوم، دوسرا دور پھر معرکہ چہارم کا پہلا دور — یہ بھی معرکے کسی نہ کسی طور پر خیر کے لیے تباہ کن ثابت ہوئے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت انس بن یزد المعروف بہ الیسع الادریس ذوالکفل کی رفعت بھی ایک کلی تباہی (Disaster) سے بچانے کی کارروائی تھی اسی طرح حضرت انس بن یزد کے بعد اہل حق پر کسی سخت آزمائش کا دور آیا ہو گا اس کا اندازہ کیا جانا مشال نہیں۔

قرآن میں یہ پورا بیان بہت عجیب و غریب حقائق پر مبنی ہے۔

(۱) پہلی بات : وقت اور زمانہ :

سب سے اہم اور قابل لحاظ بات یہ ہے کہ ذوالقرنین کا پورا تذکرہ حضرت ہانبل کے معا بعد کا تناظر پیش کرتا ہے جہاں شرک اور کفر کے بجائے ظلم پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اس میں یاد دہانی

کی بات یہ ہے کہ آدم و ابلیس کا یہ معرکہ پہلے، دوسرے اور تیسرے مرحلے میں بنیادی طور پر معرکہ خیر و شر تھا۔ اس کے بعد جیسے ہی رسالت کا آغاز ہوا اور عبادات و معاملات کے تعلق کے شرعہ کی باضابطہ ابتداء ہوئی تو یہ معرکہ خیر و شر اپنی اصل کے اعتبار سے تو ہمہ وقت معرکہ خیر و شر ہی رہا لیکن اپنے ظواہر کے اعتبار سے معرکہ حق و باطل ہو گیا۔ حضرت ہابیل کا عہد ظاہر و باطن دونوں اعتبار سے معرکہ خیر و شر کا ہی عہد تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام کے عہد کے دو حصے ہیں۔ طوفان سے قبل اور طوفان کے بعد۔ طوفان سے قبل کے عہد کو دو طرح سے ظاہر کیا جاسکتا ہے:

(۱) طوفان سے قبل کا عہد یا تو معرکہ خیر و شر کا ظاہر و باطن دونوں اعتبار سے درجہ کمال کو پہنچنے کا عہد تھا۔

(۲) یا طوفان سے قبل کا عہد ہر چند کہ معرکہ خیر و شر کے درجہ کمال کو پہنچنے کا عہد تھا لیکن اسی وقت اس میں حق و باطل کے رجحان کی ابتداء بھی ہو رہی تھی۔ چنانچہ طوفان نے شر کے سارے ارتقاء کو فنا کر دیا لہذا اس کے بعد معرکہ خیر و شر نے ظاہر کے اعتبار سے معرکہ حق و باطل کی شکل اختیار کر لی۔

طوفان کے بعد کا عہد روئے زمین پر بنیادی طور پر معرکہ حق و باطل کا عہد ہے۔ جس کی کلی تمدنی آخر الزماں ﷺ کے مشن کی تکمیل تک جاری رہتی۔ اس کے بعد پھر یہ معرکہ حق و باطل از سر نو معرکہ خیر و شر کی طرف بڑھ جاتا یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا علیہ السلام اور حضرت مہدی علیہ السلام کی آمد ہو جائے جو ایک بار پھر اور گویا آخری بار شر کو کلی طور پر ختم کر دینے کے لیے مقدر ہیں۔ ان شاء اللہ۔

سورۃ الکہف میں بھی حضرت ذوالقرنین کا ذکر بتاتا ہے کہ یہ عہد حضرت ہابیل اور حضرت نوح کے درمیان کا عہد ہے۔ جس میں منکرات کے ذکر کے لیے صرف دو الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے یعنی 'من ظلم' (جنہوں نے ظلم کیا) اور 'مفسدون' (فساد کرنے والے)۔ بلاشبہ معروفات کے لیے 'من امن' اور 'عمل صالحا' کا استعمال کیا گیا ہے جو بتا رہے ہیں کہ رسالت و شرعہ کا ہر چند کہ آغاز ہو چکا ہے اور اس بات کو سینکڑوں سال ہو چکے ہیں مگر تاریخی طور پر وہ ابھی بھی بالکل ابتدائی مرحلے میں ہے۔

دوسری بات : وسعت :

اس سورۃ کی دوسری بہت اہم بات ہے اس معرکے کے مرکزی میدان کشمکش کی تعیین اور اس میں الارض کا استعمال : یہ الارض اپنی وسعت اور معنویت کے لحاظ سے قرآن میں بیان ہونے والے درج ذیل تین الارض میں سے دوسرے اور تیسرے کے درمیان کا الارض معلوم ہوتا ہے۔ یعنی

- (۱) ولکم فی الارض مستقر ومتاع الی حین۔ (البقرہ : ۳۶)
ترجمہ: اور تمہارے لیے ارض میں ٹھکانا ہے اور متاع تھوڑی مدت تک کے لیے۔
(۲) فبعث اللہ غرابا یبحث فی الارض لیریدہ کیف یواری
سؤۃ اخیه۔ (المائدہ: ۳۱)
ترجمہ: چنانچہ اللہ نے ایک کوا بھیجا جو زمین کھودنے لگا تاکہ اپنے بھائی کے
جسم کو چھپا دے۔

- (۳) وقال نوح رب لا تذر علی الارض من الکفرین دیارا۔
(نوح : ۲۶)

ترجمہ: کہا نوح نے اے رب! زمین پر کسی کافر بستی کو نہ چھوڑ۔

چنانچہ سورۃ الکہف میں مذکور:

- (۱) مکنالہ فی الارض (ہم نے اس کو تمکن دیا زمین میں)
(۲) آتینذ، من کل شئی سببا (ہم نے اسے ہر مہم کو چلانے، ہر چیز کو گھیرنے، قابو
میں کرنے اور زیر کرنے کی طاقت دی)

(۳) بلغ مغرب الشمس۔ (پہنچا سورج ڈوبنے کی جگہ)

(۴) بلغ مطلع الشمس۔ (پہنچا سورج طلوع ہونے کی جگہ)

اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ یہ حق کی جانب سے پہلی ارضی کارروائی تھی۔ یہاں ارض کی تطبیق یہ تو کی جاسکتی ہے کہ اس روئے زمین کی ارضیاتی سطح پر صرف اتنا حصہ ہی مقدر ہے جہاں تک اس زمانے میں انسانی آبادی تھی۔ چنانچہ اب وہ موجودہ طول البلد کی پیمائش کے اعتبار سے جس مشرقی طول البلد سے جس مغربی طول البلد تک پھیلا ہو۔

(۳) تیسری بات : مقصد اور مہم :

تیسری بات پہلی دو باتوں سے اہم ہے۔ یعنی یہاں جس ذوالقرنین کا ذکر کیا جا رہا ہے آخر اس کی بعثت کا بنیادی مقصد کیا تھا؟

چنانچہ قرآن نے اس پر پڑے ڈرامائی انداز سے روشنی ڈالی ہے جو درج ذیل ہے:

(۱) مہم کی عظمت: جس مشن پر حضرت ذوالقرنین بھیجے گئے تھے وہ مہم کتنی بڑی اور مشکل تھی اور اس کے لیے کیا صلاحیت اور قوت درکار تھی اس پر روشنی ڈالتے ہوئے قرآن نے دو باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے:

(الف) پوری روئے زمین پر اقتدار کی طاقت : چنانچہ قرآن نے فرمایا :

اذا مکنالہ فی الارض۔ (بے شک ہم نے اسے عطا کی پوری روئے ارض پر تمکن)

(ب) و آتینہ من کل شئی سببا۔ (اور بے شک ہم نے اس کو متعین کردہ مقاصد کی تکمیل کے لیے) ہر مہم کو شروع کرنے، ہر چیز کو گھیرنے اور گرفت میں لینے، ہر چیز پر قابو کرنے، اور ہر چیز کو زیر کرنے کی طاقت دی۔

(۲) مہم کی پہلی ضرورت : اس مہم کو پورا کرنے سے پہلے تین ضرورتوں کی طرف قرآن اشارہ کرتا ہے جن کا پورا کیا جانا ضروری تھا۔

(الف) پوری روئے ارض پر حق کا عمومی اقتدار بحال کرنا یا کم از کم حق کے گرے ہوئے علم کو ایستادہ کرنا۔

(ب) تمام ظالموں اور شر کے انسانی نمائندوں کی تلاش اور انہیں نشان زد کرنا۔

(ج) روئے ارض پر اس ہولناک مرکز شر کو تلاش کرنا جو فی زمانہ سب سے بڑا چیلنج بن گیا تھا اور اسے نشان زد کرنا۔

لیکن یہ تینوں ابتدائی مقاصد ایک ساتھ شروع کیے گئے۔ ایسا لگتا ہے کہ حضرت ذوالقرنین نے تنہا اس مہم کا آغاز کیا اس سے یہ اندازہ کرنا کتنا آسان ہے کہ ان کی بعثت کتنی نازک اور حق کے لیے کیسی ہولناک حالت کا نتیجہ تھی۔ ممکن ہے یہ وہ صورت حال ہو کہ چند نفر کے علاوہ اہل حق میں سے کوئی بچانہ ہو یا جو گروہ بچا بھی ہو وہ شر سے اتنا خوفزدہ ہو کہ روئے ارض پر حق کی کارروائی کے

عملاً کلی طور پر معطل ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہو جیسا کہ حضرت عیسیٰ کے نزول سے قبل کی حالت تھی۔ چنانچہ حضرت ذوالقرنین نے اس مہم کا آغاز اس ہمہ جہت تلاش اور نشان زدگی سے کیا۔ اس پر قرآن نے اس طرح روشنی ڈالی ہے:

فَاتَّبِعْ سَبِيلَ (چنانچہ ذوالقرنین نے) تلاش کی باضابطہ مہم شروع کی۔

یہاں دو اہم سوال پیدا ہوتے ہیں:

- (۱) حضرت ذوالقرنین کہاں مبعوث ہوئے؟ اور انہوں نے کہاں سے مہم شروع کی؟
 - (۲) آپ کا اصل مشن کیا تھا؟ یا بالفاظ دیگر روئے ارض پر شیطان کا وہ حملہ جس میں اس نے حق کو تقریباً مغلوب کر دیا تھا کیا تھا؟
- چونکہ اس پوری بحث کو نہایت مختصر ہی درج کیا جاسکتا ہے اس لیے یہاں صرف ناگزیر امور ہی بیان کیے جائیں گے۔

عین ممکن ہے کہ حضرت انس بن یرد کا آسمان پر اٹھالیا جانا پہلے اسی خطرے کے سبب ہوا ہو گا یعنی روئے ارض پر یاجوج و ماجوج کا حملہ اور اس پر ان کی فساد انگیزی۔ ممکن ہے کہ حضرت انس بن یرد کو خطرے کے ظاہر ہونے سے قبل ہی اٹھالیا گیا ہو۔ اور ان کی دوبارہ بعثت اس وقت ہوئی ہو جبکہ یہ خطرہ پوری شدت سے تباہ کاریاں پھیلا رہا ہو۔ غور کرنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام اپنی رفعت کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد — جیسا — کہ بعض بیانات سے اندازہ ہوتا ہے — ذوالقرنین بن کر روئے ارض پر تشریف لائے۔ ممکن ہے صرف تین سو سال کے اندر اندر — اس لیے کہ بعض بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے بعد انہوں نے زمین پر متاھل ہو کر زندگی گزاری ہے اور ان کے اولاد بھی ہوئی۔ اور پھر غالباً ان کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت انسانوں میں بیشتر اہل حق تھے بہت تھوڑے انسان اہل شر تھے۔ چنانچہ ابلیس نے اصلی حملہ اہل شر انسانوں کے ذریعہ اہل حق پر نہیں کر دیا تھا بلکہ یہ حملہ ایک غیر انسانی مخلوق یاجوج و ماجوج کے ذریعہ کروایا گیا تھا۔ اور اسی کو تلع قمع کرنے کے لیے حضرت ادریس کی ذوالقرنین کے اعتبار سے از سر نو بعثت ہوئی۔ اس اعتبار سے یہ زمانہ حضرت نوح علیہ السلام سے کم از کم ۱۲۰۰ سال قبل کا ہو گا۔ جب ذوالقرنین اول کی بعثت ہوئی ہوگی۔

بعض شواہد سے ایسا لگتا ہے کہ آپ کی بعثت ثانیہ یعنی حضرت ادریس کی ذوالقرنین اول

کے اعتبار سے بعثت 30° طول البلد مشرق اور 50° طول البلد مشرق کے درمیان ہوئی ہوگی۔

’مغرب الشمس‘، ’مطلع الشمس‘ اور ’بین السدین‘ کی بحث بے حد پیچیدہ اور متعدد الوجوہ ہے اس لیے اسے آئندہ کے لیے چھوڑ دینا بہتر ہے۔

چنانچہ قرآن کے بیان سے لگتا ہے کہ حضرت ذوالقرنین کی ابتدائی دو مہمیں ہر چند کہ اپنے مقاصد میں مجموعی طور پر کامیاب ہوئیں لیکن ان کی بعثت کا مقصد اصلی پھر بھی حاصل نہ ہوا۔ چنانچہ آپ نے تیسری مہم کا آغاز کیا اور جب آپ بین السدین پہنچے تو آپ نے اس قوم کی نشاندہی کر لی جو دراصل آپ کی بعثت کا سبب ہوئی تھی۔ یعنی یاجوج و ماجوج۔ گزشتہ دو مہموں کا جہاں یہ فائدہ ہوا کہ مغرب و مشرق کے تمام مخالفین حق کی نشاندہی ہو گئی وہیں یہ بھی فائدہ ہوا کہ حضرت ذوالقرنین کی قیادت میں سارے اہل حق جمع ہو گئے۔ چنانچہ آیت: ۹۴ میں قالوا یا ذا القرنین میں قالوا سے مراد سارے جمع اہل حق اور تمام روئے زمین کے عامۃ الناس ہیں جو عمومی طور پر فساد سے پریشان ہو چکے تھے۔ اور اب حضرت ذوالقرنین کی موجودگی اور ان کی واضح استقامت کی وجہ سے جن کی جان میں جان آئی تھی۔

چنانچہ اس موقع پر حضرت ذوالقرنین نے اپنی اصل مہم کا آغاز فرمایا جن کے بنیادی نکات درج ذیل ہیں:

(۱) یاجوج و ماجوج جو باہر آچکے تھے ان کا خاتمہ۔

(۲) زندہ یاجوج و ماجوج کو گہری نیند سلا دینا۔

(۳) ان کے نکلنے کے راستے کو بند کر دینا۔

چنانچہ آپ کی اس پوری کارروائی کو قرآن نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

آتونی زبر الحديد حتى اذا ساوى بين الصدفين قال انفخوا

حتى اذا جعله نارا قال آتونی افرغ عليه قطرا۔ (الکہف : ۹۴)

ترجمہ: لے آؤ میرے پاس ڈھیر حديد کے۔ یہاں تک کہ جب دوسرے برابر

ہو گئے تو ذوالقرنین نے کہا: پھونکو۔ یہاں تک کہ یہ آگ ہو جائے۔ پھر کہا کہ لے آؤ

میرے پاس تاکہ ڈلوایا جائے اس پر بند کرنے کے لیے ڈھکن۔

اس کام کے ختم کر لینے اور اپنے مقصد بعثت کو پورا کر لینے کے بعد آپ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور لوگوں سے فرمایا کہ میں نے جو کچھ کیا وہ اتنا غیر معمولی تھا کہ کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ میں فی نفسہ ان فوق البشری قوتوں کا مالک ہوں جن کا ابھی مجھ سے صدور ہوا ہے۔ بلکہ یہ کام دراصل اللہ رب العزت نے کروایا ہے۔

اس کے بعد آپ نے قیامت تک کے حالات کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا:

فما استطاعوا ان يظهروه وما استطاعوا له نقبا. (الکہف: ۹۷)

ترجمہ: پس نہ ان کے پاس اس کی طاقت ہے کہ وہ اس کو چڑھ کر پار کریں اور نہ وہ اس میں شکاف ڈال سکیں گے۔

حضرت ذوالقرنین کی زبان سے نکلے یہ الفاظ اور قرآن میں درج یہ کلام اللہ قرآن کے ان عجائبات میں سے ہے جن کی گہرائیوں میں انسان کھو ۱۲۰ ہے۔ نو الفاظ کی یہ آیت اپنے اندر حکمتوں کی ایک ایسی دنیا رکھتی ہے جسے بیان کرنا مشکل ہے۔

حضرت ذوالقرنین نے مزید فرمایا:

فاذا جله وعد ربى جعله دكاء وكان وعد ربى حقا. (الکہف: ۹۸)

ترجمہ: پھر جب آئے گی میرے رب کی ميعاد تو وہ اس بند کو ریزہ ریزہ کر دے گا۔ اور میرے رب کی ميعاد یقینی ہے۔

اس طرح حضرت ذوالقرنین اول نے اپنی بعثت کے مقاصد پورے فرمائے۔ اور زمین پر اہل حق کو تمکین عطا کیا۔ زمین پر پہلی بار حق کو فتح نصیب ہوئی تھی۔ اس طرح معرکہ خیر و شر کا مرحلہ چہارم اختتام پذیر ہوا۔

ایک اشکال :

یہاں ایک اشکال پیدا ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسی مدد سے بنی آدم کو کیوں نوازا؟ واقعہ کی تفصیل سے ایسا لگتا ہے کہ انسان مغلوب ہو رہا تھا اور ابلیس غالب لیکن اللہ تعالیٰ کی مدد نے صورتحال بدل دی اور گویا یہ ابلیس کے ساتھ زیادتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ابلیس کے ساتھ زیادتی اللہ تعالیٰ نے نہیں کی نہ ہی اللہ تعالیٰ نے خلاف ضابطہ انسان کی مدد کی۔ بلکہ اصلی سوال یہ ہے کہ ابلیس کو الی الیوم الوقت المعلوم تک آزادی (Free hand) دینے کا مطلب کیا ہے اور

اس نے اس کی کیسی کیسی خلاف ورزی کی ہے؟ اس صورت حال کو ایک مثال سے سمجھیں :

فرض کیا جائے کہ فرد الف یا ٹیم الف کو کامیاب قرار دے دیا گیا اس پر فرد ب یا ٹیم ب نے اعتراض کیا کہ یہ فیصلہ درست نہیں اور یہ کہ اگر دوبارہ کھیلنے کا موقع دیا جائے تو ثابت ہو جائے گا کہ پہلا فیصلہ غلط تھا۔ اب اس معترض ٹیم کو پوری اجازت دی گئی کہ وہ اس دعویٰ کو ثابت کرے۔ اس آزادی کا مطلب یہ ہے کہ وہ کھیل کے میدان میں اپنی ٹیم کے ساتھ کھیل کر ثابت کرے۔ اب اگر وہ ٹیم کھیل کے میدان کے باہر سے یا کھلاڑیوں کے علاوہ غنڈے بلا کر مخالف ٹیم کو پٹوائے تو یہ اس آزادی کی خلاف ورزی ہے۔

ٹھیک اسی طرح ابلیس نے اس آزادی کے حدود کو بالائے طاق رکھ کر ہمیشہ خلاف ورزی کی۔ لہذا اللہ نے ایک خاص سنت کا اجراء فرمایا یعنی اس خلاف ورزی پر ابلیس سے کوئی تعارض نہ کیا جائے اور صرف خلاف ورزی کی حد تک توازن برقرار رکھنے کے لیے بنی نوع انسان میں مومنین کی مدد کی جائے۔ لہذا اللہ تعالیٰ کی یہ مدد فی الواقع ابلیس پر زیادتی نہیں۔ اصل زیادتی اور خلاف ورزی کا مرتکب تو خود ابلیس ہے جس نے ہمیشہ ہی اپنے حدود پا مال کیے۔

مرحلہ پنجم : ابلیس کا مافوق البشری سماوی قوتوں کے ذریعہ حملہ

اور پہلی کائناتی جنگ عظیم : 6000 قبل مسیح

معرکہ خیر و شر میں مرحلہ چہارم ابلیس کی ناکامی پر ختم ہوا۔ ہر چند کہ ذوالقرنین کی آمد اہل حق کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کھلی مدد ضرور تھی اور فتح بھی لیکن اسے کھلی فتح قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس لیے کہ اس کا نقصان ابلیس کو صرف یہ ہوا کہ اس نے اچانک اہل حق پر حملے کے لیے جس حیوانی قوت کو زمین سے نکال کر اوپر چڑھایا تھا انہیں جزوی طور پر ختم کر دیا گیا اور جو باقی بچ گئے تھے انہیں زیر زمین مفلوج اور معطل کر دیا گیا۔ اور اب قیامت سے قریب ہی ان کے پھر باہر آنے کا اندیشہ ہے جیسا کہ حضرت ذوالقرنین نے بتایا تھا اور اب جس کی تصدیق قرآن کر رہا ہے۔

اس سے اہل حق اور بطور خاص حضرت انس بن یزید یعنی اب حضرت ذوالقرنین علیہ السلام اور دیگر اہل حق کو سکون میسر آگیا اور پوری روئے زمین پر حق کا غلبہ ہو گیا۔ اور ابلیس اور اس کے شر کے دروازے بند ہو گئے۔

دراصل ابلیس نے اس مرحلے میں مکر اور کید کا سہارا لیا تھا اور اسے اس کا اندازہ نہیں تھا کہ جب وہ اس طرح دیو ہیکل حیوانی قوتوں کو انسانوں پر چڑھالائے گا اور جب انسان اس کے ہاتھوں پوری طرح سے مغلوب اور بے بس ہو جائیں گے اس وقت اللہ تعالیٰ کسی انسان کو ذوالقرنین بنا کر مدد کے لیے بھیج دے گا۔ چنانچہ حضرت ذوالقرنین اول کی اچانک آمد نے ابلیس کی فتح کو پوری طرح شکست میں بدل کر رکھ دیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ عظیم کوشش — جسے اس نے تقریباً تین سو سالوں سے جاری رکھی تھی اور جس کے نتیجے میں ایک عظیم الشان حیوانی دیو ہیکل فوج تیار ہو سکی تھی۔ اور جس کے ذریعہ اس نے اہل حق کو چوہو نیوں کی طرح روند ڈالنے اور گاجر مولیٰ کی طرح کاٹ ڈالنے کا آغاز کر دیا تھا۔ اور قریب تھا کہ اسے کلی اور مکمل فتح نصیب ہوتی — خاک میں مل گئی بلکہ اس پوری فوج کو دوبارہ منظم کرنے سے وہ ہزاروں سالوں تک کے لیے محروم کر دیا گیا۔ اس پوری حیوانی فوج کو حضرت ذوالقرنین نے نہ صرف Disband کر دیا بلکہ اس کی افزائش کو بھی معطل کر دیا۔

اس بے بسی نے ابلیس کو نہ صرف یہ کہ غضب ناک کر دیا بلکہ اس کو نئی، مزید وحشت ناک اور ہمہ گیر طریقہ جنگ وضع کرنے کی طرف مہمیز کیا۔ اس نے ایک ایسی تدبیر کی جس کا کسی کو وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ یعنی اس نے اپنی بے مثال تدبیروں سے دنیا ملائکہ میں زلزلہ برپا کر دیا اور ایک ایسی کامیابی حاصل کر لی جس کا بظاہر تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ اپنی کوششوں سے ملائکہ کے ایک گروہ کو گمراہ کرنے اور اپنے ساتھ ملانے اور انہیں آدم کے خلاف اپنی جنگ میں آلہ کار بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دو سو سے زائد ملائکہ تھے جن میں انیس (۱۹) اعلیٰ درجے کے ملائکہ تھے۔

ابلیس نے ان ملائکہ کے اندر فساد جنم پیدا کیا اور انہیں زمین پر لے آیا۔ ابلیس کی کوششوں سے ان ملائکہ نے انسانی عورتوں سے صحبت کی اور بے قابو ہو گئے۔ ایسا کرنا ابلیس کی ایک طویل اور اس کی عقل کے اعتبار سے ناقابل شکست حکمت عملی تھی۔ وہ حضرت ذوالقرنین کی بعثت اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی جانے والی نصرت سے اب واقف ہو چکا تھا۔ غالباً اس کا خیال تھا کہ وہ صرف اس لیے اس دیو ہیکل حیوانی فوج کے حملے میں ناکام ہو گیا کہ اس نے اس طرف دھیان نہیں دیا کہ اللہ تعالیٰ ملائکہ کے ساتھ حضرت ادریس ذوالکفل کو ذوالقرنین بنا کر بھیج سکتا ہے۔ لہذا اس نے اب یہ حکمت عملی اپنائی کہ اگر ایسی کوئی دوسری مدد اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کو ہوئی بھی تو وہ اسے ناکام بنا دے گا۔ دوسری بات یہ کہ اب اس نے اس دیو ہیکل حیوانی فوج — جواب اس کے لیے معطل تھی — کی جگہ اس سے کروڑوں گنی زیادہ طاقتور زیادہ وسیع الاطراف زیادہ ہمہ گیر اور ارضی کے بجائے کائناتی فوج (Cosmic Army) بنالی تھی اور اسے پوری امید تھی کہ اس کی یہ حکمت عملی ناکام نہیں ہوگی اور اس بار وہ پوری روئے زمین سے آدم نام کی نسل کے نام و نشان کو مٹا دے گا۔

قوم نوح (ما قبل طوفان) : 6000 قبل مسیح

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ قوم جسے قرآن کی آیت میں 'قوم نوح' کہا گیا ہے کون سی قوم تھی؟ قرآن نے بیان فرمایا:

”وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ“ (الاعراف: ۵۹)، (ہود: ۲۵)
(المؤمنون: ۲۳) (العنکبوت: ۱۳) (نوح: ۱) وغیرہ۔

ترجمہ: اور تحقیق کہ ہم نے بھیجا نوح کو اس کی قوم کی طرف

یہاں یہ بات واضح ہو کہ اس وقت روئے زمین کی آبادی خواہ کتنی ہی پھیلی ہوئی ہو وہ آج کے مقابلے میں چھوٹی تھی اور غالباً پوری روئے زمین کے موجودہ ہر خطے میں پھیلی ہوئی نہ تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ موجودہ روئے زمین کے خشکی کے سارے حصے آج کے مثل نہ ہوں۔ جہاں آج برف ہے ممکن ہے کل وہاں نہ ہو، جہاں آج سمندر ہے ممکن ہے وہاں سمندر نہ ہوں۔ جہاں آج پہاڑ ہیں وہاں اتنے اونچے پہاڑ نہ ہی ہوں یا سرے سے پہاڑ نہ ہوں۔ جہاں آج خشکی ہے کل وہاں سمندر ہوں۔ دوسری بات یہ کہ اس وقت انسانی آبادی پھیلنے کے باوجود مربوط اور ملی ہوئی تھی۔ اس لیے یہاں قومہ سے مراد پوری نسل انسانی ہے جو اس وقت باہم مربوط اور موجود تھی۔

قومہ کے اس وسیع مفہوم کے باوجود اس سوال پر غور کرنا ضروری ہے کہ طوفان سے قبل وہ کون سی انسانی آبادی تھی جسے یہاں قومہ سے موسوم کیا گیا ہے۔ اور اس کے اظہار کے لیے تاریخی طور پر کون سے نام کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ اس سلسلے میں کئی باتوں کی وضاحت ضروری ہے:

(۱) جب تہذیب یا نظام کا ذکر کیا جائے تو اس سے مراد وہ مرکزی لوگ اور ان کی حکومت ہوتی ہے جو دراصل اس تہذیب کے ستون ہوتے ہیں اور اس وقت موجود تمام قومیں اور اگر ممالک ہوں تو ممالک بالواسطہ یا بلاواسطہ اس نظام کے تحت زندہ رہتے ہیں۔ مثلاً: آج پوری دنیا میں جو تہذیب غالب ہے وہ مغربی تہذیب ہے خواہ وہ یورپ میں پائی جاتی ہو یا ایشیا اور افریقہ میں۔ اس لیے آج دنیا کی تہذیب مغربی ہے، آج دنیا میں مغربی تہذیب ہے۔

(۲) حضرت نوح کے طوفان کا زمانہ آج سے چار ہزار سال قبل پائی جانے والی سمیری

تہذیب (Sumerian Civilization) سے قبل کا زمانہ ہے۔

(۳) اس عاجز کی تحقیق کے مطابق حضرت نوح علیہ السلام جس انسانی تہذیب کی طرف بھیجے گئے تھے وہ وہی تہذیب ہے جس کا ذکر افلاطون (Plato) نے اپنی کتابوں 'Timaeus' اور 'Critias' میں کیا ہے۔ افلاطون کے مطابق اس تہذیب کا ذکر جسے اس نے اٹلانٹس (Atlantis) کہا ہے۔ — کری ٹائیس (Critias) کے دادا نے ایتھنس (Athens) کے بزرگ سولن (640-558 BC-Solon) سے سنا جسے مصر کے علماء نے سائس (Sais) کے مقدس مرکز میں سولن کو بتایا تھا۔

(۴) اس تہذیب کی معلومات کے تعلق سے بہت سی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں مثلاً اس کے اصلی مقام، زمانہ، ترقی کے احوال اور تباہی کی صورت سے متعلق تفصیلات کی صورت میں غلط فہمیاں۔

(اس تعلق سے تفصیلی تقریر ان شاء اللہ عالم اسلام کی منصبی و مقصدی صورت حال میں آئے گی)

فساد عظیم :

اس عہد میں ابلیس نے اپنی نئی حکمت عملی کے تحت اس روئے زمین پر بالعموم اور نسل انسانی کے درمیان بالخصوص ایسا فساد عظیم برپا کیا جس کا تصور کرنا محال ہے۔ یہی وہ فساد عظیم تھا جس کا کسی قدر اجمالی تذکرہ توضیحات کے ذیل میں صفحات ۲۹۳ تا ۳۰۴ میں آچکا ہے۔ قرآن نے اسی فساد کا ذکر کرتے ہوئے انہیں جن الفاظ میں بیان کیا ہے وہ اس کی وسعت، ہولناکی اور سنگینی کو ظاہر کرتا ہے۔ قرآن کا بیان ہے:

قال نوح رب انهم عصونی واتبعوا من لم یزده ماله وولده الا

خسلرا۔ و مکروا مکرا کبارا۔ (نوح: ۲۱-۲۲)

ترجمہ: کہا نوح نے اے رب میرے! انہوں نے میرا کہا نہ مانا اور مانا ایسے کا

جس کو اس کے مال اور اولاد سے اور زیادہ ہو ٹوٹا۔ اور داؤ کیا ہے بڑا داؤ۔

اس 'مکر کبار' کی وسعت، ہولناکی اور سنگینی کیسی تھی اس کا اندازہ توضیحات میں درج

عنوانات کے تحت دیکھے جانے سے ہو جائے گا۔

ابلیس کے اس مکر کبار کے اجزاء، اور مقصد و ہدف کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو ایسا اندازہ ہوتا

ہے کہ یہ ایک سہ منزلہ کارروائی تھی جس کا مقصد روئے زمین سے نفس خیر کا ہی نہیں بلکہ پوری نسل انسانی کا کلی خاتمہ تھا، تاکہ ابلیس کو اس مخلوق انسان سے ہی نجات مل جائے۔ اس کی تین سطحیں درج ذیل تھیں:

- (۱) مرحلہ اول — زمین میں فساد پیدا کرنا اور اس فساد کو زندگی کے ہر شعبے تک وسیع کر دینا۔
- (۲) مرحلہ دوم — زمین پر بے تحاشا، بے مہار اور بے مقصد خون ریزی کرانا۔
- (۳) مرحلہ سوم — پوری نسل انسانی کو ہی ختم کر دینا۔

(۱) مرحلہ اول

زمین پر فساد پیدا کرنا اور اس فساد کو زندگی کے ہر شعبے تک وسیع کر دینا — ایک ہولناک شیطانی منصوبہ تھا۔ اس کے ذریعہ طرح طرح کے فساد پیدا کیے گئے جن کے دو بنیادی شعبے ہیں جو درج ذیل ہیں۔

(۱) فساد نسل :

یہ وہ فساد الفساد ہے جس کا ذکر سب سے پہلے کیا جانا چاہئے۔ اس کے تحت ابلیس نے ملک اور جنوں کی آدمی عورتوں سے صحبت کروائی اور اس طرح جباروں، نفلوں، الیودوں، نفروں اور عفریتوں کی لاتعداد قسمیں انسانی معاشرے میں پیدا کروادیں۔ یہاں اس کی گنجائش نہیں کہ اسکی پوری تفصیل بتائی جائے تاہم اگر تقریب فہم کے لیے آج کی ایک مثال دی جائے تو وہ لوگ جو اس وقت مغربی سائنسی تجربہ گاہوں میں ہو رہے ہولناک تجربوں سے واقف ہیں وہ اسے باسانی سمجھ سکتے ہیں۔ اور وہ مثال یہ ہے کہ فرض کر لیا جائے کہ روئے زمین پر ایک جینیاتی، حیاتیاتی اور جرثوماتی جنگ عظیم چھڑ جائے اور زمین، آسمان اور سمندروں سے جینیاتی، حیاتیاتی اور جرثوماتی اسلحوں سے حملے ہونے لگیں تو چند سالوں کے بعد نسل انسانی کے وجود اور اس میں پیدا ہونے والے فسادات کی کیا صورت ہوگی؟

میرا اندازہ ہے کہ جو لوگ ان سائنسی تجربہ گاہوں میں ہونے والے کاموں کا براہ راست علم رکھتے ہیں وہ اس مثال کی توضیح کرنا تو دور کی بات تصور کرتے ہی کانپ جائیں گے۔ چنانچہ ابلیس نے ان ملکوں اور جنوں کی فوج کے ساتھ پہلے مرحلے میں روئے زمین پر یہی

کیا۔ اس کے، چند ہی دنوں کے بعد روئے زمین پر انسانی معاشروں کے اندر بچوں اور نوجوانوں اور لڑکے اور لڑکیوں کے اعتبار سے (Inhuman)، (Unhuman)، (A-human) نسلوں کی ایک معتد بہ تعداد پیدا ہو گئی۔ چنانچہ اس مرحلے کی تکمیل ہوتے ہی ابلیس نے پہلے مرحلے کا دوسرا حصہ شروع کیا جس کا مقصد تھا اس فساد کو ایک تسلسلی رد عمل (Chain-reaction) کی شکل دے دینا اور اس طرح اس کو زندگی کے ہر شعبے میں پھیلا دینا۔

(۲) فساد علم :

یہ وہ دوسرا افسد الفساد ہے جس کا ذکر فساد نسل کے بعد ہونا چاہئے۔ علم کا منبع اللہ رب العزت ہے۔ اس نے لوگوں کو علم دیا۔ وہ سارے علوم جن سے انسانوں کو آگاہ کیا گیا محمود تھے۔ اگر اس میں کسی مضرت کا امکان تھا تو وہ صرف اس حد تک کہ کوئی ان محمود علوم کا استعمال نا محمود کاموں میں نہ کر لے۔ اس تعلق سے دوسری بات یہ تھی کہ انسانوں کو جو بھی علوم دیئے گئے وہ اس کی تکلیف کے عین مطابق تھے۔ اسے اللہ رب العزت نے ایسا کوئی علم نہیں دیا جو مالا یطاق ہو۔ اس نظام میں پہلا فساد اس وقت پیدا ہوا جب ابلیس معتب اور راندہ درگاہ ہوا۔ اس لیے کہ جو علوم اس کے پاس تھے اس کے بے جا استعمال کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ اور اللہ تعالیٰ الیوم الوقت المعلوم تک اسے اس کے علم سے محروم نہیں کرتا۔ اگر آدم کے خلاف ابلیس کی پوری کارروائی اور حکمت جہگ کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ابلیس کے اقدامات نہایت دقیق غور و فکر اور سوچ بوجھ کا نتیجہ رہے ہیں۔ اس نے پہلی کارروائی کی بنیاد آدم کی ساخت کو بنایا اور اب البتہ کے بعد بھی اس کی کوششوں کا بنیادی پتھر انسان کی ساخت اور جنس ہی ہے۔

اس کی حکمت عملی کا دوسرا پتھر آدم کی وہ فضیلت ہے جس سے اس نے ملائکہ کے سامنے اپنی فوقیت ثابت کی تھی۔ واضح ہو کہ ملائکہ کا علم انفرادی نکتے پر ممکن ہے انسان سے بڑھا ہوا ہو لیکن ان کے علم کی نوعیت One-Time-One-Way-One -Mission-One Aspect- Input & Regulated knowledge ہوتا ہے۔ جبکہ آدم کے پاس Multi-Timous-Multiway - multi - Misson-All Aspect -Input-output-Free-knowledge ہوتا ہے۔

ابلیس نے بہت دقت نظر کے ساتھ دوسرے فساد کی بنا رکھی۔ اس نے دوسرا فساد اس طرح پیدا کیا کہ ان آلہ کار ملائکہ کے پاس انفرادی طور پر جو علوم ان کے تفویض کردہ کاموں کے تعلق سے تھے انہیں پہلے مرحلے میں انسانی خواتین اور دیگر مرد آلہ کار کو زاد (Input) کے اعتبار سے منتقل کر دیا۔ دوسرے مرحلے میں انہیں زندگی کے تمام شعبوں میں تو سبج دے دی۔ چونکہ یہ وہ علوم تھے جن کا تعلق ان ملائکہ کی مفوضہ ذمہ داریوں سے تھا جو بحیثیت آدمی علوم مالا یطاق تھے۔ اس لیے جب یہ مالا یطاق علوم انسانوں کو ملے تو اب اس ہمہ جہت دماغ میں وہ ایسے فسادات پیدا کرنے کا باعث ہوئے جن کا تصور ملائکہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

(۳) ذیلی فسادات:

اس طرح پیدا ہونے والے یہ دو بنیادی قسم کے فساد ہیں جن کے ذریعہ ابلیس نے انسانی معاشرے میں فسادات کا ایک سہ گیر جال پھیلا دیا۔ چنانچہ اس ہمہ گیر جال کے بنیادی پہلو درج ذیل ہیں:

(۱) فساد تولید غیر انسانی — اس کا تعلق ملک اور جنوں اور انسانوں سے تھا جس کا نتیجہ انواع و اقسام کی نیم انسانی مخلوقات کی پیدائش تھی۔

(۲) فساد تولید انسانی — اس کا تعلق آدمی مرد و عورت کے مابین خلاف اخلاق رشتوں سے پیدا ہونے والا فساد ہے جس کا بنیادی عنصر زنا تھا۔

(۳) فساد علوم انسانی — اس فساد نے تقریباً تمام علوم میں فساد کے دروازے کھول دیئے۔

(۴) فساد عملیت — یہ فساد کسی بھی کام کرنے کی عملیت (Method) میں

در آنے والا فساد ہے۔

(۵) فساد عقیدہ — یہ فساد شرک اور کفر سے متعلق ہے۔ اس فساد کے ذریعہ پوری دنیا

شرک سے بھر دی گئی۔

(۶) فساد عبادت — عقیدہ سے آگے جا کر عبادت کرنے کے طریقوں سے متعلق

یہ فساد ہے جو دراصل دین کے مقابلے میں مذہب (Religion) کی بنیاد ہے جس کی اصل وہم (Superstition) ہے۔

(۷) فساد طریقہ حیات — یہ فسادات کا وہ ہمہ گیر سلسلہ ہے جس میں زندگی

گزارنے کے طریقوں، ثقافت اور تمدن سے متعلق فسادات ہیں۔

- (۸) فساد کاشتکاری حیوان بانی و شکار — یہ وہ فسادات ہیں جن کا تعلق زمین سے کاشت کرنے کے تعلق سے ہے۔ یا ان ذرائع سے جہاں سے انسان کو غذا حاصل ہوتی ہے۔
- (۹) فساد کاروبار و تجارت — یہ وہ فسادات ہیں جن کا تعلق ہر طرح کے تبادلہ مال سے ہے۔

- (۱۰) فساد مال — یہ وہ فسادات ہیں جو مال سے متعلق ہیں۔
- (۱۱) فساد خاتمہ نسل آدم — یہ فساد کی وہ قسم ہے جس کا لازمی نتیجہ رفتہ رفتہ زمین پر نسل آدم کا خاتمہ تھا۔

مرحلہ دوم

ابلیس کے پیدا کردہ فساد کے نتیجے میں نسل آدم جباروں، نفلوں، ایووں، نفروں اور عفریتوں سے بھر گئی۔ اس کے علاوہ زندگی کے ہر شعبے میں فساد پیدا ہو گیا۔ اس میں مومنین کا ذکر کیا پوری نسل انسانی تباہی کے دہانے پر پہنچ گئی۔ ان خلاف انسان، نیم انسان، عدم انسان ذی روحوں نے جن کی مرغوب چیز خونریزی تھی — باہمی خونریزی کا ہولناک سلسلہ شروع کر دیا۔ ایک صحیفہ عتیق کی ایک عبارت اس ہولناک صورت حال کا غیر معمولی نقشہ کھینچتی ہے جس کا ذکر نہایت بلیغ طریقے سے قرآن نے کیا ہے:

وَمَكْرُوا مَكْرًا كَبَارًا۔

اس صحیفہ عتیقہ کے الفاظ ہیں:

”میکال اور جبرئیل نے نیچے زمین کی طرف دیکھا اور پایا کہ پوری زمین انسانی خون سے رنگین ہو گئی ہے اور ہر طرف فساد ہی فساد ہے تو انہوں نے آپس میں کہا: زمین تو انسانوں سے خالی ہوئی جاتی ہے اور انسانوں کی کراہ عرش کے دروازے تک سنائی دے رہی ہے اور اے مقرب ملائکہ انسانی خون تم کو پکار رہے ہیں کہ تم ان کی فریاد اللہ رب العزت تک پہنچاؤ۔“

یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ اس وقت روئے زمین پر صرف چند ہزار انسان ہی بستے ہوں گے۔ آج پائی جانے والی بہت سی غلط فہمیوں میں سے ایک غلطی فہمی یہ بھی ہے کہ انسانی آبادی

مسلل بڑھ رہی ہے اور آج ۶ ارب ہو گئی ہے اور ہزاروں سال قبل نہایت کم ہو گئی۔ انسانی آبادی ہی نہیں یہ تہذیبیں بھی کئی بار روئے ارض پر بڑھیں اور کم ہوئیں۔ حتیٰ کہ آج کی اس مغربی تہذیب کے علمبردار جو یہ خیال رکھتے ہیں کہ ان کی موجودہ مغربی تہذیب کی طرح کوئی تہذیب روئے ارض پر کبھی برپا نہیں ہوئی اور ان سے زیادہ تو وہ مشرقی فاتر العقل نام نہاد عقلمند جو ان اہل مغرب سے زیادہ مغربی تہذیب کے نشے میں بدست ہوئے جاتے ہیں اور اس مغربی تہذیب کی عظمت کی قصیدہ خوانی کرتے ہیں — وہ انسانی تاریخ سے چنداں واقفیت نہیں رکھتے۔ چنانچہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ روئے ارض پر ابلیس نے کیسی خوں ریزی کروائی ہو گی کہ زمین خون سے بھر گئی۔ اور نسل آدم کے فنا ہو جانے کا خوف پیدا ہو گیا۔

مرحلہ سوم :

ابلیس کی پوری کارروائی اپنے اندر بڑی ہمہ گیری اور نظم رکھتی تھی۔ چنانچہ پوری روئے زمین کی صورت حال کتنی فساد آلودہ اور ہولناک ہو چکی تھی اس کا اندازہ حضرت نوح علیہ السلام کی پوری حیات میں حق کی علمبرداری کے تعلق سے ان کی کوششوں کا جائزہ بخوبی پیش کرتا ہے اگر دیکھا جائے تو حضرت نوح علیہ السلام کی دعاء بڑی معنی خیز ہے:

بد کردار سے بد کردار، ظالم سے ظالم اور گمراہ سے گمراہ قوم (واضح ہو کہ یہاں قوم سے مراد پوری نسل انسانی ہے) کا نبی کسی رحم دل ماں سے لاکھوں گنا زیادہ اپنی قوم کے بیٹوں کے لیے رحم دل ہوتا ہے اور یہاں تو پوری انسانیت کا معاملہ تھا۔ لیکن جب ایک نبی نے اور وہ بھی حضرت نوح علیہ السلام جیسے اولوالعزم نبی نے یہ کہا ہو گا:

وقال نوح رب لا تذر علی الارض من الکفرین دیارا انک ان

تذرہم یضلوا عبادک ولا یلدوا الا فاجرا کفارا۔ (نوح: ۲۶-۲۷)

ترجمہ: اور کہا نوح نے اے رب! نہ چھوڑیو زمین پر کفر کرنے والوں کا ایک

گھر بسے، والا۔ بے شک اگر تو چھوڑ دے گا ان کو بہکائیں گے تیرے بندوں کو جو جنس گے

سو بد کردار کافر۔

یہاں انک ان تذرہم لیضلوا عبادک ولا یلدوا الا فاجرا کفارا بہت معنی خیز ہے۔ حضرت نوحؑ کیسے جان سکتے تھے کہ اگر یہ لوگ بچ گئے تو صرف لوگوں کو گمراہ کریں گے اور ان

سے صرف فاجر اور کفار ہی پیدا ہوں گے۔ دراصل ابلیس نے اس ہمہ گیر فساد کے ذریعہ پوری نسل انسانی کو تقریباً کلی طور پر (Almost Entirely) فاسد (Contaminated) کر دیا تھا۔ یا تو زمین ان جباروں، نفلوں، الیوں، نفروں اور عفریتوں سے بھر گئی تھی یا جو دونوں جانب سے انسان بنے وہ بیشتر بے اصل، ولد الزنا اور غیر صالح تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ پوری روئے ارض پر صرف چند نفوس قدسیہ باقی بچ گئے تھے۔ اس سے فساد کی ہمہ گیری اور ہر طرف پھیلے کشت و خون اور شرک و بد عملی و بد اخلاقی اور بے حیائی کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔

چنانچہ پوری نسل انسانی کو بچانے کا ایک ہی راستہ رہ گیا تھا اور وہ تھا پوری روئے زمین سے فساد کا خاتمہ۔ کسی نبی کی طرف سے عذاب عام کی دعاء اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کی قبولیت معمولی بات نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت عامہ سے الگ بات ہے۔ ظاہر ہے اس کے لیے جتنے غیر معمولی شرائط ہوں گے وہ سب پورے ہو گئے ہوں گے تب کہیں جا کر یہ دعاء قابل جواز بنی ہوگی اور قبول ہوئی ہوگی۔ چنانچہ قرآن نے اس ساری صورت حال کا نہایت وضاحت سے نقشہ کھینچا ہے:

ہم نے نوح کو اس کی قوم (عالم انسانیت) کی طرف بھیجا کہ (اے نوح) اپنی قوم کو خبردار کر دے اس سے قتل کہ ان پر دردناک عذاب آجائے۔ اس نے کہا ”اے میری قوم! میں تمہارے لیے کھلا خبردار کرنے والا ہوں۔ (تم کو آگاہ کرتا ہوں) کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو اللہ تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا اور یہ جو تمہیں ڈھیل دی جا رہی ہے یہ ایک مقرر مدت تک کے لیے ہے (چنانچہ) حقیقت یہ ہے کہ جب اللہ کا مقرر کردہ وقت آجائے گا تو مالا نہیں جاسکتا۔ کاش تمہیں اس کا علم ہوتا۔“

اس نے عرض کیا ”اے میرے رب! میں نے اپنی قوم کو شب و روز پکارا مگر میری پکار نے ان کے فرار کو اور بڑھایا، اور جب بھی میں نے ان کو بلایا تاکہ تو انہیں معاف کر دے انہوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑوں سے منہ ڈھانک لیے اور اپنی ردش پر اڑ گئے اور اپنی عظمت و طاقت کے بڑے بڑے دعوے کیے۔ پھر میں نے ان کو ہانکے پکارے دعوت دی پھر میں نے علانیہ بھی ان کی تبلیغ کی پھر میں نے (ان کے فساد اور آنے والے عذاب کی حقیقت کو) عام لوگوں کے لیے علانیہ طور پر اور (خاص) لوگوں کے لیے ایک ایک کے پاس جا کر بیان کیا۔ سب سے کہا اپنے رب سے معافی مانگ لو بے شک (معافی مانگ لینے والوں کو) وہ ہمیشہ معاف کرتا رہا ہے۔“

ظاہر ہے لوگوں نے نہ صرف یہ کہ حضرت نوح کی بات نہ مانی ہوگی بلکہ انہیں جھٹلایا اور ان کا جینا دو بھر کر دیا ہوگا۔ یہاں قرآن نے ایک نہایت لطیف بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ مرحلہ چہارم کے بعد ابلیس کے منصوبے کے دو بنیادی ستون تھے:

(۱) انفجار فساد نسل (Explosion of Genetic Perversion)

(۲) انفجار فساد علم (Explosion of Knowledge or Science Perversion)

چونکہ ان دونوں فسادات کی حالت انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی بن گئی تھی اور ان فسادات کی بنیاد پر پورے کے پورے نظام حیات مرتب ہو گئے تھے۔ حکومتیں، ادارے، علمی مراکز، مجالس، معاشرتی آداب و قوانین سب کے سب انہیں فسادات کی بنیاد پر استوار ہو چکے تھے اور ان فسادات نے Civilization کا روپ لے لیا تھا لہذا جب حضرت نوح نے انتخاب کیا تو لوگوں کا عام تاثر یہی تھا کہ یہ فرسودہ باتیں ہیں اور کسی سنگی کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ اور یہ کہ انہیں بکنے دو۔ زندگی کی انفرادی ترقی اور اجتماعی ارتقاء کے لیے یہ امور جنہیں یہ شخص فسادات کہہ رہا ہے ایک حقیقت ہیں۔ انہیں بھلا کوئی کیسے چھوڑ دے۔ اور یہ کہ آج ساری ترقی انہیں لوازم کی جڑ لایفک ہے۔ چنانچہ قرآن نے اس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

قَالَ نوح رب انهم عصوني واتبعوا من لم يزدده ماله وولده الا

خسارا۔ (نوح: ۲۱)

ترجمہ: کہا نوح نے اے رب میرے! انہوں نے میرا کھانا مانا اور مانا ایسے کا

جس کو اس کے مال اور اولاد سے اور زیادہ ہو ٹوٹا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح کی دعاء قبول فرمائی۔ اور اس 'مکر کبار' اور 'فساد عظیم' کے خاتمے کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ قرآن، احادیث اور دیگر صحائف سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کارروائی دو مرحلہ جاتی تھی۔ پہلے مرحلے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے مقرب ملائکہ کو بھیجا تا کہ وہ ان ملک ملائکہ اور جن ملائکہ کو جو ان فسادات کے مراکز تھے پکڑا جائے اور ان کو مقید کر دیا جائے۔ چنانچہ ان ملائکہ ملک و جن کو حضرت جبرئیل اور میکال اور دیگر ملائکہ نے گرفتار کر لیا اور اسی زمین یا اس کے اطراف میں انہیں مقید کر دیا۔

احادیث مبارکہ میں جن شیاطین کے بارے میں کہا گیا ہے اور انہیں دو مخصوص ناموں

سے درج کیا گیا ہے غالباً وہ یہی ملائکہ ملک و جن ہیں۔ یہ دو نام ہیں:

(۱) الشیاطین الملجمة عن الناس۔

(۲) الشیاطین المجلبة علی الناس۔

یہ وہی شیاطین ہیں جنہیں دجال اکبر کی آمد کے وقت آزاد کر دیا جائے گا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کے مقرب ملائکہ نے ان تمام باغی ملائکہ کو گرفتار کر کے مقید کر دیا۔ اور اس طرح زمین فساد کے ان آئمہ سے محفوظ ہو گئی۔

اس کارروائی کے بعد خاتمے کی دوسری کارروائی کا آغاز ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح

کو حکم دیا:

واصنع الفلک بلعیننا ووحینا ولا تخاطبنی فی الذین ظلموا

انہم مغرقون۔ (ہود: ۳۷)

ترجمہ: اور بنا کشتی رو برو ہمارے اور ہمارے حکم سے اور نہ بات کر مجھ سے

ظالموں کے حق میں یہ بے شک غرق ہوں گے۔

بلاشبہ ”باعیننا ووحینا“ میں معافی کی ایک ایسی دنیا آباد ہے جس کا برائے نام ذکر بھی اس بحث کو مزید طویل دے دے گا اس لیے اس سے صرف نظر کرنا ہی مناسب ہے۔ لیکن اس آیت میں ایک ایسی بات مضمون ہے جس کا تعلق اس کتاب کے مقصد تصنیف سے راست ہے، اس لیے ان شاء اللہ کتاب کے آخر میں ہم اس سے کچھ بحث کریں گے۔

چنانچہ عذاب آگیا اور جب پانی زمین سے ابلنے اور آسمان سے برسنے لگا تو حضرت نوح تقریباً سو سے کم مومنین اور جانوروں کے جوڑوں کو لے کر کشتی پر سوار ہو گئے۔ قرآن نے اس کا ذکر اس طرح کیا:

حتى اذا جاء امرنا وفار التنور قلنا احمل فیہا من کل زوجین

اثنین واهلک الامن سبق علیہ القول ومن آمن وما آمن معہ الا قليل۔

(ہود: ۴۰)

ترجمہ: یہاں تک کہ جب پہنچا حکم ہمارا اور جوش مارا زمین نے کہا ہم نے

چڑھالے کشتی میں ہر قسم کا جوڑا دو عدد اور اپنے لوگوں کو مگر جس پر پہلے ہو چکا ہے حکم اور

سب ایمان والوں کو اور ایمان نہ لائے تھے اس کے ساتھ مگر تھوڑے۔

اور جب سیلاب ختم ہوا اور اہل کشتی زمین پر اترے تو روئے زمین سے اس کشتی میں سوار لوگوں اور جانوروں کے سوا ہر مفسد اور فاسد کا خاتمہ ہو گیا تھا سوائے ان کے جن کو خود اللہ نے کسی مصلحت کے تحت مرنے سے بچا لیا ہو۔

حضرت نوح کی دعا محض مفسدوں کے خاتمے کی تھی۔ انہوں نے سیلاب کی دعا نہیں کی ہوگی۔ عذاب کے تعلق سے سنت اللہ بہت غور طلب ہے۔ اس سنت کی حقیقت پر تھوڑی بحث ان شاء اللہ اس جگہ ہوگی جب ہم حضرت عیسیٰ ابن مریم کے ذریعہ یا جوج و ماجوج کے خاتمے کے بعد آنے والے سیلاب پر بحث کریں گے۔

اس عذاب کے ذریعہ پوری روئے زمین پر پھیلے ہوئے فساد اور اس کے جینیاتی (Genetic) مفاسد سے جو واضح ہے کہ جانداروں اور انسانوں میں پوری طرح پھیل چکے تھے — زمین کو پاک کر دیا گیا۔ یہ فساد کتنا ہمہ گیر تھا کہ گویا اس کشتی میں محفوظ لوگوں اور جانداروں کے سوا ہر ذی روح فاسد ہو چکی تھی۔ اس سے اس کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مرحلہ چہارم کے بعد پیدا ہوئے والا فساد کتنا مہیب تھا جس کو قرآن نے مکر کبار کہا ہے۔

گزشتہ صرف تین سو سالوں کے اندر (1687-2000 A.D) جو فساد روئے زمین پر پیدا ہوا ہے اور جس نے آج پورے Biotic اور abiotic موجودات کو فساد بنادیا ہے اس کا علم رکھنے والے حضرات اس فساد کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ ابلیس نے پورے کرہ ارض پر مافوق البشری سماوی قوتوں کے ذریعہ جو کائناتی جنگ عظیم چھیڑ رکھی تھی اور جس نے پورے کرہ کو فساد سے بھر کر وہاں کے ہر نظام کو تہہ و بالا کر دیا تھا اس کا اللہ تعالیٰ نے کلی خاتمہ کر دیا۔ اس طرح مرحلہ پنجم کا پہلا حصہ اختتام کو پہنچا جو ابلیس کے لیے بہت بڑی شکست تھی۔

یہ وہ دوسری عظیم فتح تھی جو آدم کی اولاد کو ملی اور دوسری بڑی شکست تھی جس سے ابلیس دو چار ہوا اور ہر دو جانب اس کے بڑے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ جن کا مختصر جائزہ لینا برحمل معلوم ہوتا ہے۔

ابلیس اور ابلیسی منصوبے پر اثرات:

ابلیس اور ابلیسی منصوبے پر اس شکست کے اثرات بڑے گہرے پڑے۔ چوتھے مرحلے میں

جو بنیادی اور دور رس اثر — ابلیس کے منصوبے پر پڑا وہ یہ تھا کہ ابلیس زیر زمین حیوانی قوتوں سے کائنات کے دور آخر یعنی الساعۃ کے مرحلے کی شروعات تک محروم کر دیا گیا اور اس کی یہ فوج معطل ہو کر رہ گئی۔ اس کے بعد اس نے ملائکہ کو گمراہ اور انسانوں کے خلاف متحرک (Mobilise) کیا۔ چنانچہ مرحلہ پنجم کا بنیادی پہلو ابلیس کو ملائکہ کی ممکنہ قوت سے محروم کرنا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس کارروائی کا بنیادی مقصد —

- (۱) باغی ملائکہ سے ابلیس کو محروم کرنا اور ملائکہ میں اس کے متحرک ہونے کا سد باب کرنا اور
 - (۲) ملائکہ کے ذریعہ روئے زمین پر پیدا کردہ جینیاتی (Genetic) فساد کو ختم کرنا تھا۔
- چنانچہ اس کارروائی کے ذریعہ ابلیس کو ملائکہ پر تصرف سے کم از کم الساعۃ سے قبل تک کے لیے محروم کر دیا گیا۔ اس طرح ابلیس کے دوبارہ اگر پوری طرح منقطع نہیں ہوئے تو کم از کم معطل ضرور ہو گئے۔ اور اسکی کارکردگی اور قوت کار میں واضح طور پر کمی آئی۔
- آدم اور منصوبہ آدم پر اثرات :

مرحلہ پنجم میں وقوع میں آنے والا یہ واقعہ آدم پر بھی غیر معمولی اثرات کا حامل ہوا۔ جو درج ذیل ہیں:

- (۱) اہل کشتی کے سوا ساری روئے زمین انسانوں اور بری جانداروں سے خالی ہو چکی تھی۔ اب حضرت نوح اور باقیماندہ لوگوں کو ایک طرح سے روئے زمین پر از سر نو زندگی شروع کرنی تھی۔

- (۲) بلاشبہ جو لوگ بچ گئے تھے وہ ان تمام مفاسد سے جو مرحلہ چہارم کے بعد پیدا ہوئے تھے محفوظ تھے۔ لہذا روئے ارض پر ایک صالح جینیاتی عہد کا آغاز ہوا۔

- (۳) مرحلہ پنجم کے اس واقعہ تک کے تجربے نے اہل حق کو کچھ دور رس فیصلے کرنے کی طرف متوجہ کیا بلاشبہ یہ فیصلے اتنے اہم تھے کہ انہوں نے معرکہ خیر و شر کو نیا بعد (Dimension) دے دیا۔ چنانچہ ان فیصلوں کا کیا جانا عمودی ارتقاء کے ساتھ ساتھ کمیاتی۔ عروج (Vertical development with quantum Jump) بھی تھا۔

اس تبدیلی کو سمجھنے کے لیے چند حقائق کا جاننا ضروری ہے:

اب تک معرکہ خیر و شر کا تجربہ یہ رہا تھا کہ آدم مرحلہ اول سے مرحلہ پنجم تک معمول محض کی طرح تھا۔ یعنی جنگ کی صورت یہ رہی تھی کہ ابلیس حملہ آور ہوتا تھا، حملے کے تعلق سے وہ کسی حدود کا پابند نہ تھا۔ وہ جیسے چاہتا، جب چاہتا اور جس ہتھیار سے چاہتا حملہ آور ہوتا اور دوسری طرف آدم کی حالت یہ تھی وہ صرف اپنا دفاع کرتا تھا۔ ظاہر ہے دفاع خود اپنی جگہ شکست ہے۔ طویل عرصے تک دفاع کرنے والا پیچھے ہٹتے ہٹتے بالآخر اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ اگر دیکھا جائے تو پہلے مرحلے میں وہ جن چیزوں سے لڑ رہا تھا اور جس موقف کو رد کر رہا تھا آخر میں اسی چیز کے لیے لڑنا اور اسی موقف کا دفاع کرنا شروع کر دیتا ہے۔ دفاع کرنے والے فریق کا یہی مقدر ہے۔ طویل عرصے تک دفع کرنا پہلے ہی مرحلے میں سمجھوتہ کر لینے سے زیادہ تباہ کن ہوتا ہے۔ چنانچہ آدم کو اب تک کی جنگ میں اسی صورت حال کا سامنا تھا۔ اور ایسا لگ رہا تھا کہ آدم مستقل دفاع کرنے کے باوجود تدریجاً ہارنا جا رہا ہے۔

دوسری طرف اس دفاع نے آدم کی ساری صلاحیتوں کو دفاع کے محاذ پر جھونک دیا تھا اور طویل عرصے تک دفاع جھنجھلاہٹ پیدا کرتا ہے اور دفاع کرنے والوں میں کمزور اعصاب کے لوگوں میں دشمن کے لیے جذبات میں سرد مہری حتیٰ کہ میلان تک پیدا کر دیتا ہے اور بعض لوگ دشمن سے ولایت قائم کرنے کو بھی برا سمجھنا تو دور کی بات ہے اسے ناگزیر سمجھنے لگتے ہیں۔ یہی صورت حال بنی آدم میں پیدا ہو چکی تھی۔ اس کے افراد ابلیس کی طرف میلان رکھنے لگے تھے چنانچہ اس صورت حال نے بنی آدم کو مزید کمزور کر دیا۔ لیکن اس کا سب سے برا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ دفاع ہی اصل حیات بن کر رہ گیا اور وہ بھی 'معمول محض' بن کر اور آدم کا وہ منصوبہ جو اس کا حقیقی منصوبہ ہو سکتا تھا یعنی اپنی سابقہ حیثیت کی بحالی (Restoration of Al-Jannah Status) اور خلافت کبریٰ کا حصول (Acquisition of Khilafat -e- Kubra) کلی طور پر طاق نسیان میں چلے گئے۔

قوم نوح : مابعد طوفان : 5500 قبل مسیح

طوفان نوح میں بعض روایتوں کے مطابق چالیس شبانہ روز پانی زمین سے ابلتا اور آسمان سے برستار ہا اور ساری زمین پر تباہی ہی تباہی کا سماں تھا۔ بعض روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح کی کشتی تقریباً دس مہینوں تک پانی پر چلتی رہی گویا پوری روئے زمین تقریباً دس مہینوں تک ڈوبی رہی اور کشتی اس پر تیرتی رہی اور بالآخر ایک اونچی جگہ کسی پہاڑ سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ قرآن نے اس پہاڑ کو جودی کہا ہے۔ 'جودیا جودی' دراصل کسی بھی اونچی جگہ کو کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اونچی جگہ کوئی پہاڑ ہی ہو گی۔ اس کی تعین نہیں کہ وہ اونچی جگہ کہاں واقع تھی۔ تاہم اس تعلق سے دو روایات پائی جاتی ہیں جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ یا تو وہ جگہ آرمینیا میں کوہ ارارات (Ararat Mountains) کی کوئی چوٹی تھی یا وہ جگہ Urartu تھی۔ روایات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہاں سے حضرت نوح جنوب کی طرف بڑھے جو نسبتاً نشیبی علاقہ ہے اور اس طرح انسانی آبادی دجلہ و فرات کے ساتھ پھیلتے پھیلتے جنوبی عراق تک پہنچ گئی۔ اور چند سو سالوں کے بعد ایک نئی تہذیب کے آثار پیدا ہونا شروع ہو گئے جو تقریباً ایک سے ڈیڑھ ہزار سال کے اندر اندر طوفان نوح میں تباہ ہو جانے والی تہذیب کی وارث بن کر ابھری۔ یہی وہ تہذیب ہے جس کے ابتدائی پانچ سو سال سے لے کر سات سو سال کو سمیری (Sumerian) اور بقیہ ہزار سال کو سمیری۔ عکادی (Sumero- Akkadian) تہذیب کہتے ہیں۔

طوفان نوح کے مابعد برپا ہونے والی تہذیب دراصل یہی سمیری (Sumerian) تہذیب ہے۔ جس کی وارث عکادی تہذیب ہوئی اور اس لیے اس تہذیب کو قرآن نے 'خلفاء من بعد قوم نوح' کے نام سے پکارا ہے۔

چونکہ مابعد طوفان نوح کا زمانہ عبوری ہے اس لیے یہاں صرف اس تبدیلی اور اس کے مضمرات کا ذکر زیادہ ضروری اور مفید ہو گا۔ حضرت نوح کے انتقال کے بعد عروج پذیر ہونے والی تہذیب کا ذکر مرحلہ ششم کے ذیل میں ان شاء اللہ ہو گا۔

معرکہ خیر و شر کی تاریخ میں حضرت نوح علی نبینا الصلوٰۃ والسلام اس اعتبار سے ایک

انقلاب لے کر آئے۔ وہ اس جنگ میں ایک موڑ (Turning Point) ثابت ہوئے۔ اگر ایسا کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ حضرت نوح دوبارہ مبعوث فرمائے گئے۔

ان کی پہلی بعثت کا مقصد اب تک کی مدت میں چلے آرہے معرکہ خیر و شر کو جس میں خیر تقریباً مکمل تباہی کے دہانے پر آگیا تھا مثبت انجام تک پہنچانا اور اہل خیر کو مکمل تباہی سے بچالینا تھا۔

ان کی دوسری بعثت کا مقصد معرکہ خیر و شر کے اگلے مرحلے میں اہل خیر کی از سر نو افزائش اور صف بندی، خیر کے پورے فلسفہ جنگ کو از سر نو مرتب کرنا جس میں بنیادی مقصد صرف ابلیس سے دفاع کرنا ہی نہ ہو بلکہ رضائے حق کی تکمیل یعنی خلافت کبریٰ کے حصول کے لیے آدم کی حیثیت کی بحالی بھی ہو۔ ظاہر ہے یہی اللہ کی رضا تھی۔

قرآن کے بیان سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سیلاب کو اور اس کے بعد کشتی میں بچا لیے گئے اہل حق کے زمین پر اترنے کو الجنتہ سے آدم کا زمین پر اترنا قرار دیا۔ واقعہ اس سے مختلف بھی نہ تھا، زمین ہر طرح سے اسی طرح پاک کر دی گئی تھی جیسی حضرت آدم کے زمین پر اترنے کے وقت تھی۔ چنانچہ قرآن نے کہا:

قِيلَ يٰ نُوحُ اهْبِطْ بِسَلْمٍ مِّنَّا وَبَرَكَاتٍ عَلَيْنَا وَعَلَىٰ أُمَمٍ مِّمَّنْ مَعَكَ .

(ہود: ۴۸)

ترجمہ: حکم ہوا اے نوح! اتر سلامتی کے ساتھ ہماری طرف سے اور برکتوں کے ساتھ تجھ پر اور ان گروہوں پر جو تیرے ساتھ ہیں۔

چنانچہ حضرت نوح نے بعد سیلاب اسی نصب العین کے ساتھ کام کا آغاز کیا۔ اب معرکہ خیر و شر میں خیر کا پورا فلسفہ عمل کا خلاصہ درج ذیل نکات میں بیان کیا جاسکتا ہے:

(۱) دفاع براہ اقدام: ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب تک اس ابلیس کے تعلق سے بنیادی منہج

يٰ بَنِي آدَمُ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ كَمَا أَخْرَجَ أَبَوَيْكُم مِّنَ الْجَنَّةِ .

(اعراف: ۲۷)

ترجمہ: اے اولاد آدم کی! نہ فتنہ میں مبتلا کرے تم کو شیطان جیسا کہ اس نے

نکال باہر کیا تمہارے ماں باپ کو جنت سے۔

تھا۔ لیکن حضرت نوح نئی آباد کاری کے بعد اس میں اساسی تبدیلی کی طرف مگازن

ہوئے۔ اور اس فکر میں ایک اور بعد (Dimension) کا اضافہ ہو گیا۔ اور وہ بعد تھا الشیطان کو دشمن بنانے کا جس کا ذکر قرآن نے اس طرح کیا ہے:

ان الشیطان لکم عدو فاتخذوه عدوا۔ (فاطر: ۶)

ترجمہ: تحقیق شیطان تمہارا دشمن ہے سو تم بھی بنا لو اس کو دشمن۔

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ یہ فیصلہ صرف اصولی حد تک تھا۔ عملی اقدامات کے لیے اس وقت اہل حق روئے زمین پر اس قوت کے مالک نہیں ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ اصولی منہج جو مقرر کیا گیا بعد کے دنوں میں ترقی پذیر ہوا اور آنحضور ﷺ کی ذات اقدس پر درجہ کمال کو پہنچ گیا۔ اسی لیے قرآن نے اس پورے منہج کو اس طرح نوح سے شروع کر کے آنحضور ﷺ پر ختم کیا ہے کہ اس کا پورا نقشہ ارتقاء سامنے آ جاتا ہے:

تشرع لکم من الدین ما وصی بہ نوحا والذی اوحینا الیک وما وصینا بہ ابراہیم وموسى وعيسى ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ۔
(الشوریٰ: ۱۳)

ترجمہ: راہ ڈال دی تمہارے لیے دین میں وہی جس کا حکم کیا تھا نوح کو اور جس کا حکم بھیجا ہم نے تیری طرف اور جس کا حکم کیا ہم نے ابراہیم کو اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو یہ کہ قائم رکھو دین کو اور اختلاف نہ ڈالو اس میں۔

واضح ہو کہ اس آیت میں پہلے 'وصی بہ' اور 'اوحینا' پھر 'وصینا بہ' اور ان کے بعد، 'و' کے ذریعہ موسیٰ اور عیسیٰ کا عطف یہ محض الفاظ کی سجاوٹ نہیں بلکہ معانی کی ایک دنیا ہے جن میں خیر و شر کے اس جانگداز لڑائی میں گروہ خیر میں آنے والے ان عدیم النظیر مراحل کی نشاندہی پٹکی جاتی ہے جو فیصلہ کن ہوئے۔ ہم اختصار کو مد نظر رکھنے کے سبب اس مرحلے میں ان پر روشنی ڈالنے سے قاصر ہیں ممکن ہے ان میں کچھ باتیں اپنے اپنے محل پر زیر بحث آجائیں۔

(۲) بحالی آدم کے اقدامات: لیکن حضرت نوح علیہ السلام کی سب بڑی انقلابی کوشش دراصل بحالی حیثیت آدم کے تعلق سے تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اب تک کے تجربوں نے یہی ثابت کیا کہ بحالی حیثیت آدم کے بغیر انسان کے لیے خلافت کبریٰ کا حصول تو بڑی بات ہے ابلیس کے مکر و کید سے دفاع کرنا بھی مشکل ہے۔ اس لیے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ طوفان نوح کے بعد حضرت نوح کی سربراہی میں گروہ حق کی اولین ترجیح قرار پائی بحالی حیثیت آدم۔

”اگر دقت نظر سے غور کیا جائے تو حضرت نوح سے حضرت ابراہیم تک بطور خاص اور حضرت عیسیٰ تک بطور عام گروہ حق کی بنیادی ترجیح بحالی حیثیت آدم ہی رہی۔
 اس طرح اس مرحلہ پنجم کا اختتام حق کی فتح کے ساتھ ساتھ اہل حق کے طریقہ جنگ میں عمودی اور انقلابی تبدیلی کے اجراء سے ہوا۔

مرحلہ ششم : ابلیس کے تہذیبی حملے کا دور : 4000 قبل مسیح

مرحلہ ششم کا آغاز کئی اعتبار سے غیر معمولی اور نادر تھا۔ اگر مرحلہ پنجم کا نام:

(۱) کائناتی شیطانی قوتوں کے ذریعہ روئے زمین پر آدمیت کے مکمل خاتمے کے لیے

کائناتی جنگ کا عہد (Age of Cosmic War with Cosmic Satanic

Forces for Total Annihilation of Mankind of Earth)

(۲) یا کل روئے زمین پر مکمل تباہی کا عہد۔ (Age of Total Earthly

Landscape Annihilation) رکھا جائے۔

تو مرحلہ ششم کا نام اس اعتبار سے:

(۱) تہذیبوں کے مکمل یا جزوی تباہی کا عہد

(Age of Total and Partial Civilisation Annihilation) ہونا

چاہئے۔ اگر اس مرحلہ ششم کو اس طرح موسوم کیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر معرکہ

خیر و شر کی صورت حال نچلے درجے (Scale down) پر کیسے آگئی۔

اس صورت حال کو سمجھنے کے لیے دونوں متصادم قوتوں کی صورت حال کا اندازہ

کرنا ضروری ہے، جس نے اس جنگ کے درجے میں تبدیلی اور تصادم کی سطح کو کم کرنے میں براہ

راست اثر ڈالا۔

(۱) آدمی پہلو :

ہر چند کہ مرحلہ پنجم میں آدمی کو کھلی کامیابی ملی تھی اور ابلیس کی سماوی فوج درہم برہم

ہو گئی لیکن یہ مرحلہ آدم کے لیے بھی کم سنگین ثابت نہیں ہوا۔ پوری روئے زمین سے بلاشبہ فساد

کا خاتمہ ہو گیا تھا لیکن خود بنی آدم کا بھی ان نفوس کو چھوڑ کر جو اس کشتی میں محفوظ رہ گئے تھے کلی

صفایا ہو گیا تھا۔ اور گویا پوری روئے زمین پر انسانی معاشرت کی تشکیل کی شروعات از سر نو کرنی تھی

جسے (From the Scratch) کہتے ہیں۔

چنانچہ اپنی تمام نئی حکمت عملی کے ساتھ حضرت نوح نے طوفان کے بعد زندگی کے سفر کا آغاز از سر نو کیا۔ اور ہر چند کہ حضرت نوح طوفان کے بعد تقریباً ساڑھے تین سو سال تک حیات رہے اور نو سو پچاس سال کی عمر میں انتقال فرمایا لیکن ان کی توجہ بنیادی طور پر درج ذیل امور پر مرکوز رہی:

(۱) زمین پر صالح نسل کی افزائش، آباد کاری اور اس کی تربیت۔

(۲) آدم کی سابقہ حیثیت کی بحالی کی کوشش۔

(۳) ابلیس کے مکر و کید سے دفاع۔

چنانچہ یہ وہ اسباب تھے جنہوں نے اس نئی صورت حال میں آدمی پہلو کو مشغول رکھا۔
 (۲) ابلیسی پہلو : ابلیس مرحلہ پنجم میں دوبار شکست سے ہمکنار ہوا تھا۔ اور اس بار اس کا دوسرا بازو معطل کر دیا گیا یعنی اس کی صدیوں کی محنتوں سے تیار کردہ ملائکہ کی سماوی فوج کا گرفتار کر لیا جانا۔ اور اس تعلق سے ایسے انتظامات کا روبہ عمل آنا کہ آئندہ سماوی مدد سے ابلیس کا تقریباً محروم کر دیا جانا۔ زیر زمین حیوانی فوج اور سماوی ملکوتی فوج کے معطل کر دیئے جانے نے ابلیس کو بے حد کمزور کر دیا۔ اب اس کے پاس دو ہی راستے کھلے رہ گئے تھے۔ پہلا راستہ مخلوقات جن کو جو آدم کی تخلیق سے پہلے آنے والے عذاب میں بچ گئے تھے اور اب ان ہزاروں سالوں میں ان کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی متحرک کرنا۔ اور دوسرے اس نئی آباد کاری کے بعد بڑھنے والی آدمی آبادی میں انسانوں جو ابلیس کے دام شر میں آگئے اور۔ یقیناً ان کی تعداد جنوں کے مقابلے میں گرچہ کم تھی متحرک کرنا۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت نوح کے بعد آنحضور ﷺ کی بعثت تک معرکہ خیر و شر میں شر کے دو پہلو ابھرے ہوئے ملتے ہیں:

(۱) جنوں کا اولویاتی کردار

(۲) انسانوں کا ثانوی کردار

یہ ہیں وہ حالات جن میں مرحلہ ششم کا آغاز ہوا اور بظاہر ایسا لگتا ہے کہ معرکہ خیر و شر میں لڑائی کی سطح، قوت اور وسعت میں انحطاط (Scale down) آیا ہے جبکہ ایسا صرف ظاہر کے

اعتبار سے ہے۔ ورنہ اپنے اندرون میں یہ جنگ زیادہ، ہمہ گیر اور پیچیدہ ہو کر موت و حیات کی جنگ میں بدل گئی تھی۔

اس مرحلے میں ابلیس نے تمام بچے کھچے علوم، ہتھیاروں اور تجربوں کو جمع کیا اور ان دو طبقوں سے از سر نو اپنی فوج تیار کرنے کے منصوبے کا آغاز کیا۔ اب اس نے دوہری حکمت عملی (Double Strategy) اختیار کی یعنی اپنی دونوں فوجوں کو خلط ملط کرنے کے بجائے بالکل الگ دو فوجوں کی شکل میں بلکہ دو نظاموں کی شکل میں انہیں ترتیب دیا۔ ایسا لگتا ہے کہ صرف Command Control کی سطح پر دونوں میں اس نے Coordination کا نظام قائم کر دیا۔ اس مرحلے کی دوسری سب سے عجیب بات یہ ہے کہ اس نے اپنے تمام منصوبوں کے اعتبار سے انتہائی افکار استہ اختیار کیا۔ اس طرح چند ہی صدیوں کے اندر اندر معرکہ خیر و شر بھی اپنے تصادم کے نقطہ عروج پر پہنچ چکا تھا۔

چنانچہ مرحلہ ششم کو ہم چار حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ جو یکے بعد دیگرے تین تہذیبوں پر مشتمل ہیں۔ یہ تہذیبیں اس وقت کی انسانی دنیا میں نظام (Order) لے کر قائم ہوئیں اور جملہ انسانی آبادی پر ان کا نظام رائج ہوا پھر معرکہ خیر و شر کے نتیجے میں یہ تہذیبیں شر کا ساتھ دینے کے سبب اپنے منطقی انجام کو پہنچیں۔ یہ تینوں عہد دراصل معرکہ خیر و شر کے اس عہد کی نمائندگی کرتے ہیں جب پوری کی پوری تہذیب یعنی نظام (Order) فنا کر دیئے گئے چنانچہ مجموعی طور پر اس پورے عہد کو تہذیبوں کے کلی خاتمے کا عہد (Age of Total Civilization Annihilation) کہا جاسکتا ہے۔

پہلا تہذیبی معرکہ : عاد : 3500 قبل مسیح

حضرت ھود علیہ السلام

مرحلہ ششم میں معرکہ خیر و شر ابلیس کی نئی حکمت عملیوں کی ساتھ شروع ہوا۔ چونکہ اب ابلیس کی حیوانی اور سماوی فوج معطل ہو کر رہ گئی تھی اس لیے اس نے اپنی حکمت عملی کو جنوں اور انسانوں کی بنیادوں پر از سر نو تشکیل دینے کی کوشش کی اور اس طرح روئے زمین پر تہذیبوں کے دور کا آغاز ہوا۔ یہ دراصل اس کی اس نئی حکمت عملی کا حصہ تھا جہاں اس نے آدم کو شکست دینے کے لیے ایسی حکمت عملی کی تو وسیع کرنا ضروری سمجھا جو زیادہ سے زیادہ ارضی اور انسانی (Earth-based & Human-based) ہو۔ چنانچہ اس کی کوشش کا ایک لازمی حصہ ایسے انسانی معاشرے کی تشکیل بن گیا جو خدا کا دشمن، آدم کے بنیادی موقف اور خلافت کبریٰ سے نا آشنا بلکہ اس کا منکر اور ابلیس کا ہم نوا ہو۔ لہذا اس کے لیے اب اس نے ایسے معاشروں کی تشکیل پر زور دیا جن میں انہیں بنیادوں پر سارا نظام حیات تشکیل دیا جاتا ہو۔ جن کی تلخیص ذیل میں اس طرح درج کی جاسکتی ہے:

- | | |
|------------------------|---------------------------------------|
| (۱) خلافت کبریٰ مخالف | عقائد پر مشتمل معاشرہ |
| (۲) خلافت کبریٰ مخالف | عبادات پر مشتمل معاشرہ |
| (۳) خلافت کبریٰ مخالف | علوم پر مشتمل معاشرہ |
| (۴) خلافت کبریٰ مخالف | تولید پر مشتمل معاشرہ |
| (۵) خلافت کبریٰ مخالف | معاشرت یعنی طرز رہائش پر مشتمل معاشرہ |
| (۶) خلافت کبریٰ مخالف | ثقافت پر مشتمل معاشرہ |
| (۷) خلافت کبریٰ مخالف | علمی تخلیقات پر مشتمل معاشرہ |
| (۸) خلافت کبریٰ مخالف | کاروبار حیات پر مشتمل معاشرہ |
| (۹) خلافت کبریٰ مخالف | مال و اکتساب مال پر مشتمل معاشرہ |
| (۱۰) خلافت کبریٰ مخالف | آداب پر مشتمل معاشرہ |

(۱۱) خلافت کبریٰ مخالف تصور آخرت پر مشتمل معاشرہ

چنانچہ طوفان نوح کے ذریعہ کی گئی صفائی اور تطہیر کے بعد جہاں ایک طرف حضرت نوح کے ذریعہ طاہر و مطہر انسانی معاشرے کی تشکیل کی عملی کوشش کی گئی اور پھر ان کے بعد اللہ تعالیٰ نے ہزاروں کی تعداد میں ایسے انبیاء بھیجے جنہوں نے ہر انسانی آبادی میں جا کر انہیں خطوط پر صالح افراد اور صالح معاشروں کی تشکیل کی کوشش کی۔ وہیں ابلیس نے اس کے بالکل مخالف سمت میں نجس اور نجاس معاشرت کی تعمیر کی کوشش کی۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان تمام انسانی معاشروں میں انبیاء عموماً ہادی اور بشیر بنا کر بھیجے گئے اور جیسا کہ یہ بات عرض کی گئی کہ ایسے ہادی اور بشیر انبیاء کی تعداد ہزاروں میں ہے جو ہر جگہ اور ہر قوم میں تشریف لائے۔ قرآن نے ایسے ہی انبیاء کے متعلق فرمایا ہے:

(۱) لکل قوم ہاد۔ (الرعد: ۷)

ترجمہ: (دنیا کی) ہر قوم کے لیے ہادی بھیجے گئے۔

(۲) وما لرسولنا من رسول الا بلسان قومہ لیبین لہم۔ (ابراہیم: ۴)

ترجمہ: اور کوئی رسول نہیں بھیجا ہم نے مگر زبان بولنے والا اپنی قوم کی تاکہ

ان پر واضح کر دے۔

لیکن تاریخ انسانی سے معلوم ہوتا ہے اور جس پر سب سے بڑی شہادت قرآن کی ہے کہ ابلیس نے اپنے مکر اور کید کا استعمال کر کے اہل حق کی زندگی روئے زمین پر اجیرن کر دی۔ اور ان انسانی معاشروں کو فساد سے بھر دیا۔ اور روئے ارض پر ایسے معاشرے اور ان کا قائم کردہ نظام (Order) غالب آ گیا جو آدمی کے بنیادی نصب العین کا مخالف تھا۔

یہی وہ گھڑی تھی جب اللہ تعالیٰ نے ایسے انبیاء بھیجے جو نذیر تھے۔ یہ وہ انبیاء ہوتے تھے جو کسی نظام کو جو فساد کی راہ پر چل پڑتا تھا متنبہ کرتے اور واپس خیر کی طرف بلانے کی کوشش کرتے۔ بے شمار انسانی معاشروں نے حق پر چل کر اور خلافت کبریٰ کے حصول کو اپنا مقصد حیات قرار دے کر زندگی بسر کی اور آدمیت کے اس عظیم مقصد سے وابستہ رہتے ہوئے اور انسانیت کی اس عظیم مہم میں پیش قدمی کرتے ہوئے نئے سنگ میل قائم کیے۔ لیکن وہیں چند معاشرے ایسے بھی ہوئے جنہیں ابلیس اچک لینے میں کامیاب ہوا اور ابلیس نے ان کی تشکیل فساد پیدا کرنے، فساد کو

پھیلائے اور پوری انسانیت کو تباہ کر دینے کے لیے کی۔ ظاہر ہے کہ ایسی تشکیل کی کوشش ابلیس کے خاص منصوبے کا حصہ تھی۔ لہذا اس نے اس طرح کی تشکیل میں اپنی حکمت کا، اپنے علوم کا جو اس نے حاصل کیے تھے اور تجربات کا جو اس معرکے میں اسے میسر آئے تھے بھرپور استعمال کیا۔ چنانچہ یہی دیکھا گیا کہ جب کوئی قوم ابلیس کے شکنجہ میں پوری طرح آگئی یا اس میں ابلیس نے وہ خصوصیتیں دیکھیں جو اس کے مشن کے اعتبار سے بڑی خوش آئند اور امید افزاء تھیں تو اس نے انہیں علو (Supermacy) کی راہ پر ڈالا۔ یہاں غور کرنے کی جو بات ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں وہ تمام قومیں جو عموماً کی راہ پر گئی وہ دراصل وہ قومیں تھیں جو فساد کی طرف مائل ہو کر ابلیس کا آلہ کار بن گئیں۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد جو قوم قوم نوح کی وارث بن کر ابھری اور علو کی راہ پر گئی وہ قوم عاد تھی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ قوم عاد کون سی قوم تھی کب انھی اور اس کا عالمی نظام کہاں سے کہاں تک پھیلا ہوا تھا؟ اور اس نے ابلیس سے وابستہ ہو کر روئے ارض پر کیا فساد برپا کیا؟

اس عاجز کی تحقیق کے مطابق قرآن نے جس قوم کو قوم عاد یعنی حضرت ہود علیہ السلام کی قوم کہا ہے وہ دراصل وہی قوم ہے جسے تاریخ میں عقاد (Akkad) قوم کہتے ہیں اور جس کی تہذیب کو (Sumerian - Akkadian Civilization) یا مختصراً سمیری تہذیب Sumerian Civilization کہتے ہیں۔

اس عاجز کی تحقیق کے مطابق اس قوم کا نام عاد دراصل عا + ا + د ہے۔ جو بنیادی طور پر Cuneiform رسم الخط میں دو دو حرفوں کا مجموعہ ہے جسے بعض لوگوں نے Ak + Kad اور بعض نے Ag - ade پڑھا اور بعض لوگوں نے Ag - ade میں g کا وہ تلفظ کیا جو عموماً انگریزی کے علاوہ تمام یورپی زبانوں میں رائج ل کا تلفظ ہے یعنی ی اس طرح اس کا تلفظ Ay - ade ہوگا جو دراصل عار یا عاد کا ہی دوسرا تلفظ ہے۔^{۱۳}

قوم عاد ایسا لگتا ہے کہ بابل کے شمالی ضلع کے دارالسلطنت عاد کے نام سے مشہور ہوئی۔ واضح ہو کہ یہ قوم ایک سپر پاور تھی اور اس کا اقتدار مغرب میں مصر تک، شمال میں آرمینیا اور ایشیائے کوچک تک جنوب میں یمن تک اور مشرق میں دریائے سندھ تک تھا۔ اس عاجز کو پورا یقین ہے کہ وادی سندھ کی تہذیب دراصل عاد کی تہذیب یا اس کی توسیع تھی۔

قرآن کی تصریح کے مطابق یہ قوم قوم نوح کے بعد برپا ہوئی۔ قرآن کا بیان ہے:

او عجبتم ان جاءکم ذکر من ربکم علی رجل منکم لینذرکم
واذکروا اذ جعلکم خلفاء من بعد قوم نوح وزادکم فی الخلق بصطة.
(الاعراف : ۶۹)

ترجمہ: کیا تم کو تعجب ہوا کہ آئی تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی
طرف سے ایک شخص کی زبانی جو تم ہی میں سے تھے تاکہ تم کو ڈرائے اور یاد کرو جبکہ تم کو
مقتدر کر دیا پیچھے قوم نوح کے اور زیادہ کر دیا تمہارے بدن کا پھیلاؤ۔
یہاں تین باتیں قابل ذکر ہیں:

- (۱) یہ پورا بیان اور اس کا اظہار متنبہ کرنے کے لیے ہے۔
- (۲) اس میں قوم عاد کو یاد دلایا گیا ہے کہ وہ قوم نوح کی وارث ہے۔
- (۳) اس میں اس قوم کو یہ بھی یاد دلایا گیا ہے کہ اسے اسی طرح اقتدار طاقت، اور ترقی ملی
ہے جیسی قوم نوح کو ملی تھی۔

اس سے جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس جگہ قوم نوح سے مراد طوفان نوح کے بعد
ارتقاء پانے والی قوم قطعاً نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ قوم نوح ہے جس میں حضرت نوح نذیر بنا کر
بھیجے گئے تھے اور یہ وہ قوم تھی جو بے پناہ طاقت و قوت اور علمی و فنی ترقی کی حامل تھی۔ اور بعد کی
تاریخ نے گواہی دی ہے کہ یہ قوم اپنی اسی روش پر چلتی ہوئی بالآخر عذاب کا شکار ہو گئی۔

چنانچہ ہر اعتبار سے یہ سمیری عقادی قوم جسے قرآن نے قوم عاد کہا ہے قوم نوح یعنی وہ
قوم جن کے الگ الگ ناموں میں سے ایک نام Atlantis بھی ہے کی ہم رہتہ کی حاصل کرنے لگی
تھی۔ اور اسکی روش موجودہ اصطلاح میں Super Power بننے اور بنے رہنے اور اسی کے
تعلق سے پوری روئے زمین پر خدا بن کر قہر ڈھانے کی ہو گئی تھی۔ اور یہی وہ وقت ہے جب
حضرت ہود علیہ السلام اسے متنبہ کرنے کے لیے مبعوث فرمائے گئے۔

یوں تو ابلیس کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ انسانی معاشرے میں فساد کا انفجار
(Explosion of Perversion) کر دے لیکن اس میں بھی مختلف قومیں اپنی مخصوص
کمزوریوں کے سبب بطور خاص بعض فسادات میں خود اپنے اندر کے دیگر فسادات کے مقابلے میں
زیادہ نمایاں ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ ابلیس نے قوم عاد میں عام فسادات

کے علاوہ وہ کون سا مخصوص فساد پیدا کیا جو اس قوم کی خصوصیت تھی۔ چنانچہ قرآن نے اس کا ذکر کرتے ہوئے چند خاص باتوں کی طرف نشاندہی کی ہے۔

(۱) قال قد وقع علیکم من ربکم رجس۔ (الاعراف : ۷۱)
ترجمہ: کہا تم پر واقع ہو چکا ہے تمہارے رب کی طرف سے گندگی کا عذاب۔
(۲) وغضب (الاعراف : ۷۱)
ترجمہ: اور غضب

(۳) اتجادلوننی فی اسماء سمیتموھا انتم و آبائکم ما نزل اللہ بہا من سلطان۔ (الاعراف : ۷۱)
ترجمہ: کیوں جھگڑتے ہو مجھ سے ان ناموں پر کہ رکھ لیے ہیں تم نے اور تمہارے قائدین نے نہیں اتاری اللہ نے ان کی کوئی سند۔

(۴) مالکم من الہ غیرہ۔ ان انتم الا مفترون۔ (ہود : ۵۰)
ترجمہ: کوئی تمہارا حاکم نہیں سوائے اس کے۔ تم سب جھوٹ کہتے ہو۔
(۵) ما من دابة الا هو آخذ بناصیتھا۔ (ہود : ۵۶)
ترجمہ: زمین پر رہنے والا ایسا کوئی نہیں جس کی چوٹی اللہ کے ہاتھ میں نہ ہو۔
(۶) اتبنون بكل ریع آية تعبثون۔ (الشعراء : ۱۲۸)
ترجمہ: کیا بناتے ہو ہر اونچی زمین پر یادگار فضول کاموں کے لیے۔
(۷) وتتخذون مصانع لعلکم تخلدون۔ (الشعراء : ۱۲۱)
ترجمہ: اور بناتے ہو بڑے کارخانے شاید تم امر ہو جاؤ۔
(۸) واذا بطشتم بطشتم جبارین۔ (الشعراء : ۱۳۰)
ترجمہ: اور جب (کمزوروں پر) پنجہ مارتے ہو تو پنجہ مارتے ہو جباروں کی

طرح۔

(۹) ان هذا الا خلق الاولین۔ (الشعراء : ۱۲۷)
ترجمہ: (اور ہم لوگ جو کچھ کرتے ہیں ٹھیک کرتے ہیں) یہی (شایان شان اہل یعنی) حصہ ہے ان کا جو سب سے آگے ہیں (یعنی سب سے بڑی طاقت کے مالک ہیں۔

ان تمام آیات سے جو باتیں سامنے آتی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

(۱) وہ قوم سیاسی اور عسکری قوت کے اعتبار سے نقطہ عروج پر پہنچ گئی تھی۔ اور سیاسی اور

عسکری سپر پاور تھی۔

(۲) علمی اور فنی یعنی سائنسی اور تکنیکی اعتبار سے وہ نقطہ عروج پر پہنچ گئی تھی۔

(۳) وہ ایک صنعتی تہذیب تھی۔ یعنی Heavy Industries اور High tech

نظام پر قائم تہذیب تھی۔

(۴) اس قوم کی حکومتوں، اہل کاروں اور لوگوں کی ذہنیت یہ ہو گئی تھی کہ ہر وہ کام جو وہ

کریں جائز اور ٹھیک ہے اور ہر وہ کام جو ان کی مرضی کے خلاف یا ان کے حق میں نہ ہو وہ اپنی جگہ کتنا

ہی درست جائز اور نیک کام کیوں نہ ہو غلط کام، جرم بلکہ دہشت گردی ہے۔ ہر وہ فیصلہ جو وہ اپنے

مفاد میں کریں درست اور ہر وہ فیصلہ جس سے ان کے مفاد کو نقصان پہنچتا ہے ناجائز۔ جو ان کی

مرضی کے خلاف کام کرے اس کے ساتھ رحم کا کوئی معاملہ نہ کیا جائے۔ ایسی تمام اقوام پر وہ اپنے

دیو بیکل لاؤ لشکر لے کر پل پڑتے تھے۔

یہ تھی وہ صورت حال اور روش جس میں اللہ تعالیٰ نے نبی نذیر کے اعتبار سے حضرت ہود

علیہ السلام کو بھیجا۔ آپ نے انہیں سمجھایا اور ان پر حجت پوری کر دی۔ لیکن وہ جس نشے میں چور

تھے ان کی سمجھ میں صرف ایک بات آتی تھی کہ روئے زمین پر ان کا ہاتھ پکڑنے والا کون ہے؟

کون ہے جو ان کی راہ میں پر مارنے کی بھی جرأت کرے؟

ظاہر ہے اس روش نے اس پورے علاقے کو بلکہ پوری روئے زمین پر جس پر یہ نظام

(Order) نافذ تھا فساد سے بھر دیا ہو گا۔ ہر طرف ظلم ہی ظلم ہو گا۔ ابھی تو صرف اس فساد کا بطور

خاص ذکر کیا گیا جو ان میں نمایاں تھا۔ ورنہ جہاں تک کل فساد کی بات ہے تو وہ ہمہ گیر تھا۔ چنانچہ

نشے میں چور ایسے معاشرے کا وہی انجام ہوتا ہے جو اس کی تباہی سے پہلے سامنے آتا ہے لیکن وہ

اسے دیکھ کر بھی نہیں چونکتا۔ یہی وہ بات ہے جس کی طرف حضرت ہود نے اشارہ کیا تھا۔ یعنی

رجس اور غضب۔ موجودہ زمانے میں اگر اس کی مثال پیش کی جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح

(۱) پہلی صدیوں میں ساری دنیا میں پلگ اور طاعون کی وبا کا پھوٹ پڑنا ہوا۔

(۲) بیسویں صدی کے اوائل میں ملیریا، ٹی بی اور سرطان کا زور ہوا۔

(۳) بیسویں صدی کے اواخر میں پوری روئے زمین میں biotic اور abiotic فساد

(Disorder) کی شروعات ہوئی اور Green house effect وغیرہ کے نتائج برآمد ہوئے۔

(۴) بیسویں صدی کی ستر کی دہائی میں Aids کا پھوٹ پڑنا ہوا۔

(۵) بیسویں صدی کے ۹۰ کی دہائی میں تمام Anti-biotic ادویہ سے جراثیم کے Immune ہونے اور جسم کے React نہ کرنے کی شروعات ہوئی اور اب پھر ٹی بی، ملیریا، چیچک اور تمام وہ بیماریاں جو کل تقریباً ختم ہو گئی تھیں زیادہ قوی ہو کر عود کر آئی ہیں۔

پورے، کرہ ارض میں عدم توازن برپا ہو گیا ہے اور موسم بدل گئے ہیں۔ جغرافیائی بے اعتدالیاں شرع ہو گئی ہیں اور جس کے سبب طرح طرح کی جغرافیائی خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ مثلاً: توسیع صحراء، (Expansion of Desert)، سیم اور تھور کا بڑھ جانا (Salination)

(of the Earth) اور

(۷) پورے کرہ ارض سے پانی کی سطح کا نیچے چلا جانا وغیرہ۔

(۸) وہ فساد عظیم جو عنقریب Genetically Produced Food سے پیدا ہوگا جس کے مظاہر اب مغرب میں نظر آنے لگے ہیں۔

یہی وہ صورت حال تھی جس پر حضرت ہود علیہ السلام نے انہیں متنبہ کیا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ بالآخر اللہ کا عذاب آگیا اور پوری تہذیب فنا کر دی گئی۔ آج بھی تاریخ دانوں کے لیے یہ حیرت کی بات ہے کہ اس درجے کی اعلیٰ تہذیب جو علوم، سائنس، تکنالوجی اور، ایجادات اور عسکری قوت میں عدیم النظیر تھی۔ بیک جنبش وقت کیسے صفحہ ہستی سے مٹ گئی۔ قرآن نے اس پوری صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:

ولما جاء امرنا نجينا هودا والذين آمنوا معه برحمة منا

ونجيناهم من عذاب غليظ وتلك عاد جحدوا بايت ربهم وعصوا

رسله واتبعوا امر كل جبار عنيد. واتبعوا في هذه الدنيا لعنة ويوم

القيامة الا ان عادا كفروا ربهم الا بعد العاد قوم هود (هود: ۵۸-۶۰)

ترجمہ: اور جب پہنچا ہمارا حکم بچا دیا ہم نے ہود کو اور جو لوگ ایمان لائے تھے

اور اس کے ساتھ اپنی رحمت سے اور بچا دیا ان کو ایک بھاری عذاب سے اور یہ تھے عاد کہ

منکر ہوئے اپنے رب کی باتوں کے اور نہ مانا اس کے رسولوں کو اور مانا حکم ان کا جو جبار

تھے دشمن اور پیچھے سے آئی ان کو اس دنیا میں پھنکار اور قیامت کے دن بھی سن لو عاد

منکر ہوئے اپنے رب سے سن لو پھنکار ہے عاد کو جو قوم تھی ہود کی۔

دوسرا تہذیبی معرکہ : شمود : 2700 قبل مسیح

حضرت صالح علیہ السلام

معرکہ خیر و شر کے مرحلہ ششم کا دوسرا تہذیبی معرکہ قوم شمود نے برپا کیا۔ تہذیبی معرکے میں ابلیس کی حکمت عملی کا دوسرا آلہ کار اور نمائندہ قوم شمود بنی۔ حکمت عملی کے لحاظ سے اپنی انفرادیت اور خصوصیت کے باوجود قوم شمود قوم عاد کا ثنی تھی جو خود قوم نوح کی ثنی اور وارث تھی۔

اس عاجز کی تحقیق کے مطابق یہ تہذیب شمود وہی تہذیب ہے جسے تاریخ میں مصر کی پہلی تہذیب یا وادی نیل کی تہذیب (The Nile Valley Civilization) بلکہ مخصوص طور پر عہد اہرام (The Pyramid Age) کہتے ہیں۔ جس کا زمانہ 3200 قبل مسیح سے 2500 قبل مسیح تک ہے اور اس کا نقطہ عروج 2700 قبل مسیح سے لے کر 2500 قبل مسیح تک ہے۔ یہ وہی تہذیب ہے جس کا دائرہ اقتدار مصر، جزیرہ سینامع مغربی شمالی جزیرہ العرب، فلسطین، شام، ایشیائے کوچک، عراق کے جنوبی ساحل تک تھا۔ اور ان ایام میں جو اس تہذیب کا نقطہ عروج تھا اس کا نظام (Order) ساری دنیا میں قائم تھا۔ قرآن نے ان کے تعلق سے جو تصریحات کی ہیں ان سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اس تہذیب کی صورت حال کیا تھی؟ اس نے فساد کی طرف کیسے رخ کیا؟ کیا کیا فسادات اس نے پیدا کیے؟ اور اس تہذیب کے خدو خال کیا تھے؟ قرآن کا بیان ہے:

(۱) ھو انشاکم من الارض واستعمرکم فیہا۔ (ہود: ۶۱)

ترجمہ: اسی نے برپا کیا تم کو زمین سے اور بسایا تم کو اس میں۔

(۲) واذکرو انجعلکم خلفاء من بعد عاد وبواکم فی الارض

(الاعراف: ۷۴)

ترجمہ: اور یاد کرو جب کہ تم کو عاد کے پیچھے (زمین کا) وارث بنادیا اور زمین

میں تم کو مستحکم کر دیا۔

(۳) تتخذون من سہولہا قصورا۔ (الاعراف: ۷۴)

ترجمہ: سطح زمین پر تم مکانات بناتے ہو۔

(۴) وتفتحون الجبال بیوتا۔ (الاعراف: ۷۴)

ترجمہ: اور پہاڑوں کو تراش کر گھر۔

(۵) وثمود الذین جابو الصخرة بالواد۔ (الفجر: ۹)

ترجمہ: اور ثمود کے ساتھ جنہوں نے تراش پتھروں کو وادی میں۔

(۶) اترکون فی ہننا آمین۔ فی جنت وعیون وزروع ونخل

طلعہا ہضیم۔ (الشعراء: ۱۳۶-۱۳۸)

ترجمہ: کیا چھوڑے رکھیں گے تم کو یہاں کی چیزوں میں بے کھٹکے، باغوں میں

اور چشموں میں اور کھیتوں میں اور کھجوروں میں جن کا گابھا ملائم ہے۔

(۷) فاذکروا الا الله ولا تعثوا فی الارض مفسدین۔

(الاعراف: ۷۴)

ترجمہ: سویا کرو احسان اللہ کے اور مت مچاتے پھر زمین میں فساد۔

(۸) قال الملأ الذین استکبروا من قومہ۔ (الاعراف: ۷۵)

ترجمہ: کہنے لگے سردار جو متکبر تھے اس کی قوم میں۔

(۹) ولا تطیعوا امر المسرفین الذین یفسدون فی الارض ولا

یصلحون۔ (الشعراء: ۱۵۱-۱۵۲)

ترجمہ: اور نہ مانو حکم بے باک لوگوں کا جو خرابی کرتے ہیں زمین میں اور

اصلاح نہیں کرتے۔

(۱۰) قالوا یصلح قد کنت فینا مرجواً قبل هذا۔ (ہود: ۶۲)

ترجمہ: بولے اے صالح! تجھ سے تو ہم کو (بڑی) توقعات تھیں اس سے پہلے۔

(۱۱) انی لکم رسول امین فاتقوا الله واطیعون وما اسئلكم

علیہ من اجر۔ (الشعراء: ۱۳۳-۱۳۵)

ترجمہ: میں تمہارے پاس اصل پیغام لانے والا ہوں۔ سو ڈرو اللہ سے اور

میرا کہا مانو اور نہیں مانگتا ہوں تم سے اس پر کچھ بدلہ۔

(۱۲) للذین استضعفوا لمن آمن منهم اتعلمون ان صلحاً مرسل

من ربہ قالوا انا بما ارسل بہ مؤمنون قال الذین استکبروا انا بالذی

آمنتم بہ کفرون۔ (الاعراف: ۷۵)

ترجمہ: کمزور کر دیئے گئے لوگوں کو کہ جو ان میں ایمان لا چکے تھے کیا تم کو

یقین ہے کہ صالح کو بھیجا ہے اس کے رب نے بولے ہم کو تو جو وہ لے کر آیا ہے اس پر

یقین ہے۔ کہنے لگے وہ لوگ جو متکبر تھے جس پر تم کو یقین ہے ہم اس کو نہیں مانتے۔
 (۱۳) ویقوم هذه ناقة الله لكم آية فذروها تاكل في الارض
 الله لا تمسوها بسوء فياخذكم عذاب قريب۔ (ہود: ۶۴)
 ترجمہ: اور اے قوم! یہ اونٹنی ہے اللہ کی تمہارے لیے نشانی سو چھوڑ دو اس کو
 کھاتی پھرے اللہ کی زمین پر اور مت ہاتھ لگاؤ اس کو بری طرح پھر تم کو آپکڑے گا
 عذاب بہت جلد۔

(۱۴) كذبت ثمود بطغوها اذا نبعث اشقها۔ (الشعشع: ۱۱-۱۲)
 ترجمہ: جھٹلایا ثمود نے اپنی سرکشی سے جب اٹھ کھڑا ہوا ان میں کا بڑا بد بخت۔
 (۱۵) فكذبوه فعقروها (الشعشع: ۱۴)
 ترجمہ: پھر انہوں نے جھٹلایا اس کو پھر اس کو (اونٹنی) کو انہوں نے کاٹ ڈالا۔
 (۱۶) فعقروها فاصبحوا ندمين۔ (الشعراء: ۱۵۷)
 ترجمہ: انہوں نے اسے کاٹ ڈالا ایک کرے۔

ان تمام تفصیلات کو دیکھنے سے درج ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

- (۱) ثمود کو عاد کے بعد قوت اور غلبہ ملا اور وہ لوگ تقریباً ان تمام علاقوں پر چھا گئے جن پر
 کل عاد کا قبضہ تھا فرق یہ تھا کہ ان کی مرکزیت مصر میں قائم تھی۔
- (۲) ثمود ایک بہت بڑی سیاسی قوت اور سیاسی انفراسٹرکچر کی حامل قوم تھی۔
- (۳) ان کا عسکری اسٹرکچر، عسکری قوت اور ٹکنالوجی بہت ترقی یافتہ تھی۔
- (۴) سائنس اور ٹکنالوجی میں اس قوم نے حیرت ناک ترقی حاصل کر لی تھی جس کا
 مشاہدہ آج بھی کیا جاسکتا ہے اور جس کا اعتراف آج بھی کرنا پڑتا ہے۔

(۵) اس تہذیب نے High-Tech اور High-Tech Agro-Farming

Husbandry کا نظام قائم کر رکھا تھا۔

(۶) ان کے پاس High Tech Industrial Base تھا۔

(۷) انہوں نے High Tech Earth Movers & Architecture میں

درجہ کمال حاصل کر لیا تھا۔

(۸) یہ نظام صنعتی، زرعی اور Metro polis Culture کا نمونہ بن گیا تھا۔

(۹) اس نظام میں بہت بڑا دانش ورانہ قاعدہ (Intellectual Base) قائم ہو گیا

تھا۔

(۰) یہ ساری ترقیاں فساد کی طرف مہمیز کرنے والی ضرور بنیں لیکن فساد کا اصل محرک سیاسی اصولی مفکر (Political Theorists) بنے جنہوں نے اقتدار کے نشے میں ہونے والے مظالم کو سند ہوا عطا کرنے کی کوشش کی۔

(۱۱) حضرت صالح علیہ السلام ان میں نبی نذیر بنا کر بھیجے گئے۔ لیکن قرآن یہاں چند اور تفصیلات سے آگاہ کرتا ہے۔

(۱) حضرت صالح سے قبل اللہ تعالیٰ نے ان میں ہادی انبیاء بھیجے اور انہوں نے پوری تفصیل سے ان کو حق پر قائم فلسفہ حیات اور فلسفہ کائنات (World View) سمجھانے کی کوشش کی چنانچہ قرآن نے فرمایا:

(۱) واما ثمود فهدینہم (حم السجدہ: ۱۷)

ترجمہ: اور وہ جو ثمود تھے سو ہم نے ان کو راہ بتلائی۔

لیکن اس قوم کے غالب مفکروں اور اہل اقتدار اور ملاء نے اس ہدایت کو ماننے اور ان پر عملدرآمد سے انکار کر دیا: قرآن کا ارشاد ہے:

فاستحبوا العمی علی الہدی۔ (حم السجدہ: ۱۷)

ترجمہ: پھر ان کو خوش لگا اندھا راہ سوجھنے سے۔

تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کے انجام بد سے باخبر کرنے کے لیے یکے بعد دیگرے کئی انبیاء نذیر بھیجے۔

(۲) فان اعرضوا فقل انذرتکم صنعۃ مثل صنعۃ عاد و ثمود اذ

جلہ تہم الرسل من بین ایدہم ومن خلفہم۔ (حم السجدہ: ۱۳-۱۴)

ترجمہ: پھر اگر وہ ٹلاں تو تو کہہ میں نے ڈراوا دے دیا تم کو ایک سخت عذاب

کا جیسے عذاب آیا عاد اور ثمود پر۔ جب آئے ان کے پاس رسول آگے سے اور پیچھے سے۔

لیکن ان سب کے باوجود وہ فساد سے منھ موڑنے کو راضی نہ ہوئے اور شتر بے مہار کی طرح اپنی طاقت کے نشے میں اور بھی ہٹ دھرمی پر تل گئے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت صالح کو فیصل نبی نذیر کے اعتبار سے مبعوث فرمایا۔ قرآن نے اس قوم کی نبض پر انگلی رکھتے ہوئے جائزہ لیا ہے:

(۱) للذین استضعفوا لمن آمن منهم۔ (الاعراف: ۷۵)

ترجمہ: کمزور بنا کر رکھ دیئے گئے لوگوں کو کہ جو ان میں ایمان لائے تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تہذیب بنیادی طور پر دو طبقوں پر مشتمل تھی۔ عوام کی کثیر تعداد غلام بنا کر رکھ دی گئی تھی اور ایک طبقہ خواہ اس کا Denomination نسلی ہو یا مذہبی، لسانی ہو یا فکری اس پر طبقاتی بنیادوں پر غالب آگیا تھا۔ اور سارا فکری و عملی نظام اسی کا چل رہا تھا۔ ممکن ہے دیگر انبیاء جو ان میں بھیجے گئے ہوں وہ ان مظلوم طبقات کے لوگ ہوں جن کو اس غالب فکری طبقے نے رد کر دیا ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت صالح کو بھیجا۔ قرآن کے بیان سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت صالح مقتدر طبقے سے بلکہ کسی بہت ہی اعلیٰ ترین طبقے سے تعلق رکھنے والے فرد تھے۔ ممکن ہے خود کسی شاہی گھرانے کا شہزادہ یا ولی عہد ہی ہوں۔ چنانچہ قرآن نے بیان کیا ہے:

قالوا یصلح قد کنت فینا مرجوا قبل هذا۔ (ہود: ۶۲)

ترجمہ: بولے کہ اے صالح! تجھ سے تو ہم کو توقعات تھیں اس سے پہلے۔

لیکن حضرت صالح نے صاف صاف کہہ دیا کہ کسی بات پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ تمہیں فساد سے ہٹنا ہو گا۔ قرآن کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تنبیہ کو سیاسی مفکرین اور اہل اقتدار نے مفاد کے مسئلے کے اعتبار سے Highlight کرنا شروع کر دیا چنانچہ حضرت صالح نے پھر تنبیہ کی: 'إني لكم رسول أمين'۔ یہاں لفظ امین سے ایک اور بات کا اشارہ ملتا ہے۔ 'امین' کے اصلی معنی امانت دار نہیں ہیں۔ امانت دار اصطلاحی معنی ہے۔ 'امین' کے لغوی اور اصلی معنی ہے اصل جو نقل نہ ہو۔ صحیح جو جعلی نہ ہو۔ یعنی Original، Pure اس لفظ امین کو سمجھنے کے لیے ابلیس کی ایک Methodology کو سمجھنا ضروری ہے۔ جس کا استعمال تاریخ انسانی میں اس نے کئی بار کیا ہے۔ اور آج بھی الگ الگ طریقوں سے کر رہا ہے۔ اس طریقہ کار کا نام ہے نقلی و جعلی تعیین کا طریقہ Dummy Identification Methodology۔

حق اور مظہر حق مثلاً کسی نبی اور آج کسی تحریک حق یا قائم حق کے اعلان حق کے ساتھ ہی ابلیس ایک طریقہ یہ بھی اپناتا ہے کہ جہاں اس فرد، فکری تحریک کو جھٹلانے اور اسے مبنی بر غلط ثابت کرنے کی کوشش ہوتی ہے وہاں اس کی بھی کوشش ہوتی ہے کہ اسی وقت اسی طرح کے

الفاظ و بیان یا نعروں یا نصب العین کے ساتھ کئی اور لوگ یا افراد کے ذریعہ تحریکیں شروع کر دی جاتی ہیں جو بیشتر جعلی اور اہل ہوی کے ذریعہ چلائی جاتی ہیں۔ اس کا بنیادی مقصد لوگوں کو کنفیوژ کرنا اور نفس مسئلہ کو الجھادینا اور اہل حق یا فرد حق کی انفرادیت کو مجروح، گدلا اور دھندلا کر دینا ہوتا ہے۔

جب انبیاء مبعوث فرمائے جاتے تھے تو انہیں صرف صریح اور علانیہ مخالفوں کا ہی سامنا نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کے علاوہ اور ان سے زیادہ ان متنبیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا جو اس وقت اسی طرح کے دعوے کے ساتھ نمودار ہوتے تھے۔ متنبی اسی طریقہ کار کی ایک واضح مثال ہے۔ یہی وہ وقت ہے جب اللہ کے انبیاء اپنی امانت Originality کا ثبوت فراہم کرتے تھے۔ اور نفوس قدسیہ اس اعتبار سے ممتاز ہوتے تھے کہ وہ اس فرق کو سمجھ کر بغیر کنفیوژ ہوئے حق کی اطاعت کرتے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ حضرت صالح کو بھی اسی صورت حال کا سامنا ہوا۔ چنانچہ آپ نے اعلان فرمایا کہ میں ان دعوے داروں کے مقابلے میں اصلی رسول ہوں۔

ملنے جلتے دعوؤں کے ساتھ وہ پروپیگنڈہ جو مفادات کے اعتبار سے کیا جا رہا تھا بے اصل تھا چنانچہ اس کا جواب اس طرح دیا گیا:

”وما اسئلكم علیہ من اجر۔ (الشعراء : ۱۳۵)

بالآخر حالات کے ارتقاء نے پورے نظام کو ایک ایسے مقام پر پہنچا دیا جسے بحران (Crisis) کہتے ہیں۔ اور اس کا سبب تھا وہ رویہ جس پر غالب طبقہ قائم ہو گیا تھا:

قال الذین استکبروا انا بالذی آمنتم به کفرون۔ (الاعراف: ۷۶)

ترجمہ: کہنے لگے وہ لوگ جو متکبر تھے جس پر تم کو یقین ہے ہم اس کو نہیں

مانتے۔

یہ بحران پوری مستکبر قوم کو وہاں لے گیا جہاں فیصلہ کن مراحل کا آغاز ہو جاتا ہے! چنانچہ حضرت صالح نے فرمایا:

”هَذَا نَاقَةُ اللَّهِ يَهِيَ اللَّهُ كِي اَوْثَنِي هِے۔

یہاں اس صورت حال کے لمحہ بہ لمحہ آگے جانے کی تفصیل بیان کرنے کی گنجائش نہیں لہذا اس آخری فیصلہ کن حصے کا مختصر جائزہ یہ بتاتا ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ پورے نظام کی حضرت

صالح نبی مذہب سے اس آخری نقطے پر ٹھن گئی اور اس ٹکراؤ کی ساری ذمہ داری شمود پر تھی کہ یہ زمین یہ وسائل یہ خزانے اللہ کے ہیں یا حکومت کے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ضد میں حکومت نے زندگی کے ہر شعبے میں ایسے عملی اقدامات کیے جن کا مقصد یہ ثابت کرنا ہو گا کہ زمین پر ان کا حکم چلتا ہے اللہ کا نہیں۔ یعنی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پوری تہذیب میں Anti-Allah اقدامات کا پوری شدت سے آغاز ہو گیا جس کے تحت ہر وہ حرمت توڑ دی گئی جو اللہ نے قائم کی تھی۔ ہر وہ حلت حرمت میں بدل دی گئی جو اللہ نے قائم کی تھی۔ اور بالآخر انہوں نے نبی کو یہ چیلنج دے دیا ہو گا کہ اگر یہ زمین اس کے دعوے کے مطابق واقعی اللہ کی ہے اور یہ کہ وہ بڑا قوت والا ہے تو اللہ، دکھائے کہ ان کے تہذیب کے مقابلے میں وہ کیا کر سکتا ہے؟ اور یہی وہ مرحلہ ہو گا جب حضرت صالح کو اللہ نے یہ معجزہ عطا فرمایا ہو گا۔ بات اہم یہ نہیں کہ وہ اونٹنی تھی؟ کہاں سے اور کیسے پیدا ہوئی؟ کہاں سے آئی؟ اور کتنا پانی پیتی تھی؟ یہ سب افسانے بھی ہو سکتے ہیں۔

بات صرف اتنی سی ہے کہ چیلنج اللہ کے اقتدار کو دیا گیا تھا۔ اس کو سمجھنے کے لیے ایک مثال

لیجئے۔

دو لوگوں میں طاقت کی کشمکش شروع ہو جائے اور بات بالآخر ایک ایسے مقام پر پہنچ جائے کہ ایک شخص اس طرح دعویٰ کرے کہ میں جو چاہوں گا کروں گا دیکھتا ہوں مجھے کون روکتا ہے۔ دوسرا کہہ دے اور کسی بھی بے حقیقت چیز کی طرف اشارہ کر کے کہہ دے مثلاً:

(۱) ذرا ایک قدم آگے بڑھا کر تو دیکھو تمہارے خاندان کو تباہ کر دوں گا۔

(۲) ذرا اس پتھر کو ہاتھ لگا کر دکھا دو۔

(۳) ذرا اس کھیت سے ایک تڑکا اٹھا کر دیکھو کیا ہوتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح اللہ نے حضرت صالح کو آگاہ کیا کہ وہ لوگوں کے سامنے کسی اونٹنی کو یہ کہہ کر پیش کر دیں کہ یہ اللہ کی اونٹنی ہے۔ ذرا کوئی اسے بری نیت سے چھو کر تو دیکھے۔ اور یہ بھی کہہ دیں کہ یہ پانی پیئے گی کوئی اسے روک کر تو دیکھے۔ یہ زمین اللہ کی ہے یہ اونٹنی اس پر گھاس چرے گی اور پئے کھائے گی اور ذرا کوئی روک کر تو دیکھے چنانچہ دراصل اس معجزہ میں عجزیہ تھا کہ وہ بظاہر ایک عام اونٹنی تھی لیکن اللہ کے رسول نے اسے اللہ کے اقتدار اعلیٰ اور جبروت کا نشان اور اسکی آیت بنا کر پیش کر دیا۔

اس عہد کے کافرین نے اپنے اقتدار کے نشے میں، اپنے سائنس اور ٹکنالوجی کی طاقت اور اپنے وسائل اور سطوت کے بھروسے پر اسے مذاق سمجھا۔ جب کہ اللہ کے رسول نے واضح کر دیا تھا:

فياخذكم عذاب قريب. (ہود: ۶۴)

ترجمہ: پھر تم کو آپکڑے گا عذاب بہت جلد۔

یعنی جو بھی اسے روکے گا یا چرنے نہیں دے گا یا اسے نقصان پہنچائے گا وہ عذاب کو دعوت دے گا اور ایسا کرنے کے فوراً بعد ہی عذاب آجائے گا۔

یہ بحران دراصل ایک طرف حضرت صالح اور اہل حق اور دوسری جانب حکومت اور مقتدر طبقے کے بیچ پیدا ہوا تھا اور ظاہر ہے کہ ایک چھوٹی سے آبادی کے سوا بقیہ لوگ الناس علی دین ملوکہم کی روش کے مطابق حکومت کے ہمنوا ہوں گے چنانچہ حکومت اور حکمران طبقے کی ہم آہنگی اور فیصلے کے نتیجے میں ایک شخص نے اس اونٹنی کو مار ڈالا۔ اور اس اونٹنی کا مارا جانا تھا کہ اللہ کے رسول نے خبردار کیا:

تمتعوا فی دارکم ثلاثۃ ایام ذلک وعد غیر مکذوب. (ہود: ۶۵)

ترجمہ: (تب کہا) فائدہ اٹھا لو اپنے گھروں میں تین دن یہ وعدہ ہے جو جھوٹا

نہ ہوگا۔

چنانچہ اللہ کا عذاب آیا اور پوری تہذیب فنا کر دی گئی۔ یہاں نہایت لطیف پہلو یہ ہے کہ اللہ کی نصرت اس آنری لمحے میں آئی جب زمین پر اہل حق کے لیے حیات کی کوئی رمت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اب یا تو اہل حق کا وہ گروہ ختم ہو جاتا یا اس کے مخالف۔ چنانچہ قرآن نے اس لطیف بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیان کیا ہے:

فلما جاء امرنا نجینا صلحا والذین آمنوا معہ برحمة منا ومن

خزی یومئذ ان ربک هو القوی العزیز. (ہود: ۶۶)

ترجمہ: پھر جب پہنچا ہمارا حکم بچا دیا ہم نے صالح کو اور جو ایمان لائے اس کے

ساتھ اپنی رحمت سے اور اس دن کی رسوائی سے بے شک تیرا رب وہی ہے زور والا

زبردست۔

ومن خزی یومئذ نہایت معنی خیز ہے۔ اونٹنی کے چیلنج کے بعد ظلم کی جس چکی کے چلنے کا

آغاز ہوا تھا اس کی ہیبت ناکی کا انجام کیا ہوتا اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو اس سے بچالیا۔ اور اس عظیم فاسد تہذیب کو جو اپنے اقتدار، طاقت اور ترقی کے نقطہ کمال پر تھی بے نشان کر دیا۔

یہ دوسری قوم تھی جو قوم نوح کے بعد اس تباہی سے دوچار ہوئی۔

تیسرا تہذیبی معرکہ : قوم لوط : 1800 قبل مسیح

حضرت لوط علیہ السلام

معرکہ خیر و شر کے مرحلہ ششم کا تیسرا تہذیبی معرکہ قوم لوط کے فساد کی صورت میں سامنے آیا۔ ابلیس نے حکمت عملی کے اس نئے لائحہ کے تحت جس پر اس نے حضرت نوح کے بعد عمل درآمد شروع کیا تھا۔ ایک بار پھر جنسی انفجار (Sexual Explosion) کا تجربہ کیا۔ اس بار یہ تجربہ بنیادی طور پر مختلف الجہات مابین انسان جنسی انفجار تھا۔

یہ جنسی انفجار ایک نظام کی صورت میں برپا کیا گیا۔ ایسا سمجھنا کہ یہ صورت حال صرف اس شہر میں تھی جسے تباہ کر دیا گیا درست نہیں۔ بلاشبہ وہ بستی تباہ کر دی گئی اور یہ بھی درست ہے کہ وہ بستی اس کامرکز تھی لیکن ایسا سمجھنا درست نہیں کہ وہ وباء صرف وہیں پھیلی ہوئی تھی۔

قرآن نے اس نئے فساد کی نظام کی جو تفصیلات بتائی ہیں ان سے اس تہذیب کے حدود اربعہ کا پتہ چلتا ہے۔ جس طرح سیاسی استعماریت کی سرحدیں سیاسی ہوتی ہیں اور معاشی استعماریت کی سرحدیں معاشی ہوتی ہیں جو سیاسی سرحدوں سے بالکل مختلف ہوتی ہیں اسی طرح تہذیبی، ثقافتی اور فیشن کی بھی سرحدیں ہوتی ہیں جو پوری طرح سیاسی اور معاشی سرحدوں سے مختلف ہوتی ہیں۔ اسے آج کی ایک مثال سے سمجھیں۔

آج مغرب اور اس کے نظام کی مرکزیت امریکہ میں قائم ہے۔ چنانچہ امریکہ کی ایک سیاسی سرحد ہے جسے ہم ریاست ہائے متحدہ امریکہ کہتے ہیں۔ یہ سرحدیں ساری دنیا میں جہاں جہاں پائی جاتی ہیں ان سے پرے اس کی سیاسی حکومت نہیں۔ لیکن جہاں تک امریکہ کے معاشی نظام کی سرحدوں کی بات ہے وہ اس کی سیاسی سرحدوں سے بہت وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ اور ان دونوں سے زیادہ تہذیبی، ثقافتی اور فیشن کی سرحدیں وسیع ہیں۔ چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ تہذیبی ثقافتی اور فیشن کی مملکت کے اعتبار سے امریکہ کے زیر نگین آج کا سارا جہاں ہے۔

ٹھیک اسی طرح جب قوم لوط اور عمل قوم لوط کا ذکر کیا جائے تو یہ تصور کرنا کہ وہ ایک شہر یا ضلع کا معاملہ تھا درست نہیں یہ تصور اسے سیاسی سرحدوں میں مقید کر دیتا ہے۔ بلاشبہ یہ چیز اس

سیاسی سرحد میں اپنے نقطہ عروج پر پائی جاتی ہوگی لیکن اس تہذیب اور تہذیبی چلن کی سرحدیں اس وقت کی ساری دنیا میں پھیلی ہوئی تھیں۔

اس مقام پر آپ اس ریفرنس کو ملاحظہ کریں جو حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو ڈرانے کے لیے بیان فرمایا تھا۔ یہ ریفرنس اس کا کھلا ثبوت ہے کہ جیسے کوئی آج میکڈاگل یا پاپ یا پیپی کی مثال دے جو امریکہ سے نکلی ہیں اور جن کا مرکز امریکہ ہے لیکن یہ ساری چیزیں آج ساری دنیا میں امریکہ کے حوالے سے ہی سہی ہر جگہ پائی جاتی ہیں اور دراصل امریکی تہذیب کی سرحدوں کا تعین کرتی ہیں۔ جہاں جہاں میکڈاگل یا پاپ یا پیپی کا چلن ہے وہ سب ممکن ہے امریکہ کے سیاسی غلام نہ ہوں لیکن اس کی تہذیبی مملکت کے زیر نگیں ضرور ہیں۔

ٹھیک اسی طرح قوم لوط کا معاملہ تھا۔ چنانچہ حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا تھا۔

وما قوم لوط منکم ببعید۔ (ہود: ۸۹)

ترجمہ: اور قوم لوط تو تم سے کچھ دور ہی نہیں۔

جب ہم سدوم بستی یا شہر یا علاقے کی تباہی کا حال بیان کرتے ہیں تو غیر ارادی طور پر ہم اس کے دائرے اور اس تہذیبی انفجار کی ہولناکی اور شاعت کو معمولی کر کے دکھانے کے مرتکب بن جاتے ہیں۔ دراصل اس تہذیب اور اس میں پیدا ہونے والے جنسی انفجار کو اس کی تہذیبی سرحدوں کی تعین کے ساتھ دیکھنا چاہئے۔ تب کہیں جا کر ہم اس صورت حال کا صحیح اندازہ لگائیں گے کہ وہ تہذیب کتنی غالب، کتنی ہمہ جہت تھی اور اس نے کتنا بڑا فساد پیدا کر دیا تھا اور وہ کیوں اور کیسے تباہ کر دی گئی؟ بلکہ اس سے بھی زیادہ اس بات کا اندازہ لگانا آسان ہو جائے گا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام (ان کا تذکرہ ان شاء اللہ تفصیل سے اپنے مقام پر آئے گا) کے عالمی لائحہ عمل (Mega-Program) کا وہ کون سا حصہ تھا جس میں حضرت لوط علیہ السلام سدوم بھیج دیئے گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے کس منصوبے کے تحت حضرت لوط کو نبی نذیر کی حیثیت سے اس علاقے میں مبعوث فرمایا۔ اور کس طرح حضرت لوط نے اس فاسد نظام پر اللہ کی حجت پوری فرمادی۔

قرآن نے دنیا میں پھیلی اس پوری تہذیب میں جنسی انفجار کا جس طرح جائزہ لیا ہے اس کی تلخیص اس طرح پیش کی جاسکتی ہے:

(۱) وَالْوَطْأُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِ أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ أَحَدٍ

من العلمین۔ (الاعراف: ۸۰)

ترجمہ: اور بھیجا لوط کو جب کہا اس نے اپنی قوم کو کیا تم کرتے ہو ایسی بے حیائی کہ تم سے آگے نہیں ہوا کوئی اس میں جہان میں۔

(۲) انکم لتاتون الرجال شهوة من دون النسأ بل انتم قوم

مصرفون۔ (الاعراف: ۸۱)

ترجمہ: تم تو ڈھوڑتے ہو مردوں پر شہوت کے مارے عورتوں کے علاوہ بلکہ تم لوگ ہو حد سے گزرنے والے۔

(۳) اتاتون الذکر ان من العلمین۔ (الشعراء: ۱۶۶)

ترجمہ: کیا تم دوڑتے ہو جہان کے مردوں پر۔

(۴) وتذرون ما خلق لکم ربکم من ازواجکم بل انتم قوم

عدون۔ (الشعراء: ۱۶۶)

ترجمہ: اور چھوڑتے ہو جو تمہارے واسطے بنا دی ہیں تمہارے رب نے تمہارے جوڑوں میں بلکہ تم لوگ ہو حد سے گزرنے والے۔

(۵) کذبت قوم لوط ن المرسلین اذ قال لهم اخوهم لوط الا

تتقون۔ انی لکم رسول امین فاتقوا الله واطيعون وما استلکم علیہ من اجر ان اجری الا علی رب العلمین۔ (الشعراء: ۱۶۰-۱۶۳)

ترجمہ: جھٹلایا لوط کی قوم نے پیغام لانے والوں کو جب کہا ان کو ان کے بھائی لوط نے، کیا تم ڈرتے نہیں۔ میں تمہارے لیے اصلی پیغام لانے والا ہوں سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہہ امانو اور مانگتا نہیں میں تم سے اس کا کچھ بدلہ۔ میرا بدلہ ہے اسی رب العالمین پر۔

(۶) قالوا لئن لم تنته یلوط لتکونن من المخرجین۔

(الشعراء: ۱۶۷)

ترجمہ: بولے اگر نہ چھوڑے گا تو اے لوط! تو تو نکال باہر کیا جائے گا۔

(۷) وما کان جواب قومہ الا ان قالوا اخرجوهم من قریبتکم

انہم اناس یتطہرون۔ (الاعراف: ۸۲)

ترجمہ: اور کچھ جواب نہ دیا اس کی قوم نے مگر یہی کہا کہ نکال باہر کرو ان کو اپنے شہر سے یہ لوگ بڑے پاک رہنا چاہتے ہیں۔

(۸) قال انی لعلکم من القالین رب نجنی واهلی مما یعملون

(الشعراء: ۱۶۸-۱۶۹)

ترجمہ: کہا میں تمہارے کام سے البتہ بیزار ہوں۔ اے رب! خلاص کر مجھ کو اور میرے لوگوں کو ان کاموں سے جو یہ کرتے ہیں۔

(۹) فلما جله آل لوط ن المرسلون۔ (الحجر: ۶۱)

ترجمہ: پھر جب پہنچے لوط کے گھر وہ بھیجے ہوئے۔

(۱۰) قال انکم قوم منکرون۔ (الحجر: ۶۲)

ترجمہ: بولا تم لوگ اجنبی سے لگتے ہو!

(۱۱) ولما جلت رسلنا لوط سئى بهم وضاق بهم ذرعاً وقال

هذا يوم عصيب۔ (ہود: ۷۷)

ترجمہ: اور جب پہنچے ہمارے بھیجے ہوئے لوط کے پاس غمگین ہوا ان کے آنے سے اور تنگ ہوا دل میں۔ اور بولا آج دن بڑا سخت ہے۔

(۱۲) وجله قومہ يهرعون اليه ومن قبل كانوا يعملون

السياط۔ (ہود: ۷۸)

ترجمہ: اور آئی اس کے پاس قوم اس کی دوڑتی بے اختیار اور آگے سے کر رہے تھے برے کام۔

(۱۳) قال يقوم هولاء بناتى هن اطهر لكم فاتقوا الله ولا

تخزون فى ضيفى۔ اليس منكم رجل رشيد۔ (ہود: ۷۸)

ترجمہ: بولا اے لوگو! کیا میری بیٹیاں نہیں ہیں؟ وہ تمہارے لیے زیادہ پاک ہیں۔ سو ڈرو تم اللہ سے اور مت رسوا کرو مجھ کو میرے مہمانوں میں۔ کیا تم میں کوئی بھی بھلا مانس نہیں۔

(۱۴) قالوا لقد علمت مالنا فى بنتك من حق وانك لتعلم ما

نريد۔ (ہود: ۷۹)

ترجمہ: بولے تو جانتا ہے ہم کو۔ تیری بیٹیوں سے کچھ غرض نہیں۔ اور تجھ کو تو معلوم ہے، تو ہم چاہتے ہیں۔

(۱۵) قال لو ان لى بكم قوة او اوى الى ركن شديد۔ (ہود: ۸۰)

ترجمہ: کہنے لگا کاش مجھ کو تمہارے مقابلے میں زور ہو تا یا جا بیٹھتا کسی مستحکم پناہ میں۔

(۱۶) قال يلو ط انا رسل ربك لن يصلوا اليك۔ (ہود: ۸۱)

ترجمہ: مہمان بولے۔ اے لوط! ہم بھیجے ہوئے ہیں تیرے رب کے۔ وہ

ہر گز تمھ کو نہ پہنچ سکیں گے۔

(۱۷) قَالُوا بَلْ جِئْنَاكَ بِمَا كُنَّا فِيهِ يَمْتَرُونَ وَأَتَيْنَكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ۔ (الحجر: ۶۳)

ترجمہ: بولے نہیں پر ہم لے کر آئے ہیں تیرے پاس وہ چیز جس میں وہ جھگڑتے تھے۔ اور ہم لاتے ہیں تیرے پاس سچی بات اور ہم سچ کہتے ہیں۔

(۱۸) فَاسْرُبْ بِهَلْكَ بِقَطْعٍ مِنَ اللَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ أَحَدٌ إِلَّا أَمْرًا إِنَّهُ مُصِيبُهَا مَا أَصَابَهُمْ إِنْ مَوْعِدُهُمُ الصُّبْحُ الْيُسُ الصُّبْحُ بِقَرِيبٍ۔ (ہود: ۸۱)

ترجمہ: سولے نکل اپنے لوگوں کو کچھ رات سے اور مڑ کر نہ دیکھے تم میں کوئی۔ مگر عورت تیری کہ اس کو پہنچ کر رہے گا جو ان کو پہنچے گا۔ ان کے وعدہ کا وقت ہے صبح۔ کیا صبح نہیں قریب۔

(۱۹) فَاسْرُبْ بِهَلْكَ بِقَطْعٍ مِنَ اللَّيْلِ وَاتَّبِعْ أَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ أَحَدٌ وَامْضُوا حَيْثُ تُؤْمَرُونَ۔ (الحجر: ۶۵)

ترجمہ: سولے نکل اپنے لوگوں کو کچھ رات رہے سے۔ اور تو چل ان کے پیچھے اور مڑ کر نہ دیکھے تم میں سے کوئی۔ اور چلے جاؤ جہاں تم کو حکم ہے۔

(۲۰) وَقَضَيْنَا إِلَيْهِ ذَلِكَ الْأَمْرَ أَنْ دَاخِرَ هَوْلَاءِ مَقْطُوعٍ مُصْبِحِينَ۔ (الحجر: ۶۶)

ترجمہ: اور مقرر کر دی ہم نے اس کو یہ بات کہ ان کی جڑ کٹے گی صبح ہوتے۔

(۲۱) وَجَاءَ أَهْلَ الْمَدِينَةِ يَسْتَبْشِرُونَ۔ (الحجر: ۶۷)

ترجمہ: اور آئے شہر کے لوگ خوشیاں مناتے۔

(۲۲) قَالَ إِنْ هَؤُلَاءِ ضِيفَى فَلَا تَفْضَحُونَ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَلَا تَخْزَوْنَ۔ (الحجر: ۶۹)

ترجمہ: لو ط نے کہا یہ لوگ میرے مہمان ہیں سو مجھ کو رسوا مت کرو اور ڈرو اللہ سے۔ اور میری آبرو مت کھوؤ۔

(۲۳) قَالُوا أَوَلَمْ نُنْهِكَ عَنْ الْعُلَمِينَ۔ (الحجر: ۷۰)

ترجمہ: بولے کیا ہم نے تم کو منع نہیں کیا جہاں کی حمایت سے۔

(۲۴) قَالَ هَؤُلَاءِ بَنَاتِي إِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِينَ۔ (الحجر: ۷۱)

ترجمہ: بولا کیا میری بیٹیاں نہیں اگر تم کو کرتا ہے۔

(۲۵) لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ۔ (النجر: ۷۲)

ترجمہ: قسم ہے تیری جان کی وہ اپنی مستی میں مدہوش ہیں۔

(۲۶) فَاخْذَتْهُمْ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِينَ فَجَعَلْنَا عَلِيَهَا سَافِلَهَا

وَامْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجْلَةً مِنْ سَجِيلٍ۔ (النجر: ۷۲-۷۳)

ترجمہ: پھر آپڑا ان کو چنگھاڑنے پو پھٹتے وقت پھر کر ڈالی ہم نے وہ بستی اوپر

تلے و بر سائے ان پر پتھر کنکر کے۔

(۲۷) فَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا جَعَلْنَا عَلَىٰهَا سَافِلَهَا وَاْمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجْلَةً

مِنْ سَجِيلٍ مَنضُودٍ مَسْؤَمَةٍ عِنْدَ رَبِّكَ وَمَا هِيَ مِنَ الظَّالِمِينَ بَبْعِيدٍ۔

(ہود: ۸۲-۸۳)

ترجمہ: پھر جب پہنچا حکم ہمارا۔ کر ڈالی ہم نے وہ بستی اوپر نیچے۔ اور بر سائے

ہم نے اس پر پتھر کنکر کے۔ تہہ بہ تہہ نشان کیے ہوئے تیرے رب کے پاس اور نہیں

ہے وہ بستی ان ظالموں سے کچھ دور۔

(۲۸) فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ (الاعراف: ۸۴)

ترجمہ: پس دیکھ لو کیسا ہوا انجام مجرموں کا۔

(۲۹) وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ۔ (الشعراء: ۱۷۴)

ترجمہ: اور ان میں سے اکثر ایمان والے نہ تھے۔

اس پوری تفصیل سے اس تہذیب، اس کے فساد اس کی خباثت، وسعت، ہولناکی اور اس

کے علمبرداروں کے بے قابو ہونے کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ جس کی تلخیص اس طرح کی جاسکتی

ہے:

(۱) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعہ اللہ کے حکم سے حضرت لوط علیہ السلام اس

تہذیب کے مرکز کو بھیجے گئے جو اس وقت کی دنیا میں جنسی انفجار کا امام بنا ہوا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ

سارا معاملہ حضرت ابراہیم علی نبینا الصلوٰۃ والسلام کی بعثت عظیمہ کے وسیع تر لائحہ عمل کا حصہ تھا

(لہذا فی الواقع اس پر بحث حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عنوان کے ذیل میں ہونی چاہئے تھی لیکن

بوجہ اس کا بیان یہاں کیا جا رہا ہے، تاہم اسے اس مقام پر وہاں کے Paradigm میں بھی رکھ کر

دیکھنے کی ان شاء اللہ سعی ہوگی) لیکن چونکہ اس معاملے نے تباہ کن صورت حال اختیار کر لی اور

بالآخر یہ تہذیب تباہ کن انجام (Disastrous Show-down) سے دوچار ہو گئی اس لیے

حضرت ابراہیم کے ذیل میں بیان ہونے کے باوجود اسے الگ مقام دے دیا گیا اور اب اس کا شمار ابلیس کے ان معرکوں میں ہوتا ہے جو تہذیبی معرکے کہلاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن نے ہر جگہ اسی طور اس کا ذکر فرمایا ہے۔ چونکہ یہ ساری بعثت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظیم بعثت کا حصہ تھی اس لیے آخری فیصلہ سے قبل اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس بھیجا اور آپ نے اس پر ملائکہ سے مجادلہ فرمایا:

(۱) وَلَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُنَا إِبْرَاهِيمَ بِالْبَشْرَى قَالُوا سَلِمًا قَالَ سَلَامٌ
فَمَا لَبِثَ أَنْ جَاءَ بِعِجْلٍ حَنِيفٍ. فَلَمَّا رَآهُمُ آيَدِيهِمْ لَا تَصِلُ إِلَيْهِ فَتَنَّهُمْ
وَأَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً قَالُوا لَا تَخَفْ إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَى قَوْمِ لُوطَ
(ہود: ۷۰-۶۹)

ترجمہ: اور بے شک پہنچے ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر بولے۔ سلام۔ وہ بولا سلام ہے۔ پھر دیر نہ کی اور لے آیا ایک نکمڑا تھلا ہوا۔ پھر جب دیکھا کہ ہاتھ نہیں آتے کھانے پر تو کھٹکا اور دل میں ان سے ڈرا۔ وہ بولے مت ڈر ہم بھیجے ہوئے آئے ہیں طرف قوم لوط کی۔

(۲) فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ الرَّوْعُ وَجَاءَتْهُ الْبَشْرَىٰ يُجَادِلُنَا فِي قَوْمِ لُوطٍ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُنِيبٌ. (ہود: ۷۵-۷۴)
ترجمہ: پھر جب جاتا رہا ابراہیم سے ڈر اور آئی اس کو خوش خبری جھڑنے لگا ہم سے قوم لوط کے حق میں۔ البتہ ابراہیم تحمل والا نرم دل ہے رجوع رہنے والا۔
(۳) يَا إِبْرَاهِيمُ أَعْرِضْ عَنْ هَذَا إِنَّهُ قَدْ جَاءَ أَمْرُ رَبِّكَ وَإِنَّهُمْ آتِيهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُودٍ. (ہود: ۷۶)

ترجمہ: اے ابراہیم! چھوڑ یہ خیال وہ تو آپ کا حکم تیرے رب کا اور ان پر آتا ہے عذاب جو لوٹا نہیں جاتا۔

(۲) تمام کوائف پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فساد کی صحیح شکل یہ تھی کہ یہ ایک عالمی جنسی انجبار کا فساد تھا۔ جس کا مرکز وہ علاقہ تھا جو فنیقی (Phoenecia) کہلاتا تھا۔
(۳) اس فساد کی جڑیں حرام طریقے سے کمائی ہوئی دولت اور اس کی بنیاد پر آئی ہوئی مالی خوشحالی تھی۔ اس خوشحالی نے جنسی بے راہروی کے نئے نئے طریقے وضع کرائے۔ اور یہ فنیقی تجارت اور اہل ثروت اس بے راہروی کو ہر چہار طرف پھیلاتے تھے۔

(۳) یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ جنسی بے راہ روی کے چند مخصوص طریقوں سے اس تہذیب کو منسرب کرنا علمی اور عدم واقفیت کی دلیل ہے۔ چونکہ اس بے راہ روی اور آزاد پسندی کا محور جنس تھا اور اس کے جتنے فساد (Perversion) ہو سکتے تھے وہ سب اس کے ذیل میں آتے ہیں اسی لیے وہ سارے طریقے اس تہذیب کا لازمہ تھے۔ چنانچہ عمل قوم لوط سے محض اغلام بازی یا اس سے آگے جا کر بعض لوگوں کی تعبیر کے مطابق مساحت سمجھنا اسے بہت سادہ (Oversimplified) بنانا ہے۔

عمل قوم لوط اس پورے جنسی انفجار (Sexual Perversion) کو کہتے ہیں جو انسانی تصور میں آ سکتا ہے۔ مثلاً اگر صرف امہات انفجار ہی لیے جائیں جن میں فی کس بیس سے زائد قسمیں تاریخ انسانی میں رائج رہی ہیں تو وہ خود بیس سے زائد ہیں جن میں چند درج ذیل ہیں:

(۱) Nudity: یہ فساد اپنے آپ میں ایک کلیات کی حیثیت رکھتا ہے جس کے Pro-active، Active، Passive اور Aggressive قسمیں کل ملا کر 100 سے زائد تاریخ انسانی میں ابلیس نے رائج کی ہیں۔

(۲) Pornoism: یہ فساد بھی اپنے آپ میں ایک کلیات کی حیثیت رکھتا ہے اور صرف یونان قدیم اور بھارت کی قدیم اور وسطی تہذیب نے اس کی بلا مبالغہ سینکڑوں قسمیں رائج کی ہیں۔

(۳) Homosexuality (M): یہ فساد بھی اپنے آپ میں ایک کلیات کی حیثیت رکھتا ہے جس کے Pro-Active، Active، Passive اور Aggressive قسمیں بھی پچاس سے زائد ہیں۔

(۴) Homosexuality (F): یہ فساد بھی اپنے آپ میں ایک کلیات کی حیثیت رکھتا ہے جس کے Pro-Active، Active، Passive اور Aggressive قسمیں پچاس سے زائد ہیں۔ Lesbianism اور Sapphism اسکی صرف دو قسمیں ہیں۔

(۵) Permissiveness: یہ فساد بھی اپنے آپ میں ایک کلیات کی حیثیت رکھتا ہے جس کی بیسیوں قسمیں ہوا کرتی ہیں۔

(۶) Oral Sexuality: یہ فساد بھی ہمہ جہت اور بعض صورتوں میں جارح فساد ہے۔

(۷) Bestiality: یہ فساد بھی ہمہ جہت ہے اور بعض صورتوں میں متعدی اور جارح بھی ہو جاتا ہے۔

(۸) Child-Sexuality: اس فساد سے مراد وہ جنسی فساد ہے جس میں معصوم بچوں اور بچیوں پر ظلم ہوتا ہے۔

(۹) Necro-Sexuality: یہ اپنی نوعیت کی ایک الگ قسم ہے جس کے طرح طرح کے مظاہر ہیں۔

(۱۰) Vision Sexuality: یہ نہایت متعدی قسم کا فساد ہے جس کی ایک جارح موجودہ قسم Peeping ہے۔

(۱۱) Contact Sexuality: یہ قسم نمبر ۱۰ سے زیادہ جارح اور متعدی ہے۔

(۱۲) Fetishism: جنسی فساد کی یہ بھی ایک قسم ہے جو متعدی ہے۔

(۱۳) Opposite Sex-adaptation: جنسی بے راہ روی کی یہ متعدی، جارح

اور ہمہ جہت قسم ہے جس کے چند مظاہر یہ ہیں کہ مرد عورتوں کے اور عورت مردوں کے لباس اور وضع قطع میں رہیں۔ مرد ناخن رنگین اور زیور پہنیں، عورتوں کا خوشبو استعمال کریں اور عورت مردوں کی طرح رہیں۔ عورت اس کی دوڑ میں Amazonian بن جائے اور مرد نازک اندام۔

غرض قرآن نے جب قوم لوط کا تذکرہ کیا ہے تو وہ تذکرہ کسی ایک یا دو عمل کا تذکرہ نہیں بلکہ ایک جنسی انفجار کی مر تکب قوم بلکہ تہذیب اور نظام کا تذکرہ ہے۔ اور جب کسی تہذیب کی تباہی اور اس کے علمبرداروں پر حجت پوری کرنے کا ذکر کیا ہے تو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جنسی طور پر انفجار کی مر تکب قوم کس درجہ مستمر ہو جاتی ہے اور اس کا رویہ کیسا ہوتا ہے۔

(۵) قرآن کے بیان سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ عام طور پر کن حالات میں ابلیس کے لیے کسی قوم کو جنسی انفجار میں مبتلا کرانا نسبتاً زیادہ آسان ہوتا ہے۔ اور جب یہ انفجار ہو جاتا ہے تو کس طرح لوگ پائل ہو جاتے ہیں اور ان لوگوں کے ساتھ کیسی ہی خیر خواہی کیوں نہ کی جائے او ر کتنے ہی بھلے اور عقلی، منطقی، اخلاقی اور مخلصانہ طریقے سے سمجھایا ہی کیوں نہ جائے عام طور پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور تباہی آکر رہتی ہے۔

(۶) وہ قوم قوم لوط اس لیے کہلائی کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عالمی بعثت ہوئی تو جہاں ابلیس نے ان کے خلاف بیسیوں محاذ کھولے ان میں ایک محاذ پورے عالم میں جنسی انجبار کا بھی تھا۔ چونکہ یہ معاملہ بے حد سنگین تھا اس لیے آپ نے بطور خاص اس کی روک تھام کے لیے اور اسکے نتیجے میں آنے والی تباہی سے بچانے کے لیے حضرت لوط علیہ السلام کو اس کے مرکز میں بھیجا۔ ورنہ حضرت لوط علیہ السلام تو سدوم کے رہنے والے نہ تھے۔ حضرت لوط نے وہاں جا کر لوگوں کو سمجھانے اور اس فساد سے باز رکھنے کی پوری کوشش فرمائی۔ اور ایک نبی نذیر ہونے کی پوری ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوئے۔ ہر چند کہ اس قوم کے رویے سے ایسا پورا پورا اندازہ ہوتا تھا کہ اب صورت حال فیصلہ کن بحران کی شکل اختیار کر چکی ہے اور ان پر حجت پوری ہو گئی ہے اور وہ اب حضرت لوط کی جان کے درپے ہو چکے ہیں۔ ٹھیک اسی وقت اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو تباہ کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔

یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ کا تھا۔ صورت واقعہ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہما السلام دونوں ہی اولوالعزم انبیاء ثابت ہوئے اور حتیٰ الوسع اس سے گریز کیا کہ ان کی تباہی کی دعا فرمائیں۔ تاہم سنت الہی میں ان پر حجت پوری ہو چکی تھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کر لیا تھا۔

(۷) یہاں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ قرآن نے انہیں کافر کہا ہے۔ یہ ایک قول فیصل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کے باوجود بھی کسی کا ابلیس کے پیدا کردہ فساد کا علانیہ یا خفیہ علمبردار، شریک یا آلہ کار ہونا خواہ وہ مال کا فساد ہو یا جنس کا یا قوت و اقتدار کا۔ من حیث المجموع اس کو کافر بنادیتا ہے۔ چنانچہ آج جو لوگ مغربی فساد فکر، فساد مال، فساد ثقافت، فساد حکومت و اقتدار، فساد جنس، فساد اکل و شرب یا فساد لباس کے علمبردار، شریک یا آلہ کار ہیں وہ خواہ عالم اسلام کی مدقوق فقہی چوکھٹے میں مومن و مسلم شمار ہوتے ہوں لیکن عند اللہ وہ شاید ہی مومن و مسلم ٹھہریں گے یہی صورت حال اداروں اور حکومتوں کی بھی ہے۔

چوتھا تہذیبی معرکہ : قوم شعیب : 2100 قبل مسیح

حضرت شعیب علیہ السلام

معرکہ خیبر و شر کے مرحلہ ششم کا چوتھا تہذیبی معرکہ اپنے ماقبل دو تہذیبی معرکوں سے قدرے مختلف ہے۔ قرآن نے اس کو قوم شعیب کے نام سے پکارا ہے۔ یہ قوم شعیب کون تھی؟ چونکہ قرآن میں اس کی ترتیب اور ناموں کی یکسانیت اور سب پر مستزاد ہمارے مفسرین کی تفسیری بے اعتدالیوں نے اس قوم کے تعلق سے چند در چند غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں۔ لہذا اب اس حصے کی تفسیر ایسی کی جاتی ہے جن کا سمجھنا اور کم از کم ان لوگوں کے لیے سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے جو دنیاوی تاریخ سے گہری واقفیت بھی رکھتے ہوں۔

اس تہذیب میں معرکہ خیبر و شر کو پیش کرنے کے تعلق سے اس سے بہتر صورت کوئی دوسری نہیں ہو سکتی تھی جسے اللہ رب العزت نے قرآن میں اختیار کیا ہے۔ عاد اور ثمود کی طرح اسے کوئی نام دینے کے بجائے قرآن نے بہتر سمجھا کہ قوم نوح اور قوم ابراہیم کی طرح اس تہذیب کو قوم شعیب کہا جائے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس تہذیب کی چھوٹی سے چھوٹی اور دقیق سے دقیق پہلو پر قرآن کتنی جامعیت اور اٹل طریقے سے گرفت رکھتا ہے۔ کلام اللہ کا یہی تو اعجاز ہے جس کا ہمارے یہاں بارہ سو سالوں سے رائج علوم القرآن اور بطور خاص اصول تفسیر نے جنازہ نکال دیا ہے۔

اس عاجز کی تحقیق کے مطابق قوم شعیب دراصل اس پورے نظام کے حاملین کو کہتے ہیں جسے موجودہ تاریخ ناقص طریقے سے یونان کی تہذیب (Greek Civilization) کے نام سے پکارتی ہے۔ بیسیا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ ان تمام پہلوؤں کی علمی اور تجزیاتی تقریر کی یہاں گنجائش نہیں لہذا یہاں صرف ناگزیر باتیں ہی عرض کی جاسکتی ہیں (اس کی تفصیل عالم اسلام کی منصفی اور مقصدی صورت حال میں ملاحظہ فرمائیں)

اس تہذیب کی خصوصیات میں تین باتیں داخل ہیں۔

(۱) تہذیبی تسلسل کے باوجود مقام کی بار بار تبدیلی

(۲) تہذیبی تسلسل کے باوجود غالب اقوام کی تبدیلی

(۳) تہذیبی تسلسل کے باوجود زبان و ثقافت کی تبدیلی

اس لیے اس تہذیب کو کسی مقام، قوم یا زبان سے موسوم کرنا درست نہ ہوتا۔ چنانچہ اس تہذیب کی یہی ذہن زاکت ہے کہ قرآن نے اس کے نام کو اس نبی نذیر سے منسوب کر دیا جو ان میں بھیجے گئے۔ اس صورت میں اس تہذیب کا زمانہ کافی طویل ہو جاتا ہے۔ لہذا سرنامے پر جو تاریخ درج ہے وہ دراصل اس کی ابتدائی تاریخ ہے۔ اس تہذیب کی توسیع تقریباً 360 قبل مسیح تک ہوتی ہے۔ اور اس میں بیس سے زائد فیصلہ کن موڑ آتے ہیں۔ لہذا قرآن نے پوری تہذیبی صورت حال کو ایک نام دیتے ہوئے اسے ایک نبی کے نام سے موسوم کیا ہے۔ ہر چند کہ اس کو ظاہر کرنے کے لیے کہ تباہی کی جس صورت حال کا جائزہ قرآن لے رہا ہے وہ بعد کے ادوار سے الگ ہے واضح ہو کہ یہ تباہی ابتدائی عہد میں آئی ہے۔ اس کے ذیل میں قرآن دو ذیلی ادوار اور ایک تجزیہ کے مطابق تین ذیلی ادوار کا تذکرہ کرتا ہے۔ یعنی قرآن جس قوم کو قوم شعیب کہتا ہے اس میں دو یا تین مزید ناموں کو شامل کرتا ہے جو درج ذیل ہیں:

(۱) اصحاب لئكة

(۲) قوم تبع

(۳) اصحاب الحجر

جس بات نے ہمارے مفسرین کو پہلے پریشان کیا اور پھر نہ سمجھنے کی صورت میں تفسیری کہانی گڑھنے کی طرف مہمیز کر دیا وہ لفظ مدین ہے۔ یہی غلطی ہمارے مفسرین نے مدائن صالح کے تعلق سے بھی کی تھی۔ مدین سے مراد وہ جگہ نہیں جو جزیرۃ العرب میں مدین کہلاتی ہے۔ بلکہ مدین سے مراد دراصل اس تہذیب کی وہ خصوصیت ہے جسے پولس Polis کہتے ہیں جسے یونانی تاریخ میں عام طور پر City-State کہا جاتا ہے۔ یہ تہذیب دنیا میں اپنے Polis یعنی مدین یا مدینہ کے لیے مشہور تھی۔

(۱) اصحاب لئكة :

قرآن کی تفسیروں اور پھر اس دروازے سے اسلامی علوم میں خرافات کے در آنے کی انتہا

وہ رویہ ہے جو آج اصول تفسیر کی شکل میں ہی نہیں بلکہ پورے علوم القرآن کی شکل میں پایا جاتا ہے۔ قرآن نے اگر اصحاب لکۃ استعمال کیا ہے اور یہ بات مفسرین کی سمجھ میں کسی سبب سے نہیں آئی۔ تو بجائے اس کے کہ اسکی تفسیر کے لیے ان آیات پر جعلی واقعات کا لباس منڈھ دیا جاتا چونک جانے، غور و فکر کرنے اور تحقیق کرنے کی بات یہ تھی کہ یہ اس اللہ رب العزت کا کلام ہے جو کائنات کی ساری حقیقتوں اور تبدیلیوں کا علم رکھتا ہے۔ اس پر واقعات عالم سے جہل کا اطلاق عالم تصور میں بھی نہیں ہو سکتا لہذا قرآن میں مذکور کسی بات کو سمجھنے کا طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ ہم کائنات کے علوم اور چپے چپے کو کھنگال ڈالیں گے اور یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ آخر اللہ رب العزت نے اصحاب لکۃ ہی کیوں کہا۔ واقعات عالم اور معلوم تاریخ عالم سے قرآن سمجھنے کے بجائے طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ قرآن میں آئے ہوئے ایک ایک لفظ کو ستون مان لیا جائے جسے تھام کر ہم واقعات عالم کو سمجھنے اور اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ اس طرح یہ تو ہو سکتا ہے کہ ہم کسی مخصوص زمانے میں واقعات عالم کو نہ کھنگال سکیں یا کھنگال کر حقیقت نہ پاسکیں لیکن اس بات کی اجازت کیسے دی جاسکتی ہے کہ تحقیق کے بجائے ذہن کے اختراع سے ایسے واقعاتی لباس تراش لیے جائیں اور قرآن کے ان تمام مقامات پر اسے منڈھ دیا جائے اور ایسا کرنے کے لیے یہاں تک جسارت کی جائے کہ اسے تفسیر بالماثور قرار دے کر اس کی تحقیق کو حرام قرار دے دیا جائے۔

چنانچہ عام طور پر جو بات اصحاب لکۃ کے تعلق سے کہی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ جھاڑیوں، درختوں یا بن کے رہنے والے تھے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ قوم شعیب کے تحت جن اصلی اور ذیلی قوموں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں ایک لکۃ بھی ہے۔

لکۃ یا لکۃ: دراصل وہ قوم ہے جسے ایونی زبان (Ionic Language) میں اخائیو، اخائیون، اخائیوئے، اور انگریزی میں (Achaeans) کہا جاتا ہے۔ اخائیوں ہر چند کہ یونانی کا مترادف ہے لیکن دراصل اس تہذیب اور قوم کا نام ہے۔ جو سب سے پہلے روس کے راستے سے پولینڈ (Poland)، سائیسلا (Silesia)، بوہیمیا (Bohemia)، بوئریا (Bavaria) ہوتے ہوئے یورپ میں داخل ہونے والی قوموں کے ساتھ دراصل جنوب مشرقی یورپ کے راستے سے شمالی یونان میں داخل ہوئی تھی یہ لوگ تاریخ میں اخائی یا اے خائی Achaean کہلائے۔

واضح ہو کہ میں نے Achaeo کو اخائی یا اے خائی لکھا ہے۔ یہ ایک مجبوری ہے۔ اس لفظ

میں Ch کا درست تلفظ ایک ایسا صوتیہ ہے جو عربی کے ک، ق اور خ کے درمیان ہے نہ یہ عبرانی کی خیت کی طرح ہے نہ جرمن کے Ch کی طرح نہ ویلش Welsh کے Ch کی طرح۔

یہی ائکتہ دراصل یونانی اور یونانی تہذیب کے اولین نمائندہ تھے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد تہذیب میں نام، جگہ، زبان ہر چیز کی تبدیلی ہوئی۔ چنانچہ ائکتہ کے بعد دوریہ (Dorians) ان کے بعد مینویہ (Minoans) ان کے بعد ایولیویہ (Aeolians) اور پھر یونانیوں (Ionians) نے اس تہذیبی کرسی کو سنبھالا۔ ان کے بعد اس تہذیب نے وہ صورت اختیار کر لی جسے خالص مدنی، مدنی، مدنی، مدنی تہذیب کہتے ہیں اور اس میں اسپارٹا (Sparta)، کورنتھ (Corinth)، ایگوس وایگوس (Aegus)، ایتھنز (Athens)، تھیبس (Thebes)، افسس (Ephesus) اور مالکے تس (Miletus) کی تہذیبیں سامنے آئیں۔

چنانچہ اس اعتبار سے قوم شعیب کا اطلاق عمومی اعتبار سے ان تمام تہذیبی سلسلوں پر ہوتا ہے جسے یونانی تہذیب کہتے ہیں۔ اور خصوصی طور پر یا تو صرف اصحاب ائکتہ پر یا پھر اس سے بھی قبل کی صورت حال پر ہوتا ہے۔ اس عاجز کار حجام یہی ہے کہ یوں تو پوری یونانی تہذیب قوم شعیب کہلاتی ہے لیکن وہ قوم جس پر وہ عذاب آیا جس میں حضرت شعیب نبی نذیر کی طرح مبعوث ہوئے تھے اصحاب ائکتہ سے قبل کے لوگ ہی تھے۔ عذابات بعد میں بھی آئے جن کا ذکر اسی ذیل میں آتا ہے۔

(۲) قوم تبع :

یہ دراصل تھیبس (Thebans) قوم ہے۔ جو تھیبائی (ΘηΒαι-ωv-ai) (Thebes) میں رہتی تھی۔

(۳) اصحاب الحجر :

یونانیوں کی تاریخ کے تسلسل کی یہ وہ کڑی ہے جب یونانیوں پر 546 قبل مسیح میں اہل فارس نے حملہ کر دیا اور بڑی تعداد میں یونانی نقل مکانی کر کے جنوبی اٹلی اور سسلی میں آباد ہو گئے۔ اور وہاں ایک عظیم الشان تہذیب کی بنیاد ڈالی جو علوم اور فنی مہارت میں ترقی کے اعتبار سے یگانہ روزگار تہذیب تھی۔

زینوفین (Xenophanes) وہاں 545 ق م میں نقل مکانی کر کے پہنچا۔ یہ وہی زمانہ ہے جب وہاں مابعد الطبیعات اور الہیات پر شہرہ آفاق مباحثے شروع ہوئے۔ زینوفین کے بعد ایلیاتی مکتب فکر (Eleatic School) کے پرمینائڈس (Parmenides) اس کے بعد ہیراکلیٹس (Heraclitus) نے اس علمی فضا کو اور مہمیز کر دیا۔ 530 قبل مسیح میں سامائی (Samian) پاکتھاغورس (Pythagorus) وہاں پہنچا۔ یہاں اسی عہد میں اس عظیم الشان فن تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا۔ جس میں ان معبدوں کی تعمیر ہونا شروع ہوئی جنہیں بطور خاص دورائی (Doric) کہا جاتا ہے۔ اس میں سے ایک جگہ اگراس (Agragas) یا اگری جینٹم (Agrigentum) تھی۔ اس کے علاوہ سائیلنس (Silenus) اور پائسٹم (Paestum) تھی جہاں ایسے ہی شاندار فن تعمیر کے نمونے تھے۔ فن تعمیر کا یہ نمونہ اور اس جگہ قائم شہر دراصل اپنے فن تعمیر کے اعتبار سے اگری جینٹم مشہور ہوئے۔ لاطینی زبان (Latin) میں Ager, Agri کے معنی میدان اور Agger کے معنی قلعہ، اونچی جگہ، بلند ٹیلہ، بڑا بند یا کوئی بھی فلک بوس تعمیر کے ہوتے ہیں۔ اور یہ تہذیب اپنے Agger کے لیے مشہور تھی اور ان تعمیرات کو Agger کہا جاتا تھا۔

چنانچہ قرآن میں جنہیں اصحاب الحجر کہا گیا ہے وہ دراصل یہی مابعد النکہ کے یونانی تھے جن کی تہذیب اگری تہذیب کے نام سے مشہور تھی۔

سب سے زیادہ غور طلب بات یہ ہے کہ کون سی جگہ ہے جہاں قرآن نے ان واقعات کی بڑی عجیب و غریب ترتیب قائم کی ہے جو خود قرآن میں کہیں اور نہیں ملتی۔ یعنی سب سے پہلے (۱) حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر (۲) پھر اسی کے ذیل میں حضرت لوط علیہ السلام کا ذکر (۳) پھر ان کے ذیل میں اصحاب الایکۃ کا ذکر (۴) پھر اس کے ذیل میں اصحاب الحجر کا ذکر اور یہ بات صرف سورۃ الحجر میں پائی جاتی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت تدریج کے تناظر بیان میں کون لوگ ہیں؟ وہ کون لوگ ہو سکتے ہیں جن کے لیے ان واقعات اور اسکے تسلسل میں Relevance ہو؟ بادی النظر میں آیت: ۲ میں 'الذی کفروا' اور آیت: ۶ میں 'قالوا یا ہا الذی نزل علیہ الذکر انک لمجنون' سے ایسا متبادر ہوتا ہے کہ یہ سورۃ قریش مکہ سے براہ راست مخاطب ہے لیکن بہت دقت نظر سے دیکھا جائے تو وہ تناظر بیان جو سورۃ الرمد میں قائم کیا

گیا تھا دراصل بعد کا تناظر ہے اور اس سے ماقبل کے تناظر کا بیان یہاں ہے۔ یعنی الحجر کے تناظر کو نہ سمجھا جائے تو الروم کے تناظر کا سمجھنا مشکل ہو جائے گا۔ قرآن کا یہ اعجاز ہے کہ وہ اپنے مخاطبین کے سامنے پوری دنیا کو ایک ہتھیلی پر رکھ کر دکھادیا کرتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب قرآن کی آیات آنحضرت ﷺ پر اترتی ہوں گی اور جب آپ ﷺ اس سے اصحاب کو باخبر کرتے ہوں گے اور جب نمازوں میں اس کی تلاوت ہوتی ہوگی تو ایسا لگتا ہوگا کہ ساری دنیا ان کی نظروں کے سامنے سمٹ آئی ہے۔

یہ پورا تناظر باز نطینی تناظر ہے باز نطینی سلطنت رومی سلطنت کی عیسائی وارث تھی اور وہ رومی سلطنت، خود یونانی سلطنت کی وارث تھی۔ اس سورۃ میں بتایا گیا ہے کہ وہ عظیم یونانی تہذیب جس کا اب نام و نشان تک باقی نہیں — اور رومی جس کے وارث بنائے گئے اور اب تبدیلی مذہب کے بعد جو عیسائی رومیوں کے ہاتھ میں ہے جنہیں باز نطینی کہا جاتا ہے — کیسے تباہ ہو گئی۔ کس طرح اس عظیم یونانی تہذیب نے اللہ اور اس کے رسولوں کی تکذیب کی اور اپنی طاقت اور اقتدار کا استعمال ابلیس کی خدمت اور زمین پر سپر پاور بننے میں کیا۔ آج وہ تہذیب ختم ہو چکی ہے۔ چونکہ یہ تہذیب منفرد نوعیت کی تھی اور ایک تسلسل کے ساتھ طویل عرصے تک چلی اور اس دوران اس میں خیر و شر کی طویل کشمکش جاری رہی اس لیے قرآن نے اسے مخصوص اعتبار سے پیش کیا ہے۔ قرآن نے اس تہذیب کی جو خصوصیات بتائی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے اور بطور خاص اس تہذیب کے اس دور کی خصوصیات سے جو اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہوئی اور جس میں حضرت شعیب علیہ السلام بطور نبی نذیر آئے کہ وہ کون سا عہد تھا۔ تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ آخری سے پہلے کا دور ہے۔ یعنی وہ تکلیف دہ معرکہ خیر و شر جو سن 2100 قبل مسیح سے جاری چلا آ رہا تھا بالآخر اس وقت ایک بھیانک انجام کو پہنچا۔

قرآن میں حضرت شعیب علیہ السلام کے تذکرے میں بتائی گئی تفصیلات سے اس عاجز نے جو اندازہ لگایا ہے اس کے مطابق 2100 قبل مسیح سے چلنے والا فاسد سلسلہ بالآخر 1500 قبل مسیح سے لے کر 1000 قبل مسیح کے درمیان اپنے منطقی انجام کو پہنچ گیا۔ اغلب ہے کہ یہ واقعہ عذاب دہی ہے جسے کریٹ (Crete) کے مینوآن تہذیب (Minoan Age) کا خاتمہ کہتے ہیں جو 1400 قبل مسیح کے قریب وقوع پذیر ہوا۔ تاریخ آج بھی محو حیرت ہے کہ اتنی عظیم

الشان اور اتنی خوشحال اور مال و دولت سے پر، سونے اور چاندی کے ڈھیر پر بیٹھی ہوئی تہذیب اور اس پر قائم ایسی سلطنت اور حکومت اچانک بلا سبب تاریخ کے نظارہ گاہ سے کیسے غائب ہو گئی۔ ۲

قرآن نے، جو تفصیلات بتائی ہیں انہیں ذیل میں اس طرح ملخص کیا جاسکتا ہے:

(۱) فاوفوا الکیل والمیزان ولا تبخسوا الناس اشیاءہم ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحہا ذلکم خیر لکم ان کنتم مومنین۔ (الاعراف: ۸۵)

ترجمہ: سو پوری کرو ماپ اور تول اور مت گھٹا کر دو لوگوں کو ان کی چیزیں اور مت فساد پیدا کر دو زمین میں اس کی اصلاح کے بعد یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم ایمان والے ہو۔

(۲) ویقوم اوفوا المکیال والمیزان بالقسط ولا تبخسوا الناس اشیاءہم ولا تعثوا فی الارض مفسدین بقیۃ اللہ خیر لکم ان کنتم مومنین وما انا علیکم بحفیظ۔ (ہود: ۸۵-۸۶)

ترجمہ: اور اے قوم! پورا کرو ماپ اور تول کو انصاف سے اور نہ گھٹا دو لوگوں کو ان کی چیزیں اور مت مچاؤ زمین میں فساد جو بچ رہے اللہ کا دیا وہ بہتر ہے تم کو اگر ہو تم ایمان والے۔ اور میں نہیں ہوں تم پر نگہبان۔

(۳) قالوا یشعیب اصلوتک تامرک ان نترک ما یعبد آبلہ نا وان نغفل فی اموالنا ما نشؤا انک لانت الحلیم الرشید۔ (ہود: ۸۷)

ترجمہ: بولے اے شعیب! کیا تیری نماز نے تجھ کو یہ سکھایا کہ ہم چھوڑ دیں جن کو پوجتے رہے ہمارے قائدین چھوڑ دیں کرنا جو کچھ کہہ کرتے ہیں اپنے مالوں میں بڑھانے کے لیے تو ہی باد قار ہے نیک چلن۔

(۴) قال یقوم اے یتیم ان کنت علی بینۃ من ربی ورزقنی منہ رزقاً حسناً وما ارید ان اخالفکم الی ما انهاکم عنہ ان ارید الا اصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب ویقوم لا یجرمنکم شقاقی ان یصیبکم مثل ما اصاب قوم نوح او قوم ہود او قوم صلح وما قوم لوط منکم ببعید واستغفروا ربکم ثم توبوا الیہ ان ربی رحیم ودود۔ (ہود: ۸۸-۹۰)

ترجمہ: بولے قوم! دیکھو تو اگر مجھ کو سمجھ آگئی اپنے رب کی طرف سے اور اس نے روزی دی مجھ کو نیک روزی اور میں یہ نہیں چاہتا کہ بعد کو خود کروں وہ کام جو تم

سے چھڑاؤں۔ میں تو چاہتا ہوں سنوارنا جہاں تک ہو سکے اور بن آتا ہے اللہ کی مدد سے۔
اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے۔ اور اے قوم! نہ کمائیو
میری ضد کر کے یہ کہ پڑے تم پر جیسا کہ پڑ چکا قوم نوح پر یا قوم ہود پر یا قوم صالح پر اور
قوم لوط تو تم سے کچھ دور ہی نہیں۔ اور گناہ بخشو! اپنے رب سے اور رجوع کرو اس کی
طرف البتہ میرا رب ہے مہربان محبت والا۔

(۵) وَلَا تَقْعُدُوا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوعِدُونَ وَتَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ
مَنْ آمَنَ بِهِ وَتَبْغُونَهَا عِوَجًا وَاذْكُرُوا إِذْ كُنْتُمْ قَلِيلًا فَكُثِرَ كَمْ وَانْظُرُوا
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ. (الاعراف: ۸۶)

ترجمہ: اور مت بیٹھو راستوں پر کہ ڈراؤ اور روکو اللہ کے راستہ سے اس کو جو
کہ ایمان لائے اس پر اور ڈھونڈو اس میں عیب اور یاد کرو جبکہ تھے تم بہت تھوڑے پھر تم
کو بڑھا دیا اور دیکھو کیا ہوا انجام فساد کرنے والوں کا۔

(۶) وَإِنْ كَانَ طَائِفَةٌ مِنْكُمْ آمَنُوا بِالَّذِي أُرْسِلَتْ بِهِ وَطَائِفَةٌ لَمْ
يُؤْمِنُوا فَلَصَبِّرُوا حَتَّى يَحْكُمَ اللَّهُ بَيْنَنَا وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ (الاعراف: ۸۷)
ترجمہ: اور اگر تم میں سے ایک طبقہ ایمان لایا اس پر جو میرے ہاتھ میں بھیجا
گیا اور ایک طبقہ ایمان نہیں لایا تو صبر کرو جب تک اللہ فیصلہ کرے درمیان ہمارے
اور سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

(۷) قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لَنُخْرِجَنَّكَ يَشْعِيبَ
وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَا أَوْ لَتَعْدُنَّ فِي مِلَّتِنَا. (الاعراف: ۸۸)
ترجمہ: بولے سردار جو متکبر تھے اس کی قوم میں۔ ہم ضرور نکال باہر کریں
گے۔ اے شعیب تجھ کو اور ان کو جو کہ ایمان لائے تیرے ساتھ اپنے شہر سے یا یہ کہ تم
لوٹ آؤ ہمارے دین میں۔

(۸) قَالَ أُولَٰئِكَ نَكُودُونَ (الاعراف: ۸۸)

ترجمہ: بولا کیا تم بے زار ہوں تب بھی۔

(۹) قَدْ افْتَرَيْنَا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا إِنْ عَدْنَا فِي مُلْتَكُمْ بَعْدَ إِذْ نَجَّيْنَا
اللَّهُ مِنْهَا وَمَا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَعُودَ فِيهَا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّنَا وَسِعَ وَبَنَّا كُلَّ
شَيْءٍ عَامًا عَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْنَا. (الاعراف: ۸۹)

ترجمہ: بے شک ہم نے بہتان باندھا اللہ پر جھوٹا اگر لوٹ آئیں تمہارے
دین میں بعد اس کے کہ نجات دے چکا ہم کو اللہ اس سے اور ہمارا کام نہیں کہ پلٹ

جائیں اس میں مگر یہ کہ چاہے اللہ رب ہمارا گھیرے ہوئے ہے ہمارا پروردگار سب چیزوں کو اپنے علم میں اللہ ہی پر ہم نے بھروسہ کیا۔

(۱۰) ربنا افتح بیننا و بین قومنا بالحق و انت خیر الفتحین۔
(الاعراف: ۸۹)

ترجمہ: اے ہمارے رب! فیصلہ کر ہم میں اور ہماری قوم میں انصاف کے ساتھ اور تو سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

(۱۱) وقال العلأ الذین کفروا من قومہ لئن اتبعتم شعیباً انکم اذا لخصرون (الاعراف: ۹۰)

ترجمہ: اور بولے سردار جنہوں نے کفر کیا تھا اس کی قوم میں اگر پیروی کرو گے تم شعیب کی تو ہم بے شک برباد ہوں گے۔

(۱۲) قالوا ینشعب ما نفقہ کثیراً مما تقول وانا لنرک فینا ضعیفنا ولولا رھطک لرجعنک وما انت علینا بعزیز۔ (ہود: ۹۱)

ترجمہ: بولے اے شعیب ہم نہیں سمجھے۔ بہت باتیں جو تو کہتا ہے اور ہم تو دیکھتے ہیں کہ تو ہم میں کمزور ہے اور اگر نہ ہوتے تیرے بھائی بند تو تجھ کو تو ہم سنگسار کرا ڈالتے۔ اور ہماری نگاہ میں تیری کچھ عزت نہیں۔

(۱۳) قال یقوم ارھطی اعز علیکم من اللہ واتخذتموہ وراکم ظھریا ان ربی بماتعملون محیط۔ (ہود: ۹۲)

ترجمہ: بولا اے قوم! کیا میرے بھائی بندوں کا دباؤ تم پر زیادہ ہے اللہ سے اور اس کو ڈال رکھا تم نے پیٹھ پیچھے بھلا کر تحقیق میرے رب کے تابو میں ہے۔ جو کچھ کرتے ہو۔

(۱۴) ویقوم اعملوا علی مکناتکم انی عامل سوف تعلمون من یاتیدہ عذاب یخزیہ ومن ہو کاذب ارتقبوا انی معکم رقیب۔ (ہود: ۹۳)

ترجمہ: اور اے میری قوم! کام کیے جاؤ اپنی جگہ میں بھی کام کرتا ہوں آگے معلوم کر لو گے کس پر آتا ہے۔ عذاب رسوا کرنے والا اور کون ہے جھوٹا اور تاکتے رہو میں بھی تمہارے ساتھ تاک رہا ہوں۔

قرآن میں مذکور تفصیلات سے درج ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

(۱) کریٹ میں قائم مینوان تہذیب (Minoan Civilizations) اپنے وقت کی

عالمگیر طاقت تھی۔ اس کا اقتدار اس وقت بالعموم پائی جانے والی پوری انسانی دنیا پر تھا اور بالخصوص

پورے مشرق وسطیٰ، وسطی ایشیا، شمال مغربی افریقہ، جنوبی یورپ اور بحیرہ متوسط کے تمام علاقوں پر۔

(۲) مینوان تہذیب ایک معاشی سپر پاور (Economic Superpower) تھی۔

(۳) رفتہ رفتہ اس تہذیب نے معاشی استعماریت (Economic Imperialism)

کی شکل اختیار کر لی تھی۔

(۴) پورا نظام بنیادی طور پر استحصال بن گیا تھا۔ اور استحصال کے دو رخ تھے۔ خارجی اور

داخلی۔ چنانچہ خارجی پہلو میں دیگر قوموں کا استحصال کیا جا رہا تھا اور داخلی پہلو میں پورا نظام خود

اپنے اندر بنیادی طور پر استحصال ہو چکا تھا۔

(۵) اس استحصالی نظام کا انفراسٹرکچر اپنے اندر کلی اور فردی (Macro & Micro)

سطح پر پوری طرح استحصال ہو چکا تھا۔

(۶) معاشی استحصال کے بالواسطہ اور بالواسطہ جتنے شعبے تھے وہ سب نظام کا مستقل حصہ

بن چکے تھے۔

(۷) اس استحصال کے مختلف طریقوں میں نمایاں ترین تین طریقے تھے:

(۱) سود کا نظام کے ہر شعبے میں داخل ہو کر حیات کو جکڑ لینا۔

(۲) معیشت کی آمدنی جہت (Income Side) کا کلی طور پر استحصال ہو جانا۔

(۳) معیشت کی تقسیمی جہت (Distribution Side) کا کلی طور پر استحصال ہو جانا۔

(۸) معیشت میں زہریلا دائرہ (Vicious Circle) کا راسخ ہو جانا اور استحصال کے

خلاف آواز اٹھانے یا اقدامات کرنے والوں کے خلاف طاقت کا استعمال ہونا۔

(۹) یہ استحصالی نظام محض داخلی اور انفرادی سطح پر نہیں بلکہ عالمی نظام کی سطح پر پھیل چکا

تھا اور اس کے فساد کی شکل، رسوخ اور وسعت عالمگیر ہو چکی تھی۔

یہ تلخیص صرف اختصار کو مد نظر رکھ کر کی گئی ہے اور قرآن کی آیات کے تجزیے کا صرف

حاصل پیش کر دیا گیا ہے ورنہ اگر اس کی تفصیل کی جائے تو معلوم ہو گا کہ قرآن نے اس مالی سپر پاور

نظام کے ایک ایک فساد کو کھول کر رکھ دیا ہے۔ اور کسی بھی غور کرنے والے پر پوری بات واضح

ہو جاتی ہے کہ جب روئے ارض پر کوئی معاشی استعماریت (Economic Imperialism)

راسخ ہوتا ہے تو اس کا جبر اور استحصال کتنا ہمہ گیر اور ہولناک ہو جاتا ہے۔ قوم شعیب کی تفصیلات

جو قرآن میں بتائی گئی ہیں اس کا اندازہ کر کے آسانی سے یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ موجودہ Economic Order جو Globalization کے منازل تیزی سے طے کر رہا ہے جب چند سالوں کے بعد اپنی صحیح صورت میں جلوہ گر ہو گا تو اس کی ہیبت ناک کیسی ہوگی۔

معاشی ہیبت ناک سے الگ ہٹ کر اس تہذیب کی چند مخصوص باتیں بھی قرآن نے بتائی ہیں۔ جس کی طرف توجہ کی جانی چاہئے۔

(۱) جب اس سودی استحصالی نظام میں اسلام کی دعوت دی گئی اور اس کی بنیادوں پر معیشت کو استوار کرنے کی کوشش کی گئی تو اس استحصالی نظام سے وابستہ لوگوں نے اس کی آخری حد تک مخالفت کی۔ اور اس کے لیے جبر کا سہارا لیا۔ وہ سارے معاشی اور غیر معاشی طریقے مثلاً انتظامی، عدالتی اور تخریبی طریقے اختیار کیے گئے تاکہ اسلامی خطوط پر فلاحی کوششیں ناکام ہو جائیں۔

(۲) ہولوگ فلاحی طریقوں پر بطیب خاطر چلنا چاہتے تھے انہیں بہ جبر و تنویف مجبور کیا گیا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے۔

(۳) فلاحی طریقوں پر چلنے والوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ پھر سودی استحصالی کاروبار شروع کر دیں اور اس نظام کا حصہ ہو جائیں۔ معاشی اصطلاح میں فلاحی معاشی وسائل کو استحصالی مالی نظام سے الگ رکھنے کے بجائے اس قائم عالمگیر استحصالی معاشی نظام کا حصہ بنا دیئے جائیں جیسا کہ آج Globalization کے نام پر بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر کیا جا رہا ہے۔

قرآن کے مطابق یہ صورت حال اس مقام پر پہنچ گئی تھی کہ استحصالی نظام کے ذمہ داروں نے فلاحی نظام اختیار کرنے والوں کے خلاف موت و حیات کی جنگ چھیڑ دی۔ ایسا لگتا ہے کہ اس استحصالی نظام نے فلاحی نظام کے تمام معاشی اعمال (Economic Activities)، تمام مالی ملکیت (Economic Proprietorship) اور مالی تبادلہ (Financial Exchange) کو جرم قرار دے دیا۔ اور اہل حق کے پاس کوئی صورت نہیں بچی کہ وہ زندہ بھی رہ سکیں۔ قرآن کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک ایسی بحرانی گھڑی آگئی جب اللہ کے رسول اور تمام اہل حق نے پیچھے ہٹنے، باطل سے سمجھوتہ کرنے، مددہنت کی روش اختیار کرنے، تاویل کر کے نظام باطل میں رہنے کا جواز پیدا کرنے۔ اور عرف و عادت کا سہارا لے کر باطلانہ نظام کو چور

دروازے سے اسلامی نظام میں داخل کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اور حق کی راہ پر ڈٹ گئے جس کے بعد نظام میں ایک ایسا بحران (Crisis) پیدا ہو گیا جہاں ایک طرف بظاہر بے بس اہل حق تھے اور دوسری طرف ہر طرح کی قہرمانی کے ساتھ نظام باطل۔ ٹھیک یہی گھڑی تھی کہ اللہ کے رسول نے دعا فرمائی۔

ربنا افتح بیننا وبين قومنا بالحق وانت خير الفاتحين۔ (الاعراف: ۸۹)

ترجمہ: اے ہمارے رب! ہمارے اور ہماری قوم کے مابین حق کے مطابق فیصلہ فرما دے۔ بے شک تو سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا۔
اور اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمادیا: قرآن کا بیان ہے:

فاخذتهم الرجفة فاصبحوا في دارهم جثمين الذين كذبوا شعيباً كان لم يغنوا فيها الذين كذبوا شعيباً كانوا هم الخسرين۔ (الاعراف: ۹۲)

ترجمہ: پھر آپکڑا ان کو زلزلہ نے پس صبح کو رہ گئے اپنے گھروں کے اندر اوندھے پڑے۔ جنہوں نے جھٹلایا شعیب کو گویا کبھی بے ہی نہ تھے وہاں جنہوں نے جھٹلایا شعیب کو وہی ہوئے تباہ۔
ابلیس کے تہذیبی معرکے کا جائزہ :

یہاں دو بنیادی سوال پیدا ہوتے ہیں۔ اس مختصر جائزے میں ہم نے ان چاروں تہذیبوں کا حال ان کے اطوار اور ان کا انجام دیکھا۔ پہلا سوال یہ ہے کہ اس عرصے میں ابلیس کی بنیادی حکمت عملی کیا رہی اور کس طرح اس نے اپنے نصب العین کے تحت طوفان نوح کے بعد اپنے مقاصد کے حصول کی کوششیں کیں۔

بہت دقت نظر سے دیکھا جائے تو ابلیس کی بنیادی حکمت عملی جہاں انسانوں اور جنوں کو الگ الگ منظم کرنے اور ان سے الگ الگ کام لینے کی رہی وہیں انسانوں سے کام لینے کے تعلق سے اس کی بنیادی حکمت عملی انتہا پسندی (Extremism) کی رہی۔

سوال یہ ہے کہ انتہا پسندی (Extremism) کیا ہے؟

ہر چیز کا ایک نام ہوتا ہے۔ عموماً یہ نام علانیہ یا غیر علانیہ طور پر اس شے کے اندر پائی جانے والی بنیادی صفت کا عکس یا مظہر ہوتا ہے۔ مثلاً آدمی، جانور، کپڑا۔ یہی وہ بنیادی صفت ہے جو اسے

تشخص فراہم کرتی ہے۔ یعنی یہ آدمی ہے۔ یہ گھوڑا ہے۔ چنانچہ ایک ہی شخص بیک وقت گھوڑا اور آدمی نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی گھوڑا آدمی اور آدمی گھوڑا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہر شخص کی حقیقت ایک صفاتی دائرے کی ہوتی ہے۔ یہ صفاتی دائرہ وہ حد ہے جس کے اندر کوئی اس شخص کا مانا جاتا ہے مثلاً آدمی یا گھوڑا۔ آدمی کے تشخص کا ایک دائرہ ہے چنانچہ جو کوئی اس تشخص کے دائرے میں ہو خواہ وہ چھوٹا ہو یا لانا، گورا ہو یا کالا، ذہین ہو یا غبی، توانا ہو یا ناتواں، اندھا ہو یا بینا، غرض وہ کچھ بھی اور کیسا بھی ہو اگر وہ اس تشخص کے دائرہ میں ہے تو وہ آدمی کہلائے گا۔ اسی طرح گھوڑا اسی طرح کوئی بھی شے۔

چنانچہ اس تشخص کے دائرے کا دوسرا نام 'حدود' ہے۔ چنانچہ انسان اور انسانیت کے لیے بھی حدود ہیں۔ جب اس تشخص کے دائرے کی باضابطہ شکل ہو جائے تو اسے حدود کہتے ہیں۔ یعنی 'حدود' اپنے اندر بڑی معنویت اور تعین رکھتے ہیں۔ چنانچہ حدود کے اندر کم از کم پانچ امور پائے جاتے ہیں جو درج ذیل ہیں:

(۱) منصب (Goal)

(۲) مقصد (Purpose)

(۳) طریقہ کار (Methodology or Way)

(۴) حد (Limit)

(۵) ضبط (Regulation)

جب کوئی تشخص کا دائرہ باضابطہ یعنی ہمہ گیر ہو جاتا ہے تو اس میں یہ پانچ باتیں لازماً پائی جاتی ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کائنات میں جتنی چیزیں بشمول انسان کے پائی جاتی ہیں ان کے لیے حدود کون بناتا ہے یا بنا سکتا ہے؟

حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اللہ رب العالمین کے سوا دنیا میں کوئی ایسی ذات یا وجود نہیں جو کسی شے بشمول انسان کے حدود بنا سکے اس لیے کہ حدود کا بنانا کم از کم چھ صلاحیتوں کا متقاضی ہے:

(۱) وہ ذات جو چاہے کر سکتی ہے۔

(۲) وہ ذات سب کچھ جانتی ہے۔

(۳) وہ ذات سب کچھ سنتی ہے

(۴) وہ ذات سب کچھ دیکھتی ہے۔

(۵) وہ ذات ہمیشہ سے ہو اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔

(۶) وہ ذات سب پر قدرت رکھتی ہے۔

چونکہ یہ ساری صفتیں اللہ تعالیٰ میں پائی جاتی ہیں۔ اس لیے یہ صرف اور صرف اللہ رب العالمین کا اختیار خاص (Prerogative) ہے کہ وہ کائنات کی ہر شے بشمول انسان کے 'حدود' کی تعیین کرے۔ اور اسی تعیین کا نام 'حدود اللہ' ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ہر شے کے حدود متعین فرمائے ہیں۔ انسان اس کی سب سے ارفع تخلیق ہے اور اس نے اس کے حدود بھی متعین فرمائے ہیں۔ یہی دین اللہ ہے۔

چنانچہ دین اللہ کے اس دائرے کے اندر کہیں بھی رہنا چاہے وہ محور سے کتنا ہی دور کیوں نہ ہو انتہا پسندی (Extremism) نہیں ہے۔ اصل انتہا پسندی یہ ہے کہ انسان "حدود اللہ" کو پھلانگ دے یا اس سے باہر چلا جائے۔

چنانچہ ابلیس کی بنیادی حکمت عملی اور حربہ اس حدود اللہ کو توڑنا ہے۔ بہت دقت نظر سے اگر غور کیا جائے تو اس حقیقت کو پایا جاسکتا ہے کہ اصلی انتہا پسندی تو ایک ابلیسی عمل ہے۔ اس کے برخلاف اللہ کے مومن بندوں کا 'حدود اللہ' کا پورا پورا لحاظ رکھنا اور اس کی جان کی قیمت پر بھی پابندی کرنا اور اسے کبھی نہ توڑنا انتہا پسندی نہیں بلکہ عین یہی وہ اعتدال پسندی ہے جو ایک مسلم کا شیوہ ہوتا ہے۔ مومن کبھی بھی 'حدود اللہ' کو جان بوجھ کر نہیں پھلانگتا اور اگر کبھی سہوا ہو جائے تو فوراً جو رخ کرتا ہے۔ اور اس پر توبہ کرتا ہے۔ دوسری طرف شیطان کا بنیادی کام انسان کے تعلق سے اسی مقام سے شروع ہوتا ہے۔ ایسا انسان ابلیس کے لیے بے کار ہے جو ہمیشہ حدود اللہ کی پاسداری کرے۔ چنانچہ ابلیس کی بنیادی ترغیب 'حدود اللہ' کو پھلانگ جانے کی ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت نوح کے بعد ابلیس نے انسانوں پر اسی بنیادی حربے کا استعمال کیا۔ اور اس نے چار ایسے نظاموں کے استوار کرنے کی ترغیب دلائی جو الگ الگ بنیادوں پر چار قسم کی انتہا پسندی (Extremism) کے حامل تھے۔

(۱) عاد : حکمرانی (سیاسی و عسکری) کی انتہا پسندی

[Administrative (Political & Martial) Extremism]

(۲) شمار : سائنسی و تکنیکی انتہاپسندی

[Scientific & Technological Extremism]

(۳) قوم شعیب : معاشی و مالی انتہاپسندی

[Economic & Financial Extremism]

(۴) قوم لوط : جنسی و اخلاقی انتہاپسندی [Sexual & Ethical Extremism]

ابلیس کی ترکیب اس انتہاپسندی کو انسانی معاشرے میں قائم کرنے کی عموماً یہ رہی ہے کہ وہ سب سے پہلے فکری انتہاپسندی (Ideological Extremism) پیدا کراتا ہے۔ اور یہ فکری انتہاپسندی حکمرانی، سائنس اور تکنالوجی، معاشیات و مالیات یا جنس اور اخلاقیات کے شعبے میں کسی شخص یا اشخاص کے ذریعہ پیدا کروائی جاتی ہے۔ وہ شخص یا اشخاص سب سے پہلے 'حدود اللہ' کے جواز کو فکری طور پر چیلنج کرتے ہیں۔ یہ چیلنج دراصل 'اللہ' کے اختیار خاص (Prerogative) کو ہوتا ہے۔ اور دراصل وہ یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ 'حدود' کی تعین کا اختیار اللہ کو نہیں بلکہ مجھے، ہمیں یا میرے جیسے لوگوں کو ہے۔ تاہم ابلیس انہیں اس سوال کی طرف دیکھنے یا اس کا جواب دینے سے دور ہی رکھتا ہے کہ اس 'حدود' کے متعین کرنے والے کی صلاحیت کیا ہونی چاہئے اور حدود کو متعین کرنے والے مدعی کے پاس کم از کم چھ صلاحیتیں کیا ہونی چاہئیں اور کیا اس مدعی کے پاس وہ صلاحیتیں موجود ہیں جن کے فقدان میں کوئی نہ تو یہ حق رکھتا ہے کہ کسی شے کے 'حدود' متعین کرے نہ ایسا کرنا عقلی طور پر درست ہو گا۔

چنانچہ ابلیس یہ جانتا ہے کہ اگر ایک انسان حقیقت پسند ہو کر اور کھلی آنکھ سے حقیقت کو دیکھے گا تو وہ اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ اسے اپنی صلاحیتوں کو آخری حد تک ابھارنے اور اس کا استعمال کرنے اور اس سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر کائنات کی تمام چیزوں سے استفادہ کرنے کی گنجائش موجود ہے۔ لیکن ابلیس اس حقیقت تک اسے پہنچنے نہیں دیتا۔ وہ جانتا ہے کہ اگر ایسا ہوا تو انسان انفاقی علم کی طرف بڑھے گا۔ جو انبیاء کا علم ہے۔ لہذا ابلیس انسان کو ہٹا کر اکتشافی علوم کی طرف لے جاتا ہے اور اسے باور کراتا ہے کہ اس کا سب سے اچھا استعمال اکتشافی علوم کو آگے بڑھانے میں ہے۔ چنانچہ ابلیس انفاقی حکمرانی کے علوم کے بجائے اکتشافی حکمرانی کے علوم کو پروان چڑھانے کی طرف مہمیز کرتا ہے۔ انفاقی سائنس اور تکنالوجی کے

بجائے اکتشافی سائنس اور ٹکنالوجی کی طرف مہمیز کرتا ہے۔ انفاقی معیشت و مالیات کے علوم کے بجائے اکتشافی معیشت اور مالیات کے علوم کو مہمیز کرتا ہے۔ انفاقی اخلاقیات کے علوم کے بجائے اکتشافی اخلاقیات کے علوم کو مہمیز کرتا ہے۔ لہذا جیسے ہی ان علوم میں انسانی صلاحیت لگنی شروع ہوتی ہے فساد پیدا ہونا شروع ہوتا ہے۔ اور جس تہذیب میں جو شعبہ زیادہ آگے بڑھ جاتا ہے اس کا فساد دیگر فسادات پر غالب آ جاتا ہے۔ چنانچہ عاد میں حکمرانی کا فساد، ثمود میں سائنس اور ٹکنالوجی کا فساد قوم شعیب میں معیشت و مالیات کا فساد اور قوم لوط میں جنس اور اخلاقیات کا فساد غالب تھا۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اللہ تعالیٰ نے ان تہذیبوں کو غارت کر کے ابلیس کو کیوں ناکام کیا؟ کیا یہ عمل ایک طرفہ (Arbitrary) نہ تھا؟ اس سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ اللہ کا یہ عمل قطعاً ایک طرفہ نہ تھا۔ دراصل اللہ تعالیٰ نے ابلیس کی راہ نہیں روکی۔ نہ ایک طرفہ طور پر ابلیس کے خلاف آدم کی مدد کی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ابلیس کے بجائے اس نے ان انسانوں کو غارت کر دیا جنہوں نے 'حدود اللہ' کو نہ صرف پامال کیا تھا بلکہ اس انتہا کی انتہا کو پہنچ گئے تھے۔ 'حدود اللہ' صرف اور صرف اللہ کا اختیار کلی ہے۔ اور یوں بھی دیکھا جائے تو دنیا کا کوئی بھی قانون اپنے زیر اختیار علاقے میں اس سے کمتر درجے پر حدود کو پھلانگ جانے والوں کو نہیں بخشا بلکہ اس کا خاتمہ کر دینا ضروری سمجھتا ہے اللہ تعالیٰ نے تو حدود اللہ کو پھلانگ جانے والوں پر آخری حجت پوری کر کے ہی یہ کارروائی کی۔

فرض کیا جائے کہ کوئی انسان دماغی طور پر پاگل ہو جائے اور لوگوں کو قتل کرنے لگے اور کسی طرح قابو میں نہ آئے تو دنیا کا قانون اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ اس پاگل کی مضرت سے معصوم انسانوں کو بچانا کیا ایک طرفہ کارروائی ہے۔ ٹھیک اسی طرح اللہ تعالیٰ نے دراصل ان تہذیبوں کو ختم اس لیے نہیں کیا کہ وہ کوئی ایک طرفہ کارروائی کر کے ابلیس کو شکست دے بلکہ یہ تہذیبیں اس لیے تباہ کر دی گئیں کہ انہوں نے ابلیسی انتہا پسندی کی راہ پر چل کر ان حدود کو پامال کر دیا تھا جن کے بعد ان کا بحیثیت انسان تشخص ہی ختم ہو جاتا ہے اور تشخص پر اعتبار کا نہیں حقیقت کا اطلاق ہوتا ہے۔



حواشی

Notes and References

باب اول

ضرورت عجلۃ

دوسرا سبب

(۱) مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں:

- (1) Maurice Fleugel : The Humanity, Benevolence and Charity Legislation of the Pentateuch and Talmud, Baltimore, 1908
(2) Ephraim Frisch : An Historical Survey of Jewish Philanthropy. New York 1924.

(۲) چونکہ اس عجلے میں اس کی تفصیلات میں جانے اور کسی تقابلی مطالعہ کی قطعاً گنجائش نہیں اس لیے تحقیق سے تعلق رکھنے والے قارئین کے لیے درج ذیل مصادر و منابع پیش کیے جاتے ہیں جن کے مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجے تک بخوبی پہنچ سکتے ہیں کہ اقوام متحدہ کے قیام کے لیے صدیوں سے چلی آرہی کوشش اور اب اس کی توسیع و استحکام کے پیچھے اصلی حقیقت کیا ہے:

- (A) Old Testament - (1) Is 2², 4⁵, 33²⁰, 40, 65¹⁸, (2) Mic 4, (3) Jer 30¹⁸ (4) Zec 2 (5) Ezk 40 (6) Am 9¹³ (7) Is 30²³, 35^{1 2 7}, 65¹⁷, 66²², (8) Hos 1¹⁰, 2¹⁸, (9) Zec 8¹² (10) Ezk 34^{14 27}, 36^{9 30 35} (11) Ezk 47¹ (12) Hos 2¹⁸ (13) Is 11⁶, 35⁹, 65²⁵ (14) Ezk 34²⁵ (15) Is 30¹⁹, 35³, (16) Ezk 34¹⁶ (17) Is 35¹⁰, (18) Ezk 36²⁶ (19) Zeph 3¹³ (20) Jer 31³¹

- (B) (1) Gunkel : Schopfung Und Chaos, Gottingen * 895
(2) Oesterley : Evolution of Messianic Ideas, London 1908

- (3) Volz : Judaic Eschatology, Töbingen, 1903
 (4) Hommel : Die Insel der Seligen im Mythos U. Sage der Vorzeit, Munich 1901
 (5) Bousset : Anti-Christ, Berlin 1896

(۳) ملاحظہ فرمائیں:

- (1) Basic Facts about the United Nations: DPI. 1995
 (2) Charter of the United Nations and Statute of the International Court of Justice: DPI. 511.

(۴) حوالہ مذکور

- (۵) ملاحظہ فرمائیں : Cecil Roth: The Jewish Contributions to the Civilization: Macmillan and Co. Ltd. London 1938

(۶) ملاحظہ فرمائیں : حوالہ مذکور صفحہ: 321

- (۷) ملاحظہ فرمائیں: Our Global Neighbourhood :

The Report of the Commission on Global governance; Oxford University Press, 1995 P- 333-334

(۸) تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں حوالہ مذکور صفحات 335-348

- (۹) ملاحظہ فرمائیں: Arnold Toynbee: A Study of History

- (۱۰) ملاحظہ فرمائیں: Timothy Garton Ash: Europe's

Endangered Liberal Order; Foreign Affairs, Vol.77, No.2, March/April 1998.

(۱۱) ملاحظہ فرمائیں :

- (1) Jaswant Singh : The Lost Years

- (2) K. Subrahmanyam :Back to Bhishma: Commonality into Indo-US Interests, The Times of India, April 3, 2000

(۱۲) ملاحظہ فرمائیں: حوالہ مذکور "Back to Bhishma" TOI, April 3, 2000

(۱۳) ملاحظہ فرمائیں: سنن نسائی اور مسند احمد اور طبرانی

دوسرا سبب

(۱) ملاحظہ فرمائیں: اسرار عالم:

(۱) بین الاقوامی ایجنسیوں کا تعارف اور ان کا طریقہ کار

(۲) عالم اسلام کی اقتصادی صورت حال

(۳) عالم اسلام کی اخلاقی صورت حال

دارالعلم، نئی دہلی، ۲۰۰۰ء

(۲) ملاحظہ فرمائیں: Max.I. Dimont: Jews, God and History,

Chapter Seven - "United States: The New Babylon - Mentor Books 1994

(۳) ملاحظہ فرمائیں: Bernard E. Jones: Freemasons Guide

and Compendium, George G. Harrap & Company Ltd. London. 1950 - P - 112 - 113

(۴) ملاحظہ فرمائیں: حوالہ مذکور صفحہ 517-521

(۵) ملاحظہ فرمائیں: حوالہ مذکور صفحہ 516

(۶) ملاحظہ فرمائیں: حوالہ مذکور صفحہ 526

(۷) ملاحظہ فرمائیں: Edward A. Tiryakian: American Religious

Exceptionalism: A Reconsideration; Annals, AAPSS, 527, Sage Publications, Beverly Hills, London May 1993 P- 48 - 49

(۸) ملاحظہ فرمائیں: حوالہ مذکور صفحہ 52

(۹) ملاحظہ فرمائیں: حوالہ مذکور صفحہ 52-53

(۱۰) ملاحظہ فرمائیں: Dorothy Anne Lipson: Freemasonry in

Federalist Connecticut, Princeton, NJ; PUP 1977-P-183

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: Lynn Dumenil : Freemasonry

and American Culture 1880-1930 (Princeton, NJ, PUP 1984

(۱۱) ملاحظہ فرمائیں: Bruce M. Metzger & Michael D. Coogan:

The Oxford Companion to the Bible; Oxford University Press,

NY. 1993

- (۱۲) ملاحظہ فرمائیں : Gilles Kepel: The Revenge of God;
"Saving America"; Polity Press 1991
- (۱۳) ملاحظہ فرمائیں : Hal Lindsey: The Late Great Planet
Earth; Grand Rapids, MI: Zondervan 1970
- (۱۴) ملاحظہ فرمائیں : Thomas Mc Call & Zola Levitt:
Satan in the Sanctuary: Chicago, Moody, 1973
- (۱۵) ملاحظہ فرمائیں : T. McCall & Z. Levitt : The Coming
Russian Invasion of Israel. Moody, Chicago. 1987
- (۱۶) ملاحظہ فرمائیں : Grace Halsell: Forcing God's Hand:
Why Millions Pray for a Quick Rapture - and Destruction of
Planet Earth; Crossroads International Publishing, Washington,
1999-131 PP.

- (۱۷) ملاحظہ فرمائیں : (۱) غزوہ روم: مسلم، ابن ماجہ
(۲) المملحمة : ابوداؤد، ابن ماجہ
(۳) غدر روم: ابن ماجہ

تیسرا سبب

- (۱) ملاحظہ فرمائیں : (1) Al- Aqsa: Vol-2 No-2, April.2000
Leicester, "Seige on Al-Masjidul Aqsa-Haram Sharif.
- (2) Haggai Segal: Dear Brothers : The West Bank Jewish
Underground (Jerusalem): Beit Shamai, 1988
- (۲) ملاحظہ فرمائیں : Gideon Aran: Jewish Zionist fundamentalism:
the bloc of the faithful in Israel
(Gush Emunim); unpublished Communications folio 5 as quoted by
La Revanche de Dieu by Gelles Kepel, Editions de Deiu Sevil
1991.

- (۳) ملاحظہ فرمائیں : المملحمة الکبریٰ یا العظمیٰ، ابوداؤد، ابن ماجہ، ترمذی

چوتھا سبب

(۱) ملاحظہ فرمائیں : روزنامہ راشٹریہ سہارا، نئی دہلی: ۲۷ جون ۲۰۰۰ء

(۲) ملاحظہ فرمائیں : روزنامہ راشٹریہ سہارا، نئی دہلی، ۳ جولائی ۲۰۰۰ء

پانچواں سبب

(۱) ملاحظہ فرمائیں :

(1) Rushbrook Williams: The East Pakistan Tragedy

(2) D.N. Palit: Pakistan Cut to Size,

(3) Qutbuddin Aziz : Blood & Tears, Karachi : 1974

(4) بریگیڈ بر صدیق سالک: میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا۔

(۲) ملاحظہ فرمائیں: روداد جماعت اسلامی: حصہ سوم: ۳۵-۱۹۴۴ء، صفحات: ۱۰-۱۲

(۳) ملاحظہ فرمائیں :

Basic Facts about the United Nations: NY 1995 P-3

(۴) ملاحظہ فرمائیں:

(1) Nuclear Weapons Data book: U.S. Nuclear Warhead Production; Vol II, Ballinger Publishing Company, Cambridge, Massachusetts, 1984 - P-151.

(2) R.J. Lifton : Death in Life: Survivors of Hiroshima, Pelican, Harmondsworth, 1971,

(۵) ملاحظہ فرمائیں: روداد جماعت اسلامی: روداد اجتماع دارالاسلام حصہ دوم،

صفحات: ۱۷-۲۰

(۶) ملاحظہ فرمائیں :

(۱) مولانا جعفر تھانیسری : تواریخ عجیبہ

(۲) مولانا عبد الرحیم صادق پوری: تذکرہ صادق

(۳) مولانا محمد علی قصوری صاحب: مشاہدات کابل و پاکستان

(۴) مولانا عبد اللہ لغاری ر غلام مصطفیٰ خاں: مولانا عبید اللہ سندھی کی

سرگزشت کابل۔

(۵) مولانا غلام رسول مہر: — سید احمد شہید

— سرگزشت مجاہدین

(۶) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی: سیرت سید احمد شہید

(۷) ملاحظہ فرمائیں: مسند احمد: روایت ابو ذر الغفاری، جلد ۵، صفحہ: ۱۴۴

مطبوعہ آستانہ استانبول، ترکی

باب دوم

(۱) ملاحظہ فرمائیں: بابلی — (تلمود بابلی) باب۔ حجیجہ ۴۱۳

(۲) ملاحظہ فرمائیں: Abraham Isaac Kook, "Orot" in Arthur

Hertzberg's The Zionist Idea, Garden City) N.Y. Double day, 1959.

(۳) ملاحظہ فرمائیں: تنک (عبرانی): خوزأت قورن اروشلائم ۱۹۹۷

(۴) ملاحظہ فرمائیں:

Our Global Neighbourhood: Oxford University Press, 1995

(۵) ملاحظہ فرمائیں:

K. Rahner: Lexikon für Theologie und kirche (LTK) 1957-67,

(۶) ملاحظہ فرمائیں:

K. FrÖr: Biblische Hermeneutik 2nd ed. 1964

(۷) ملاحظہ فرمائیں: Joseph A. Komonchak, Marry Collins &

Dermot A. Lane; The New Dictionary of Theology; Publisher-Michael Glazier, Gill & Mac Millan Ltd. Dublin. 1987

(۸) ملاحظہ فرمائیں: Norman Perrin: Jesus and the Language

of the Kingdom: Symbol and Metaphor in New Testament Interpretation, Philadelphia, Fortress, 1976

(۹) تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں:

(1) Johannes Weiss: Jesus Proclamation of the Kingdom of God, Philadelphia. 1971

(2) A. Schweitzer: The Myster of the Kingdom of God,

The name of the Original German title: Das Messianitäts und Leidensgeheimnis 1914

(۱۰) تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں : C.H. Dodd: The Parables : of the Kingdom. 1935

(۱۱) ملاحظہ فرمائیں : H.B. Swete: The Apocalypse of St. John, Grand Rapids, Eerdmans 1951 P-275

(۱۲) ملاحظہ فرمائیں : Amos Elon: Jerusalem: City of Mirrors: Boston, 1989

(۱۳) ملاحظہ فرمائیں : John F. Walvoord: The Revelation of Jesus Christ, Chicago, Moody, 1966P-313

(۱۴) ملاحظہ فرمائیں : George E. Ladd: A Commentary on the Revelation of John, Grand Rapids, Eerdmans, 1972 P-276

(۱۵) ملاحظہ فرمائیں : Hanns Lilje: The Last Book of the Bible translated by Olive Wyon. Philadelphia; Muhlumberg, 1957 P-259

(۱۶) ملاحظہ فرمائیں : Martin Kiddle: The Revelation of St. John; (The Moffatt New Testament Commentary) London, Hodder & Stoughton, 1940. P-415-16

(۱۷) ملاحظہ فرمائیں : A.M. Hunter: Probing the New Testament; Richmond, WV: John Knox, 1971, P-156

(۱۸) ملاحظہ فرمائیں: احمد بن فارس (چوتھی صدی ہجری) نے لکھا ہے

تقول "سرکاتم" ای مکتوم وفی کتاب اللہ جل ثناؤہ "لا عاصم
الیوم فی امراللہ ای لا معصوم ومن "ماء دافق وعیشة راضیة" ای
مرضی بہا و "جعلنا حرماً آمناً ای ما مونا فیہ"

ملاحظہ فرمائیں: الصاحبی فی فقہ اللغة و سنن العرب فی کلامہا

لاحد بن فارس المکتبة السلفية، القاہرہ ۱۹۱۰ء

(۱۹) ملاحظہ فرمائیں : William A. Jurgens: The Faith of the

Early Fathers: Back Title: Pope Paul VI Commends Patristic Studies, The Liturgical Press, Saint John's Abbey, College ville,

Minnesota 56321

(۲۰) ملاحظہ فرمائیں : Schism کی تعریف:

(1) Joseph A. Komonchak, Marry Collins & Dermot A. Lane: The New Dictionary of Theology, Dublin. 1987.

(2) Sacramentum Mundi. N.Y.

(۲۱) ملاحظہ فرمائیں: اسرار عالم: عالم اسلام کی اخلاقی صورت حال، دارالعلم،

نئی دہلی۔ 2000

صفحات: ۲۷-۸۰

Vatican Council: The Consiliar and

(۲۲) ملاحظہ فرمائیں:

Post - Conciliar Documents: Gen Ed. A. Flannery, 1975, Dublin
Vol.I-P.320-85

(۲۲) ملاحظہ فرمائیں: حوالہ سابق صفحہ: 408-431

باب سوم

- (۱) ملاحظہ فرمائیں: اسرار عالم: عالم اسلام کی منصبی و مقصدی صورت حال: محور اول: کتاب اول: ماکان و مایکون: باب۔ ادراک کائنات، دارالعلم، نئی دہلی، طبع ثانی فروری ۲۰۰۰ صفحہ ۱۹-۲۰
- (۲) ملاحظہ فرمائیں: محمد بن جریر طبری: جامع البیان فی تفسیر القرآن، جلد اول: صفحہ ۳۶۰، دارالمعرفۃ، بیروت ۱۳۹۸ھ
- (۳) ملاحظہ فرمائیں: مسند احمد اور الدر المنثور روایت حضرت سفینہ
- (۴) ملاحظہ فرمائیں: محمد بن جریر طبری: جامع البیان فی تفسیر القرآن جلد اول: صفحہ
- (۵) ملاحظہ فرمائیں: حوالہ سابق صفحہ (۱۵۹)
- (۶) ملاحظہ فرمائیں: محمد الحاکم نیشاپوری، المستدرک علی الصحیحین: کتاب الفتن والملاحم حدیث۔ ۱/۸۲۹۳
- (۷) ملاحظہ فرمائیں: حافظ نور الدین علی بن ابی بکر الہیثمی: بغیۃ الرائد فی تحقیق مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: کتاب الفتن: باب ماجاء فی المسخ والقذف وارسال الشیاطین والعواقب حدیث: ۱۲۵۸۵
- (۸) ملاحظہ فرمائیں: اسرار عالم: عالم اسلام کی منصبی و مقصدی صورت حال: محور اول: کتاب اول: ماکان و مایکون: باب۔ کائنات خلق، دارالعلم، نئی دہلی۔ ۲۰۰۰ء
- (۱۰) ملاحظہ فرمائیں: اسرار عالم: عالم اسلام کی منصبی و مقصدی صورت حال: محور اول: کتاب اول: ماکان و مایکون: ابواب۔ اسلام کا نظریہ کائنات اور کائنات کا ربانی منصوبہ، دارالعلم، نئی دہلی۔ ۲۰۰۰ء

باب چہارم

- (۱) ملاحظہ فرمائیں: حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ: کلیات اقبال: بال جبریل: ذوق و شوق: بند ۵
- (۲) ملاحظہ فرمائیں: اسرار عالم: عالم اسلام کی منصبی و مقصدی صورت حال: محور اول: کتاب اول: ماکان و مایکون: باب کائنات کاربانی منصوبہ: مرحلہ الجنتہ: صفحہ ۱۰۸
- (۳) ملاحظہ فرمائیں: (1) J.D. Prince: Materials for a Sumerian Lexicon, Leipzig 1908
- (2) L.A. Waddell: The Makers of Civilization in Race & History, Luzac & Co. London
- (۴) ملاحظہ فرمائیں: (1) N. Platon: Crete
- (2) Woolley, L : A Forgotten Kingdom
- (3) John. A. Garratey & Peter Gay: The Columbia History of the World, Harper & Row, NY. 1972
- (3) J. Baikie; The Sea Kings of Crete, Mac Millan 1926.
- (4) A. J. Evans: The Palace of Minos, Mac Millan 1921-1935 6 Vols.
- (5) C.H. Hawes & H.B. Hawes: Crete: The Forerunners of Greece 1922.
- (۵) ملاحظہ فرمائیں: اسرار عالم: عالم اسلام کی منصبی و مقصدی صورت حال: محور اول: کتاب اول: ماکان و مایکون: باب۔ ادراک کائنات۔ دارالعلم، نئی دہلی۔ ۲۰۰۰ء



